

ہر گھر کا ایسٹ

ماہنامہ
کراچی

دوسرہ

انشاعت کے 48 سال

NOVEMBER

2020

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM



اداریہ... منزہ سہام 06

محفل مدیرہ اعلیٰ 08

زادِ راہ غزالہ عزیز (اُم ایمان) 14

انٹرویو

ڈاکٹر رخسانہ صبا صائمہ نفیس 54

سلسلے وار ناول

پچھڑنا بھی ضروری... تحسین انجم انصاری 18

بادِ سموم ڈاکٹر نسیم رخ 102

موٹی ثمنیہ مشتاق 136

مکمل ناول

جنت منزہ سہام 34



غلط فہمی ربوبی مریم حمید 70

رمز ہجر و وصل زرارہ رضوان 158

پہلی پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے یہ چوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ کا کوئی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

افسانے

- 50 پسند عالیہ شمیم
60 سو جا میری راج دلاری حنا بشری
114 تجدد محبت فرح ناز فرح
118 لوٹ آ جانے والے محمد سفیان بٹ
130 الاپچی والی چائے زرقا بھٹی
180 دختر طالب شیخ
188 رجم حتی الموت سدرہ سہیل

خاصے کی چیز

- 198 کڑوا سچ اقبال بانو

دو شیزہ میگزین

- 47 ایک سہانی شام شاہین رضوی
212 دو شیزہ بک صومعہ شریف
215 سخن زار قارئین
218 دو شیزہ گلستان ارم حمید
224 شوبز خبر نامہ شمینہ روزی



افسانے

- 38 بہارا فرح انیس



زیر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)..... 1500 روپے
ایشیا افریقہ یورپ..... 8.000 روپے
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا..... 10.000 روپے

ایڈیٹر چائرس: منورہ سہام نے جمیل حسن مطبوعہ انجمن برہنہ بکس ہاکی اسٹیڈیم کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

Phone : 021-35893122 - 35893123

Email : pearlpublications@hotmail.com



قومی زبان

ٹی وی دیکھنا بلکہ سہنا ایک مسلسل عذاب محسوس ہونے لگا ہے ہم نئی نسل کو کیا سکھا رہے ہیں۔ کیا لباس صرف ریشم، اٹلس اور کخواب کے تاروں سے ہی بنتا ہے؟ کیا زبان صرف وہی ہوتی ہے جو ہمارے اباؤ اجداد بولتے چلے آئے تھے یا زبان وہ ہوتی ہے جو ہم غیروں سے سیکھ لیتے ہیں۔

ابھی تو صرف یہ دکھ تھا کہ غلط تلفظ مارے دے رہا ہے مگر آج کل جس قسم کی لغو گوئی کو فصاحت اور بلاغت کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے اس نے تو ٹی وی دیکھنے کی رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔

شاید ہم بھول گئے کہ زبان تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے۔ خاندان اور پرکھوں کا پتہ دیتی ہے، لباس پیوند زدہ بھی ہو مگر اپنا ہو اور مکمل ڈھانپنے کا کام کرتا ہو تو ہی مقصد پورا کرتا ہے۔

بد زبان قوم سے بے زبان جانور بہتر ہے۔

برہنہ لباس سے بہتر برہنہ پاسفر کرنے والے ہیں کیونکہ ان کے پیروں کے چھالے منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

قومی لباس اور قومی زبان کو مادر پدر آزادی سے بچانا ہوگا۔ برہنگی لباس میں ہو یا خیالات میں نقصان دہ ہوتی ہے اور صرف تباہی لاتی ہے۔ ذہن نشین کر لیجیے۔

”سونے کے نوالے بھی ایک بد زبان اور بے
منزہ سہام مرزا
لباس قوم کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔“



ADV. DANIYAL SHAMSI

**CIVIL LAW
GUARDIANSHIP**

GIFTS

DEEDS

FAMILY LAW

CONTRACTS

CRIMINAL LAW

FREE CONSULTATION

CALL NOW

0340-4895247

OFFICE: 88-C/II, JAMI COMMERCIAL, PHASE 7, D.H.A



دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت
رابطوں کی دلغریب محفل

عزیز بہنو! اس دعا کے ساتھ محفل کی ابتدا کرتی ہوں کہ اللہ ہم سب سے راضی رہے عجیب و غریب دور ہے عجیب و غریب رویے ہیں بے شک نفسا نفسی کا دور ہے ایسے میں جو چند اچھے دوست ہوں انہیں کھونا بے وقوفی ہے بس فی الحال انتہائی چلیں اب بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب.....

✉ حافظہ مون بخاری، سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ پیاری آبی منزہ سہام السلام علیکم! بچی جاندار ادارہ سے زائرہ کے ایمان افروز مضامین قابل تعریف ہیں۔ ظہور الاسلام صاحب کی گفتگو دلچسپ تھی مگر سوالات میں مزید بہتری کی گنجائش محسوس ہوئی۔ مسرت لغاری کی دم دار تحریر نے آخر تک سحر میں جکڑے رکھا۔ نہایت محبت کے ساتھ موضوع کو جدت کے قالب میں ڈھال کر حساس جذبے کی کمال ترجمانی کر دی۔ سہیخ ضو نے بھی شاندار کہانی لکھی۔ بانجھ کا موضوع پرانا مگر انداز تحریر اچھا تھا۔ سیدہ عروج فاطمہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ آپ کا حسن نظر ہے ورنہ میرے تبصرے بے ربط ہوتے ہیں اب اپنے معزز قارئین کی عدالت میں کچھ شب یلدا کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں۔ وکالت نہیں وضاحت، کیونکہ اپنی تحریر کی وضاحت کرنا ہر مصنف کا حق اور ذمہ داری بھی ہے۔ اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مطمح نظر تعریف ہے۔ وضاحت سے پہلے یہ یہ عرض کر دوں کہ شب یلدا رضوی دارالافتاء سے منظور شدہ کہانی ہے۔ شب یلدا کے حساس بنیادی موضوعات سرکشی، صبر، بھروسہ اور توبہ ہیں۔ سورۃ بقرۃ کی آیت (15) کے تحت ”خدا ڈھیل دیتا ہے اور لوگ سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔“ گویا شیطان کے قدموں کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور یوں ہو جاتے ہیں کہ گویا انہیں شیطان نے جھوٹا محسوس کر دیا ہو پھر جب وہ رجوع الی اللہ کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے۔ ”بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔“ اب اس کا الزامی مقصد نکالنا ہو تو پہلا الزام رب تعالیٰ کی ذات پر آئے گا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کہ جب وہ بندوں کو ڈھیل دیتا ہے بندہ گناہوں میں مکمل ڈوب جاتا ہے تو اس کے بعد بھی بخشش کی امید ختم نہیں کرتا۔ ارے بھئی جب بندے میں صبر کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو رب تعالیٰ فرماتا ہے ”ان اللہ مع الصابرین“ جیسا کہ شب یلدا میں امیر سیاف کا کردار ہے اور صبر کی صفت انسان میں تب پیدا ہوتی ہے جب بندہ ”من یتوکل علی اللہ کا مصداق بن جاتا ہے۔ اللہ پر مکمل بھروسہ کر لیتا ہے جیسا کہ محبت عمر نے کیا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ”ان اللہ یحب المتوکلین“ بے شک اللہ تو کل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور بھروسہ انسان بھی کرتا ہے جب وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (میری رحمت سے مایوس نہ ہو) جب انسان میں صبر اور بھروسے کی صفات پیدا ہوتی ہیں تو رب کی رحمت عیوب کی طرف نظر نہیں کرتی بے پایاں جوش میں آ کر ”کن فیکون“ کے حکم صادر کرتی ہے۔ پھر وہ نیکی کا صلہ نیکی بلکہ احسان کی صورت عطا کرتا ہے یہ اس کی مرضی ہے وہ احسان کس شعبے میں منتقل ہوتا ہے سورۃ توبہ آیت نمبر 102 میں ارشاد گرامی ہے۔ ”اور کچھ اور لوگ جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیے ہیں کچھ اچھے عمل اور کچھ

برے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“ اس کا واضح مطلب ہے کہ امید کا حتم ہونا مایوسی کو ختم دیتا ہے اور مایوسی کفر ہے اس لیے اپنے رب سے اچھے کی امید رکھو کیونکہ وہی ہے جو ہماری سری اور جہری دعاؤں کو سننے والا ہے۔ اگر وہ فرماتا ہے نہ کہ نیک غمے لیے نیک اور بد کے لیے بد تو اس کا دوسرا پہلو ان اللہ علیٰ کلی شئی قدیر بھی ہے ورنہ معاشرے میں نیک کے لیے بد اور بد کے لیے نیک کا عمومی جائزہ اور طلاق کے تناسب سامنے نہ آتے۔ ارشاد باری ہے ”جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی اور جائے پناہ مگر اسی ذات تب وہ ان پر مائل بہ کرم ہوا تا کہ وہ بھی رجوع کریں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔“ (سورۃ توبہ آیت نمبر 118) بندے کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو اسے بخش دینے کی صفت کا حامل ہے۔ پھر اللہ کو اپنے بندے کا گریہ نہ امت بہت پسند ہے۔ حدیث شریف میں ہے ”جو شخص تنہائی میں خدا کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں تو ایسے خوش نصیب کو پروردگار عالم قیامت کی پیش اور سخت دھوپ میں اپنے عرش کے سایہ رحمت کے نیچے جگہ عطا فرمائے گا۔ مزید فرمایا۔ ”جو شخص توبہ کر لیتا ہے وہ ایسے ہو جاتا ہے گویا گناہ کیا نہ تھا۔ حدود آرزوئیں کے توازن کے مکمل مطالعہ کے ساتھ ساتھ شب یلدا کو سمجھنے کے لیے فقیہا اور علماء کی تشریحات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ شریعت میں عزیمت اور نفعت دونوں پہلو موجود ہیں۔ حد کے لیے خود کو پیش کرنا افضل ہے مگر سچی توبہ کا پیمانہ صرف حدود آرزوئیں نہیں ہے۔ شب یلدا ابراہیم کے اسباب کا جائزہ لینے کی جسارت سے منفی رویوں کو فروغ دینا بالکل مقصود نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ”ان اللہ غفور رحیم“ گناہ کرنے سے پہلے توبہ کی اہمیت کو اجاگر نہیں کیا بلکہ گناہ کرنے کے بعد سمجھایا کہ مایوس نہیں ہونا تمہارا رب غفور رحیم ہے شرط سچی توبہ ہے۔ پھر بریدہ الملک اسی کے ہاتھ بادشاہی ہے۔ قصہ مختصر حد نافذ ہونے کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ جن کے لیے عزیمت اور رخصت کے تصور کو سمجھنا پڑتا ہے فقیہا کی تشریحات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر ایک بندہ سچی توبہ کرتا ہے اور دوبارہ فعل بد کا مرتکب نہیں ہوتا تو وہ ”لاریب“ نیک و باکر دار ہوتا ہے۔ باتیں کہانیاں میں ماہ ربیع الاول میں درس کی مصروفیات کی وجہ سے پڑھ نہیں پائی اس کے لیے معذرت آخر میں شب یلدا کو تعریف و تنقید کا حقدار سمجھنے والوں کا بہت بہت شکریہ جنہوں نے تعریف تنقید کے قابل بھی نہ سمجھا ان کا بے حد شکریہ اللہ پاک ہم سب کو دین کی سمجھ اور استقامت عطا کرے آمین۔

بھ: مون! تم نے درست کہا وضاحت تمہارا حق ہے مگر میری ایک بات پر ضرور توجہ دینا اور وہ یہ کہ تعریف اور تنقید دونوں کے لیے دل بڑا رکھنا بہت ضروری ہے تعریف پر ظرف کا نہ چھلکانا اور تنقید پر خائف نہ ہونا انسان کو بہت قد آور بناتا ہے۔

✉: نیر شفیقت لکھتی ہیں السلام علیکم! صد شکر کہ بتدریج دو شیزہ ہم تک جلد پہنچنے لگی ہے۔ پچھلے ماہ 16 کو شمارہ مل گیا تھا تو اس ماہ 12 اکتوبر کو دو شیزہ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ انشاء اللہ اگلے مہینوں میں یہ 10 سے بھی پہلے مل جایا کرے گا۔ اداریہ حسب سابق زبردست تھا۔ دو شیزہ کی محفل کچھ مختصر سی لگی۔ حضرت ام ایمنؓ کے بارے میں غزالہ عزیز نے ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا۔ جزاک اللہ خیر لاک ڈاؤن سروے نے مزہ دیا۔ ظہور الاسلام جاوید کے بارے میں بڑھ کر اپنی لاعلمی پر رنج کرا فسوس ہوا۔ ان کا نام بھی میری نظروں سے گزر نہیں۔ بہت خوبصورت شاعری ہے اور بہت خوبصورت سوچ کے مالک ہیں ماشاء اللہ حقیقت پر مبنی رضوانہ پریس کی خوبصورت تحریر لاک ڈاؤن نے مزہ دیا۔ مرد باہر ہی اچھے لگتے ہیں گھر بیٹھے مرد تو کسی چھوٹی موٹی ساس سے کم نہیں ہوتے بانجھ بھی اچھی تحریر تھی۔ عورت تو مرد کے راز رکھ سکتی ہے لیکن مرد بھی عورت کا ساتھ نہیں دیتا۔ نوری نے بہت اچھا کیا کہ جاتے جاتے اسدا کا بھانڈا پھوڑ گئی۔ ہاں تم ٹھیک رہی۔ انگوٹھی خوبصورت لفظوں کے ٹکینوں سے سچی خوبصورت تحریر تھی۔ شرود میں تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا تحریر ہے لیکن آگے بڑھنے کے ساتھ تحریر کھلی تو اس کی خوبصورتی کا احساس ہوا ویل ڈن حارہ یوں بدلی رُت بھی اچھی تحریر تھی شاکلہ کو دیر سے ہی سہی لیکن خوشیاں تو ملیں۔ سنیغ ضویو نیک سا نام ہے۔ ضوکا مطلب تو پتہ ہے سنیغ کا کیا مطلب ہے۔

مختصر سا افسانہ ابھی تحریر بھی۔ رمز بجز واصل کی دلچسپی اس وقت ٹھپ ہوئی جب جاری ہے نے منہ چڑایا، کہانی گھر گھر کی روشنیوں اور محبتوں کے اتار چڑھاؤ سے مزین خوبصورت تحریر بھی۔ فرحت نے برداشت کا سبق بڑے سبھاؤ اور خوبصورت طریقے سے دیا۔ خاصے کی چیز واقعی خاص تھی۔ اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ کچن کارز میں اس مرتبہ ہماری دعوت کر ہی دی شکر یہ پسندیدہ اشعار کا سلسلہ بھی کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا..... ہے نا.....! اجازت سب دوستوں کو بہت سلام اور دعا میں۔

بھ: اچھی نیر! چلو تمہیں بھی وقت مل ہی گیا دوشیرہ پر تبصرہ کرنے کا، یقین کرو تم لوگوں کے خطوط کی میں شدت سے منتظر رہتی ہوں۔

✽: فرحت صدیقی لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! سدا خوش رہو۔ اکتوبر کا دوشیرہ ہنسی مسکراتی ماڈل سے کھل اٹھا تھا۔ نیلا رنگ خوبصورت لگ رہا تھا خاص طور پر ایوارڈ کی تصویر نے چار چاند لگا دیے ہیں تحریم امان اللہ کو مبارکباد، حضرت ام ایمنؓ بہت دلکش تحریر کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو رسول پاک ﷺ کے دور میں تھے اور کتنے خوش قسمت ہیں ہم کہ ہم ان کے امتی ہیں سرورے نے گھر بیٹھے لوگوں پر جواثر ڈالنا تھا ڈال دیا مگر وہ لوگ جو باہر جاتے تھے لیکن بچوں کی رودی کے لیے خالی ہاتھ واپس آ جاتے تھے لاک ڈاؤن ان کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ ہاں یاد آیا۔ منزہ میں نے دوشیرہ کے لیے چھوٹی چھوٹی تحریریں بھیجی تھیں۔ ان کا کیا ہوا؟ ظہور الاسلام جاوید کا سوال آپ کے کتنے ہاتھ ہیں واقعی اللہ تعالیٰ نیت کو دیکھتا ہے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ نیا افسانہ پرانی حقیقت تصور وار صرف عورت ہی ٹھہرائی جاتی ہے۔ کوکھ خوبصورت کہانی میں بیلا کا خون آلود دودھ اس کا ٹنگن اور بے جان وجود کی بقیات دل بہت دکھ سے بھر گیا انگلی حاجرہ ربیعان نے کمال کر دیا یوں کہ اور یو ایس اے میں بہت سارے گھرانوں پر یہ کہانی فٹ ہوئی ہے۔ جہاں ماں باپ اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں اور بچوں کو اس دنیا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ندا کی قسمت اچھی تھی کہ اس کو اتنے اچھے انسان نے گود لے لیا اور ندا کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔ شگفتہ ہنیل کا افسانہ یوں پدلی رت کہ..... انجام تھا بہت دکھ دیکھ لیے تھے اُس نے اس کے صبر کا پھل مل گیا تھا۔ موتی کی یہ قسط بھی بہت اچھی رہی تھی خواب تو ٹوٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ بہت مشکل ہوتا ہے خوابوں کو برقرار رکھنا ابھی اتنا ہی بڑھا ہے اب اجازت چاہوں گی۔

بھ: فرحت آنٹی! اللہ کا شکر ہے اس بار آپ کا خط شامل محفل ہو گیا ورنہ ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا تھا آپ کی تحریر میں نے سالنامے کے لیے سنیا ل رہی ہے۔

✽: خولہ عرفان لکھتی ہیں۔ عزیز و محترم منزہ سہام صلیحہ السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ! امید و دعا ہے کہ سب جگہ خیریت و عافیت ہو۔ ماہ اکتوبر کا پرچہ مقررہ وقت پر مل گیا تھا لیکن ابھی چند افسانے اور ناول زیر نظر آنے سے قاصر ہیں بوجہ وہی نادیدہ مصروفیت..... البتہ جتنا بڑھا ہے اس پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے اور جب تک یہ تبصرہ مکمل ہوگا۔ ان شاء اللہ دو چار افسانے اور زیر مطالعہ آ جائیں گے۔ اب تک تو صرف موبائل ہاتھ میں پڑے صبح سے شام موقع کی تلاش میں ہوں کہ تبصرہ لکھنے کا سنہری موقع ہاتھ آ جائے اور جب تک وہ موقع ہاتھ نہیں آتا رسالے کی ورق گردانی جاری ہے لیکن شومالی قسمت..... جیسے ہی مطالعے میں غرق ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی کام کسی نہ کسی کوٹنے سے آواز دینے لگتا ہے کہ ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں.....“ اور یوں ایک افسانہ بھی قسط وار ناول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن موتی اب جبکہ اکتوبر کی آئیں تاریخ سر پر کھڑی ہے تو سوچا کہ اب قلم کو تبصرے کے لیے اذن سفر دے دوں۔ سو حاضر ہوں۔ منزہ مجھے لگتا ہے کہ آپ کو الہامی کیفیات ہوتی ہیں میں جو سوچ رہی ہوں اسے آپ کا ذہن بڑھ کر لفظوں کی صورت جلا دیتا ہے۔ آج کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے منزہ کہ انسان سب رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہے۔ کوئی کسی کو سنسنے کا روادار نہیں۔ کوئی کسی کو محسوس کرنے کا طلک گار نہیں۔ لفظوں سے مٹھاس اور رشتوں میں سے محبت کی باس ختم ہو چکی ہے لیکن پھر سوچتی ہوں کہ اتنا برا وقت بھی نہیں۔ کہیں نہ کہیں محبتوں کے پھول ضرور کھلے ہوئے ہیں ابھی بھی اچھے لوگ موجود ہیں درحقیقت

شاید ہم امیدیں زیادہ لگا لیتے ہیں۔ ضروری تو نہیں جو ہمارے ساتھ اچھا نہیں وہ سب کے ساتھ برا ہو کہیں نہ کہیں تو اچھا ہوگا بس یہ سوچ کر ہر ایک کو اپنی زندگی میں اچھا سمجھیں اور امیدیں کسی سے نہ لگائیں۔ یہی فلسفہ زندگی کو سکون دیتا ہے۔ ورنہ تو آنے والے دور میں ابن آدم ایک نئے بحران سے دوچار ہونے والا ہے جو خلوص و محبت سے بننے والے رشتوں کا ہوگا۔ بلکہ یہ بحران شروع ہو چکا ہے کہنا غلط نہ ہوگا۔ لوگ بہت تکلیف میں ہیں مولیٰ اناج کی نہیں پر خلوص جذبوں کے لیے بھوکے ہیں سب۔ میں ہر روز لوگوں کی تنہائیوں میں لپٹی فاقہ زدہ آنکھیں پڑھتی ہوں جسے بے اعتباری کی دیمک چائے جاتی ہے۔ مجھے ان کے سامنے ہنسا، خوشی کا اظہار کرنا جرم سا لگتا ہے۔ جیسے خود فانیہ اشار میں بیٹھ کر تیرنوالے حلق سے اتاریں اور ششے کی دوسری طرف بھوکی نظروں کی قطار حسرت سے کھانے کو تکتی رہ جائے۔ اس عالم نفسا نفسی میں کون دوست۔ کیسا دوست..... ہم تو انسانیت کے اول درجے پر ہی ناکام ہو جاتے ہیں۔ اول درجہ تو یہ ہے کہ اپنی بھوک چھوڑ کر دوسرے کا پیٹ بھرا جائے، اپنی تکلیف چھپا کر دوسروں کے لیے مسکرایا جائے اور یہ دوسرے کوئی غیر نہیں آپ کے وہ اپنے ہوتے ہیں جن سے آپ کے اختلافات چل رہے ہوتے ہیں۔ حق پر ہوتے ہوئے حق چھوڑ دینا بڑے اجر والا عمل ہے صلح رحمی اور معاف کرنے سے بڑا کوئی عمل نہیں۔ میرے اس موقف کے خلاف لوگ اتنے دلائل لاتے ہیں جبکہ میں صرف ایک بات کہتی ہوں کہ یہ رب کا حکم ہے قرآن میں آیا ہے کیا ایک مسلمان کے لیے اتنی بڑی دلیل کافی نہیں۔ لوگ ان احادیث کے ریفریٹس دیتے ہیں جن کو انہوں نے خود احادیث کی کتابوں میں پڑھا بھی نہیں ہوتا اور اگر پڑھا ہوتا ہے تو اس کے پس منظر سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والی صلح رحمی اور معاف کر دینے کی سورتوں پر مہمانی کرتے ہیں۔ اس لیے اب بنت خواہ ابن آدم اپنے اصولوں کو قرآن و احادیث سے بالاتر سمجھ کر ایک دوسرے کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں بنایہ سوچے کہ انسانیت اب سک رہی ہے۔ انسانیت کے درجے سے آگے بڑھتے ہیں تو محبت کے الہام ہوتے ہیں۔ دوستی کے مدارج آتے ہیں۔ منزہ آپ کے ادارے نے تو مجھے اچھا خاصہ ایجوٹل کر دیا۔ کاش لوگ سمجھ جائیں اس چند روزہ زندگی میں ایک دوسرے کی قدر کریں۔ بعد میں تعریف کرنے سے بہتر ہے اس کی زندگی میں اس سے محبتوں کا سودا کر لیں۔ بھلے دکھاوے کے طور پر ہی کریں۔ خیر غزالہ کا زاد راہ پڑھ کر زندگی بڑی پرسکون محسوس ہوئی ہے اللہ ہمارے قلم کو بھی اپنی راہ کا مسافر بنالے۔ آئین محفل میں مجھے اپنی کمی بہت محسوس ہوئی۔ ہا ہا ہا..... کیا کروں منزہ بہت عرصہ بعد بک اسٹال کے چکر لگائے مگر چیل کے گھونسلے سے ماس کی طرح دو شیرہ بک اسٹال سے غائب تھا۔ ہائے تمبر کا شمار نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ورنہ اپنی حشر بیانیوں کے ساتھ ضرور رونق افروز ہوتی۔ ہا ہا ہا..... جی تو محفل کا ذکر ہو رہا ہے تو سکیں، سنبھل، فرحت اور عروج فاطمہ بی نظر آئے۔ سنبھل میرے بغیر بہت تنہا لگ رہی تھی۔ روحی روحی سی سنبھل بھی کہے گی کہ خولہ کس قدر خوش بھیوں کا شکار رہتی ہے۔ بھئی باقی رونق محفل کہاں ہیں۔ ایک عرصہ ہوا سب قابل احترام مصنفین یعنی فرح اسلم، عقیدہ، صبیحہ، سیما مناف، شگفتہ شفیق، سیما مناف، سپارضا اور آسیہ چوہدری اور اور اور..... نہ تبصرہ نہ افسانہ؟ کی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ رضوانہ پرنس کا کافی وقت کے بعد رسالے میں افسانہ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوئی اور لاک ڈاؤن کے ازدواجی زندگی اس طرح کے اثرات کے ہم خود چشم دید گواہ ہیں۔ واقعی انسان عموماً خود راہ میں خوش نہیں رہتیں۔ ہا ہا ہا..... فرحت کی کہانی گھر گھر اور ارشد ابراہیم کا انجھ دونوں گھریلو ازدواجی رشتوں کی پاسداری کے عکس کرنی خوب صورت تحریریں تھیں۔ حاجرہ ریحان کی آگاہی نے انگلش سینیٹس مود پر کی یاد تازہ کر دی۔ صبح صبح خواب ٹوٹنے اور سیہ و جیہ کا ہاں تم دونوں بہت عمدہ و حقیقت سے قریب ترین تحریریں تھیں۔ شگفتہ سنبھل کے یوں بدلی رت۔ مختلف اختتام کے ساتھ بہترین تحریر بھی شاملہ نے اچھا اسٹیپ لیا مگر یہ ایک عورت کیلئے بڑی آزمائش ہوئی ہے۔ البتہ خاصے کی چیز حسرت لغاری کی ریڈ لائٹ واقعی خاصے کی ثابت ہوئی۔ درحقیقت محبت دل کا معاملہ ہے جب ذہن اس میں مداخلت کر کے اپنی منطق و تدابیر استعمال کرتا ہے تو ایسا ہی کچھ زندگی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں مگر نہ وہ محبت ہوتی ہے نہ رشتے کا احترام اور سوری خواہش

انسان کو ادھورا ہی رہتی ہے چاہے اس کا تعلق محبت سے ہو یا کسی اور جذبے سے۔ لیکن انداز تحریر کے اچھوتے پن اور جذبات کی بہترین ترجمانی اور نفسیاتی کیفیات کے تقاضوں کی عکاسی نے کمال کر دیا۔ بادِ موسم اور پچھڑنا بھی ضروری ہے کہ کچھ قسطِ ستمبر کے دوشیزہ کی عدم دستیابی کے سبب ادھوری ہے وہ پڑھ کر پھر تبصرہ کروں گی۔ ٹمبیز کا بھی مولیٰ ضرور پڑھوں گی ان شاء اللہ..... ٹمبیز کا انداز تحریر موضوع دونوں غضب کے ہوتے ہیں۔ بس منزہ یہی ناول زیرِ مطالعہ آنے سے محروم ہیں۔ بس تبصرہ روانہ کرتے ہی پہلی فرصت میں لے کر بیٹھوں گی۔ بہت عرصے بعد اتنا طویل تبصرہ لکھنے کا موقع ملا ہے۔ تو سوچا اگلی پچھلی کسر نکال دوں۔ اللہ تعالیٰ دانیال اور زین کو آپ کے لیے دونوں جہاں میں دل کی ٹھنڈک کا باعث کرے اور ہم اپنی ہنس مکھ اور سدا بہار شخصیت والی منزہ کے ہمقدم دوشیزہ کے سفر کو جاری و ساری رہیں۔ دوشیزہ مصنفین و مبصرین و قارئین اور مدیرہ دوشیزہ کے لیے برخلوص دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔

بھ: خولہ! ڈیڑھ المیہ تو یہی ہے ہم بیمار کی عیادت کو نہیں جاتے مگر سفید جوڑا پہن کر جنازے میں شرکت یقینی بناتے ہیں بس اب اس کے بعد کیا کہوں مگر زندگی نے ایک سبق بہت اچھا دیا اور وہ یہ کہ اچھے سے سمجھا دیا کہ نہ جانے میں ہی نجات ہے۔ تبصرہ تمہارا ہمیشہ کی طرح زبردست ہے میں تو بس یہ جانتی ہوں جو انسان را بطوں کا اتنا پابند ہو اس کو تو حنوط کر کے رکھ لینا چاہیے۔

✉: سنبھل کراچی سے بہت پیاری منزہ السلام علیکم الحمد للہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت رب العالمین سے نیک مطلوب ہے اس بار ادارہ بہت خوب تھا واقعی پاگل تو ہم ہیں جو دنیا کمانے میں لگے ہیں ورنہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں دنیا کے خزانے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقر کو چنا اور اسی میں بہترین امت کی تشکیل کی۔ اس بار دوشیزہ محفل میں کورم پورا نہیں تھا منزہ کے اتنی آسانیاں فراہم کرنے کے باوجود ذرا سب سوچیں اس طرف۔ خولہ یہ مکتب عشق ہے یہاں سبق یاد کرنے والوں کے لیے چھٹی کی گنجائش نہیں ہے آئندہ دھیان رکھیے گا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک خوبصورت اور معلوماتی تحریر بھی جزاک اللہ خیرا کثیرا غزالہ۔ پچھڑنا تو دیکھی گئی یہ نہیں کیا ہوا ہے کیری اور بچوں کے ساتھ۔ سروے شاندار رہا سب نے اپنے دل کھول کر رکھ دیے لیکن جو لوگ اس عرصے میں رب سے فریب ہوئے انہوں نے فلاح پائی۔ ظہور الاسلام صاحب کی شاعری، شخصیت اور انٹرویو سب کمال تھے۔ لاک ڈاؤن پر رضوانہ نے بڑا صائب افسانہ لکھا ہے بہت خوب۔ ارشد ابرار ارشد کی بانجھ بہت خوب صورت تحریر بھی ہمارے ایسے کتنی ہی عورتیں مردوں کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ یادِ موسم اپنے اختتام کی طرف گامزن ایک خوبصورت تحریر جو مدتوں یاد رہے گی۔ ہاں تم ٹھیک تھی اس تحریر میں تسلسل کی کمی تھی اور اختتام میں جلد بازی جس نے تحریر کے حسن کو گھنا دیا۔ حاجرہ ریحان کی انگوٹھی بہت خوب صورت تحریر بھی ایک تو حاجرہ ریحان کے لکھنے کا انداز ہی بڑا منفرد ہے اور وہ ہفتی بھی عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ شگفتہ سہیل نے بھی اچھی تحریر لکھی وہ مسئلہ جسے ہم نے انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے اللہ نے ناپسندیدگی کے باوجود طلاق کو حلال اسی لیے قرار دیا ہے کہ ناپسندیدہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ مگر ہمارے ہاں تو لوگ کیا کہیں گے کا عذاب ہم نے باخوشی اپنے سر پر مسلط کر رکھا ہے۔ مولیٰ اچھی چل رہی ہے۔ سنیخ ضو کی تحریر اچھی تحریر تھی۔ امید کے دیے روشن کرتی تحریر بہت خوب۔ رمزِ بچرو وصل پر تبصرہ ملے ہونے پر پچھلے مہینے زارا رضوان کی تحریر مردی کے پوفانی اور عورت کی وفا اور ایثار پر ایک اچھی تحریر تھی ان کے لکھنے کے انداز میں چٹکی ہے۔ فرحت انصاری کی تحریر بھی اچھی تھی اور خاصے کی چیز واقعی خاصے کی چیز تھی کیا مرد کی نفسیات کی پرتیں کھولی گئی ہیں زبردست مزہ آ گیا۔ دوشیزہ گلستان میں تین عنایات۔ اہل دانش کی مائیں زبردست تھیں سخن زار لا جواب۔ چن کارنر mouth watering شو ز خبر نامہ ٹھیک۔ تحریم امان اللہ کو ایوارڈ کی بہت بہت مبارکباد۔ منزہ یہ تو ہوا تبصرہ اب سناؤ کیا حال احوال ہیں موسم بہت خشک چل رہا ہے آج کے انسان کی طرح۔ طبیعت اب کیسی ہے ان شاء اللہ اچھی ہی ہوگی ہماری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں اچھا اب اجازت دو اپنا بہت خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا فی امان اللہ۔

سبیل! اچھا کہا موسم بہت خشک چل رہا ہے آج کے انسان کی طرح ایک بار پھر محنوں اور مشکور ہوں مصروف تو تم بھی ہوتی ہوگی مگر پھر بھی پابندی سے حاضری لگاتی ہو یہ جو خواتین غائب ہیں نہ اب میں ان کے وارنٹ جاری کرتی ہوں حاضر ہو جائیں ورنہ..... دیکھو دیکھی کارگر ثابت ہوتی ہے انہیں۔

☒ سیدہ عروج فاطمہ ملتان سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! اُمید ہے ہماری دوشیزہ فیملی سے وابستہ تمام افراد خیریت سے ہوں ہیں۔ دوشیزہ ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ میری راننگ ٹیبل پر موجود ہے جسے میں نے خط لکھنے کے لیے پھر سے کھول لیا ہے۔ سرورق پر ہنسی مسکراتی دوشیزہ اچھی لگ رہی ہے۔ تحریم امان اللہ کو دوشیزہ راسٹر ایوارڈ کی ڈیڑھوں مبارک باد۔ ادارہ ہر ماہ ہی بہترین ہوتا ہے لیکن اس بار تو منظرہ آپ کی لیے کھڑے ہو کر تالیاں بجانے کا دل چاہ رہا ہے۔ آپ کی لپٹی تو بڑی سیانی تھی۔ ٹھیک بات کہی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے والے صرف وقت کا زیاں کرتے ہیں۔ اکثریت کو خود سے زیادہ دوسروں کے ذاتی معاملات کی فکر ہے۔ اس کے بعد میں نے دوشیزہ کی محفل میں قدم رکھا۔ ارے بھی کہاں ہیں آپ سب؟ اس بار کم خطوط شائع ہوئے ہیں۔ آپ سب کی موجودگی سے ہی تو رونق ہوتی ہے۔ زادراہ پڑھ کر سکون خود میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ سلسلے وار ناول ”چھترنا بھی ضروری تھا“ میں مجھے سرخیل اور نور والا پورٹن بے حد پسند ہے۔ سرخیل نے بڑے ادب کے ساتھ نور سے بات کی کوئی اور مرد ہوتا تو تھپڑ مار کر اپنی انا کا مظاہرہ کرتا لیکن اُس نے صبر سے کام لیا۔ بادسوم بھی اچھا جا رہا ہے۔ شمیم مشتاق کی پوسٹ نظروں سے گزری تھی جس میں لکھا تھا ناول ”موتی“ کی نئی قسط آپ سب کو چونکا دے گی۔ تب سے میرے من میں تحریر پڑھنے کی خواہش کے پرندے نے چھپانا شروع کر دیا تھا۔ انتظار تب ختم ہوا جب پوسٹ مین نے دروازے پر دستک دی۔ شمیم جی دل درد سے بھر گیا۔ کمال کر دیا آپ نے۔ میری طرف سے شاباش قبول کریں۔ اب آتے ہیں اُس افسانے کی جانب جو واقعی میں افسانہ تھا۔ جس میں وحدت کے تاثر کا خیال رکھا گیا ہے۔ غیر ضروری تفصیل سے جھول نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ مصنفہ صبیحہ ضو کا افسانہ ”خواب ٹوٹنے نہ پائیں“ ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ میری نظر میں تو یہ افسانہ ٹاپ پر ہے۔ رضوانہ پرنس نے بھی اپنے افسانے سے ذہن پر اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ افسانہ ”لنگوٹی“ منفرد موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اپنی زبردست تحریر لکھنے پر مصنفہ گوڈی داد۔ سیدہ وجیہہ بخاری کا افسانہ ”ہاں تم پڑھنے کے دوران آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ شکفتہ سہیل نے اپنی تحریر میں ہمارے معاشرے کا المیہ بیان کیا۔ دوسروں کے رحم و کرم پر رہنے والا انسان کبھی تڑپ نہیں کر پاتا ہے۔ فرحت انصاری ”کہانی گھر گھر کی“ لے کر حاضر ہوئیں۔ اختتام میں سب ہی رزمیں دم توڑ گئیں اور اسی بات نے تحریر کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا۔ زار رضوان کو قسط وار ناول ”رمز ہجر وصل“ لکھنے پر دلی مبارکباد۔ انٹرویو سیشن کی بدولت ادب سے لگاؤ رکھنے والی شخصیات کے بارے میں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ ارے واہ کچن کارنر میں تو بہت مزے کے کھانے بن رہے ہیں۔ ایک طرف ملتان تو رملہ تیار ہو رہا ہے اور دوسری جانب ریشہ دار من مصلحے نے دھوم مچا رکھی ہے۔ پان اپیل راس بھی اچھے بنے ہیں۔ سوئٹ اینڈ سار بیف و د اسپیکٹیز تو سب پر بازی لے گیا۔ آخر میں جھور کا حلوہ ضیافت کو چار چاند لگانے میں کامیاب رہا۔ واہ دوشیزہ تمہارے ہاتھوں میں تو جادو ہے۔ شو بزم خیر نامہ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اس مرتبہ بھی توجہ سے اس کا ہر ایک لفظ پڑھا۔ سخن زار میں شامل ساری شاعری ہی لا جواب تھی۔ دوشیزہ کے گلدستے کے سب ہی گل مجھے پسند آئے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر سے خط کی بدولت نصف ملاقات ہو جائے گی۔

بھ: اچھی عروج! خوش رہو اور اسی طرح خوشیاں بکھیرتی رہو بھی مصنفین کی محنت کو سراہنا ان کو خوشیاں دینے کے ہی تو مترادف ہے، ہم سب اتنی محنت اسی لیے تو کرتے ہیں کہ سرہائے جائیں یا کم از کم کوئی رائے تو ملے۔ ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام مرزا

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دوشیزہ کے حصول میں اگر کوئی

بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے، خوش رہیے خوش رکھیے۔

نبی ﷺ رحمت کی گھریلو زندگی

ﷺ

مصطفیٰ ﷺ جان رحمت پر لاکھوں سلام
شیخ بزم ہدایت پر لاکھوں سلام

ﷺ

گھر والوں اور عام افراد تک مسلسل اور مربوط رابطے میں رہتے ہیں۔

آپ جب بھی باہر جاتے راستے میں ملنے والوں سے سلام دعا کرتے سلام کے ساتھ اگر کوئی پیغام بھیجنا ہوتا تو ساتھ دیگر متعلقہ افراد کو بھی سلام بھیجتے کوئی ناپسندیدہ شخص بھی جس کی ناپسندیدگی کی وجہ بھی دین اسلام سے بغض ہوتا اگر ملنے آتا تو خندہ پیشانی سے ملتے ایک دفعہ ایک شخص آیا جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے کہا کہ یہ نہیں اخوالعشیرہ ہے یعنی اپنے گروہ کا برا آدمی۔

مگر جب آپ ﷺ اس سے ملے تو بے تکلفی سے بات چیت کی حضرت عائشہؓ نے اس کے جانے کے بعد تعجب کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

”قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے باعث ملنا جلنا چھوڑ دیں۔“

رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کیسے زندگی گزارتے تھے ان کے معمولات کیا تھے؟ گھر کے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہوتا تھا خوشی اور غم میں ان کے مزاج پر کیا اثرات ہوتے تھے اور ان اثرات کا گھر والوں کے ساتھ ان کے رویے پر کس قسم کا اثر ہوتا تھا؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں جو دلوں میں اٹھتے ہیں۔ خاص طور سے نوجوانوں میں آئیے ہم ان سوالات کے جوابات کے لیے سیرت رسول ﷺ سے رجوع کرتے ہیں۔

یوں تو عام طور پر یہ بات معاشرے میں عام ہے کہ جو شخص راہ نمائی کے منصب پر ہوتا ہے وہ عوامی رابطے کے عام لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا خلاف شان سمجھنے لگتا ہے۔ گھر کے لوگوں سے بھی اس کا رویہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اپنے ہی گھر والے اس سے شاکي رہتے ہیں لیکن جب ہم پیارے رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انسانیت کے عظیم منصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ ﷺ اپنے قریبی حلقوں

گھر اسلامی نظام زندگی کی اکائی کہلاتا ہے۔ جس پر اسلامی نظام اور معاشرے کا دار و مدار ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا پہلا گھر جس میں حضرت خدیجہؓ بیوی کی حیثیت سے داخل ہوئیں مکہ میں تھا اور ابھی غار حرا میں آپ ﷺ جایا کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت خدیجہؓ پہاڑ کے دامن میں کبھی اپنا خیمہ لے کر پڑاؤ کرتیں اور آپ ﷺ کا انتظار کرتیں۔ جب نبوت کے لیے آپ کو چن لیا گیا تو سب سے پہلے آپ کی سچائی کی گواہی دینے والی اور ایمان لانے والی آپ ﷺ کی زوجہ حضرت خدیجہؓ ہی تھیں۔ اور گھر میں آپ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ تھے یعنی گھر کے لوگ آپ ﷺ کی بات پر سب سے پہلے دل و جان سے ایمان لائے کیونکہ وہ آپ ﷺ کو قریب سے جانتے تھے کہ آپ ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

اخلاق کی سب سے زیادہ پرکھ کرنے والی ہستی بیوی ہوتی ہے۔ اسی لیے شاید آپ ﷺ نے بیانہ بھی یہ ہی دیا ہے کہ..... ”تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں سے (اخلاق میں) اچھا ہے۔“

گھر میں انسان اپنے اوپر ملح نہیں چڑھا سکتا وہ جیسا ہوتا ہے عموماً ویسا ہی نظر آتا ہے۔ باہر وہ اپنے آپ کو ضبط کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ ”لوگ کیا کہیں گے؟“ اسے اس بات کا دھیان ہوتا ہے۔ لیکن گھر کے اندر وہ بناوٹ اختیار کر کے نہیں رہ سکتا خاص طور سے وہ جو کہ ”تواضع“ کی ہو یعنی گھر میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتا ہو۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی خاص طور سے خانگی زندگی کا

جائزہ لیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہاں تو ایک گھر ایک بیوی کے ساتھ خوشگوار حالات ہونے مشکل ہوتے ہیں۔ جبکہ وہاں تو کثرت ازدواج بھی تھیں مالی صورت بھی درگروں تھی۔ پھر ازدواج بھی مختلف عمروں قابل ذہنی صلاحیت معاشرت اور پس منظر کی تھیں۔ اُن کا مقصد بھی یہ ہی تھا کہ مختلف سطح کی خواتین کو اسلام کی تعلیم و تربیت دی جائے۔

حضرت خدیجہؓ سے جب آپ ﷺ کا نکاح ہوا تو آپ ﷺ پچیس (25) سال کے اور حضرت خدیجہؓ چالیس کی تھیں آپ ﷺ نے پورے پچیس سال تنہا حضرت خدیجہؓ کی رفاقت میں گزارے۔ ابتداء سے لے کر آخر تک آپ ﷺ کے درمیان انتہائی خوشگوار تعلقات رہے۔ اتنے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ ان کو یاد کیا۔ حضرت خدیجہؓ کی رفاقت بھی مثالی تھی غار حرا سے آپ ﷺ لوٹے تو لرزیرہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی۔

”ہرگز نہیں آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں سچ بولتے ہیں امانتیں ادا کرتے ہیں بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں نیک کاموں میں مدد دیتے ہیں خدا کی قسم آپ ﷺ کو کبھی اللہ رسوا نہ ہونے دے گا۔“

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کی رفاقت اُن کی زندگی میں تو مثالی تھی ہی ان کے اس دنیا سے جانے کے بعد بھی رہی۔

آپ ﷺ کے پاس کوئی اچھی چیز لائی جاتی تو آپ ﷺ فرماتے یہ فلاں خاتون کے گھر پہنچا دو کہ وہ خدیجہؓ کی سہیلی ہیں۔ جانور ذبح کرتے تو گوشت حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھیجتے۔

حضرت عائشہؓ ایک دفعہ حضرت خدیجہؓ کی اتنی زیادہ قدر اور تعریف پر الجھ گئیں تو آپ ﷺ کا روئے مبارک غصے سے سرخ ہو گیا فرمایا۔

”اللہ کی قسم وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب لوگوں نے میرا انکار کیا، اس نے مجھے اس وقت جگہ دی جب لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا، اس نے میری تصدیق کی جب لوگوں نے جھٹلایا۔“

مرد کے لیے تو بیوی کی زندگی میں اس کی تعریف اور احسانات کا تذکرہ مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ انتقال کے بعد ایسے یاد رکھا جائے عرب معاشرے میں تو عورت پھر بیوی اس کا اکرام عام نہ تھا۔ اجنبی تھا لیکن جب آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ فرمایا۔

”عائشہؓ.....“ سوال پھر دوہرایا گیا کہ مقصود مردوں میں سے تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

”عائشہؓ کا باپ.....“ دیکھیے کہ حوالہ حضرت عائشہؓ کا ہی دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں عورت کے حوالے کو اپنی مردانگی کے لیے مسئلہ کبھی نہیں بنایا گیا۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی سواری کا اونٹ بدک کر بھاگا تو آپ ﷺ بے قرار ہو کر پکارے۔
”واعروساہ.....“

”ہائے میری دلہن.....“ بیوی سے یہ اظہار الفت ہی تھا آپ ﷺ نے اس میں کوئی عار محسوس نہ کی نہ شرم کسی نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا رسول خدا کا گھر میں کیا حال ہوتا تھا؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

”سب سے زیادہ متبسم، نرم خو، خندہ جبیں اور شفیق..... آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اپنے اہل و عیال سے شفیق نہ تھا۔“

یہ ہی گواہی حضرت انسؓ کی ہے جو دس برس تک آپ ﷺ کی خدمت میں رہے کہ آپ ﷺ

نے کبھی ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات غصے سے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ کام کیوں نہ کیا یا یہ کام کیوں کیا؟ ایک دفعہ کسی نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے بتایا۔

”آپ ﷺ آدمیوں کی طرح ایک آدمی تھے اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود کر لیتے، بکری کا دودھ خود دوہتے، اپنے کپڑوں میں خود ہی پیوند بھی لگا لیتے اپنا جوتا خود مرمت کر لیتے، اپنے ڈول میں ٹانگا لگا لیتے۔ بوجھ اٹھا کر جانوروں کو چارہ ڈالتے، اگر کوئی خادم ہوتا تو اُس کے ساتھ مل کر کام کروا لیتے مثلاً آٹا پسوانا، بازار سے سودا لانا وغیرہ۔“

ہمارے ہاں ایک عام مرد بھی ایسے کچھ کاموں کو کرنے میں متذبذب رہتا ہے۔ پھر اگر کوئی لیڈر ہے تو وہ تو اپنا ریف کیس اٹھانے کے لیے بھی نوکر کی طرف دیکھتا ہے گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے بھی نوکر کا منتظر ہوتا ہے۔

گھر میں گھر والوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ بے تکلف اور محبت آمیز ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دسترخوان میں آپ کی موجودگی میں حضرت عائشہؓ نے حضرت سودہؓ کو ایک کھانا جو بیٹھے دیے سے مشابہہ تھا کھانے کے لیے کہا۔ حضرت سودہؓ نے انکار کیا حضرت عائشہؓ نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آپ کھائیے ورنہ میں یہ آپ کے منہ پر مل دوں گی۔“ حضرت سودہؓ نے پھر بھی نہ کھایا تو حضرت عائشہؓ نے اُسے لے کر حضرت سودہؓ کے منہ پر واقعی مل دیا۔

آپ ﷺ اس پر ہنس دیے اور حضرت سودہؓ سے کہا۔

”تم بھی ایسا ہی کرو تاکہ حساب برابر ہو جائے۔“ انہوں نے ایسا ہی کیا اور آپ ﷺ خوب ہنسے حضرت عائشہؓ کم سن تھیں اسی لحاظ سے

تین چیزیں

☆ تین چیزیں حاصل کرو علم، اخلاق، شرافت۔

☆ تین چیزیں پاک رکھو جسم، لباس، خیالات۔

☆ تین چیزوں کے لیے لڑو حق، ملک، مظلوم۔

☆ تین چیزوں کے لیے تیار رہو موت، زوال، غم۔

←→ مرحلہ۔ سید فرحان احمد، کراچی۔

آپ کے شوق تھے لیکن آپ ﷺ نے کبھی انہیں ڈانٹا نہ اُن کے شوق کا مذاق اڑایا۔ اُن کی ذوق کے مطابق کہانیاں سنائیں ان کو حبشی بازی گر کا تماشا دکھایا ریس لگائی سہیلیوں کو بلوا کر ان کے ساتھ کھیل جاری رکھنے کو کہا۔

مزے مزے سے بے تکلف ماحول کے درمیان جہاں اذان کی آواز آتی آپ کھڑے ہو جاتے اور یوں نماز کے لیے چل دیتے کہ جیسے اب کوئی تعلق اُس تعلق سے اہم نہیں۔

کاشانہ نبوت میں ایسا بھی دور ہوتا تھا کہ ایک ایک ماہ چولہا نہ جلتا لیکن کبھی فراغت ہوتی بکری ذبح ہوتی تو گوشت تقسیم کراتے ایسے ایک موقع پر حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔

”کنتا بچا؟“ حضرت عائشہؓ نے کہا۔
”ایک شانہ بچایا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا۔

”نہیں یہ نہ کہو بچا تو وہ ہے جو تقسیم ہوا ہے اور جو موجود ہے وہ تو کھائیں گے اور ختم ہو جائے گا۔“ تربیت کا کیسا پیارا انداز ہے۔ یہ ہی تربیت تھی کہ ازدواج المطہرات صدقہ و خیرات میں آگے رہتی تھیں فتوحات کے بعد حضرت عمر کے دور میں ہزاروں دینار ان کو بھجوائے جاتے اور رات ہونے سے پہلے گھر میں کچھ نہ بچتا۔

رسول اللہ ﷺ کو اپنی ازدواج کی نیند بھی پیاری تھی آپ ﷺ رات کے دوسرے نصف حصے کی ابتداء میں بیدار ہوتے تو خاموشی سے اٹھتے نماز کی تیاری کرتے آہستہ قرآن پڑھتے کہ حضرت عائشہؓ کی نیند میں خلل نہ پڑے پھر ذرا رات گزرتی تو آخر میں حضرت عائشہؓ کو اٹھاتے اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ نماز تہجد میں شریک ہو جاتیں۔

حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایسی بے تکلفی سے باتیں کرتے ایک دفعہ ایسے میں حضرت ابو بکرؓ آ گئے

اور انہوں نے بیٹی کو یوں شوخ انداز میں باتیں کرتے دیکھ لیا غصے میں مارنے کے لیے لپکے آپ ﷺ نے انہیں روکا غصہ ٹھنڈا کیا پھر جب حضرت ابو بکرؓ چلے گئے تو آپ ﷺ نے شرارت بھرے انداز میں حضرت عائشہؓ کو دیکھا اور فرمایا۔
”کیسا بچایا؟“

یہ محبت و شفقت سے لبریز انداز تھا جس نے آزمائشوں سے پُر زندگی کو خوشی سے ہمکنار رکھا۔ حالات جیسے بھی رہے فائق، ہجرت، جنگیں، جانی و مالی نقصانات لیکن سب مل جل کر ان سے گزرتے رہے۔ مزاح بے تکلفی اور محبت کا بھرپور اظہار گھر کو پُر سکون اور خوشیوں سے معمور رکھتا۔ ورنہ نہ آسائش تھیں نہ مال و زر اور نہ ہی اونچے محلات ایک حجرہ تھا چھ سیات ہاتھ بلند اسی طرح لبائی چوڑائی بھی اتنی ہی تھی بھگوری ٹہنیوں سے بنائی چھت تھی لیکن یہ محبت الفت شفقت اور عافیت کا وہ ٹھکانہ تھا جس پر رہتی دنیا تک کے محلات رشک کرتے رہیں گے۔



کچھڑنا بھی ضروری تھا

قسط 20

بعض اوقات انسان سوچتا کیا ہے اور ہو کیا جاتا ہے محبت اور

نفرت کے درمیان بہت باریک لکیر ہے مگر اس لکیر کو صرف وہی لوگ پاٹ سکتے ہیں جنہوں نے دونوں جذبوں کا مزہ چکھا ہو
دو شیزہ کے قارئین کے لیے ایک خوبصورت ناول

لیکن اس کی یہ مشکل سرخیل نے آسان کر دی۔ واش روم سے اتر اچھرہ اور سوچھی آنکھیں لے کر بیڈ

پر بیٹھ گئی اور کمرے سے باہر جانے کے لیے ہمت جمع کرنے لگی۔ وہ کب تک یہاں بند رہے گی آخر تو اس کمرے سے باہر جانا ہی ہوگا۔ سرخیل تو سب جانتا ہے لیکن بڑے بابا کیا سوچیں گے وہ بھاری قدموں سے اٹھی اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باہر کوریڈور میں دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کے قدم بے اختیاری گیسٹ روم کی طرف اٹھے دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی نہیں تھا۔ بیڈ شیٹ پر ایک بھی شکن نہیں تھی جیسے ساری رات کوئی نہ سویا ہو..... نور کے دل میں ہوک اٹھی۔

”تو کیا سرخیل جاگتے رہے ہیں تمام رات؟“

”بی بی..... آپ کے لیے کیا ناشتہ بناؤں؟“ پیچھے سے کوئل کی آواز آئی تو چونک کر مڑی۔

”بڑے بابا اور صاحب نے کرایا ناشتہ؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”بڑے صاحب نے کرایا ہے..... لیکن چھوٹے صاحب تو صبح صبح نکل گئے تھے گھر سے.....“

”اور ناشتہ.....؟“

”نہیں بی بی..... وہ کہہ رہے تھے انہیں جلدی جانا ہے۔“ نور کی سوچی آنکھوں میں درد ہونے لگا

اب اور آنسو بہانا مشکل ہو رہا تھا۔

”آپ کے لیے ناشتہ.....“

”رہنے دو..... بس چائے دے دو..... سر میں درد ہے۔“



”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بی بی..... چھوٹے صاحب کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ لگتا ہے ساری رات نہیں سوئے۔“ نور نے زخمی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور بڑی مشکل سے آنسو روکے۔

”بس چائے لے آؤ..... اور زیادہ باتیں نہیں کرو۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کھڑا رہنا مشکل ہو..... کتنی بڑی غلطی ہو گئی تھی اس سے..... چائے پی کر وہ بڑے بابا کے کمرے میں آئی۔ وہ صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے اور اخبار رکھ دیا..... محبت سے اُسے دیکھا پھر چونک گئے۔

”کیا بات ہے بیٹا..... لگتا ہے رات کو اچھی نیند نہیں آئی..... آنکھیں تھکی تھکی اور سو جی ہوئی لگ رہی ہیں۔“

”ہاں بڑے بابا..... سر میں درد تھا۔ اس لیے سونے میں مشکل بھی پیش آئی۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”سرخیل بھی یہی کہہ رہا تھا..... کیا تم دونوں نے ایک ہی جواب سوچ رکھا تھا۔“ نور نے بے اختیار سر جھکا لیا تاکہ وہ اُس کے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

”کیا جھگڑا ہو گیا ہے؟“ بڑے بابا شرارت سے بولے۔ نور کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”وہ ناشتہ کیے بغیر چلے گئے ہیں۔“

”بس اتنی سی بات.....“ بڑے بابا مسکرائے۔

”فکر مت کرو..... وہاں کچھ کھالے گا میں اسے جانتا ہوں کھانے سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا۔“

”بڑے بابا..... اگر آج میں سارا دن نیچے گزار لوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”اعتراض کیوں ہوگا بیٹی..... بلکہ چلو آج ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں اور سارا دن نیچے گزارتے ہیں۔“

”اور اگر میں رات کو بھی امی کے پاس سو جاؤں تو؟“

”بھئی یہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے..... یہ اپنے شوہر سے پوچھو یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔“ بڑے بابا کی آنکھوں میں پھر شرارت تھی۔

”وہ کچھ نہیں کہیں گے..... میں جانتی ہوں۔“

”پھر ٹھیک ہے..... بھئی تمہارا میکہ ہے جب چاہو رہ سکتی ہو۔ بلکہ کبھی کبھی رہا کرو۔ سرخیل کو بھی تو تمہاری اہمیت کا پتہ چلے..... وہ بھی تمہیں مس کرے..... اس طرح محبت بڑھتی ہے۔“

دل میں پھر درد کی لہر اٹھی۔ کوئی محبت..... کیسی محبت..... محبت تو خیر ہونے سے پہلے ہی مرنے جا رہی ہے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہاری بے دقتی، کم عقلی اور غصہ کنٹرول نہ کرنا، یہ وجہ ہے تمہاری تکلیف دہ وقت کی..... قسمت کو کیوں الزام دیتی ہو۔

نیچے آنے کے بعد بڑے بابا تو اپنے بھائیوں کے ساتھ لاونج میں بیٹھ گئے اور وہ سیدھی اپنے پرانے کمرے میں آ گئی۔ آج وہ سب کی نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ دور بہت دور چلی جانا چاہتی تھی۔ سبیل

فائزہ اور عازہ سے بھی ملنا نہیں چاہتی تھی۔

یہاں تک کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امی سے بھی بات کرے وہ اُسے دیکھیں اور اُن کی تیز عقباتی نظریں اُسے دیکھتے ہی سمجھ جائیں کہ کوئی بات ہے..... کچھ غلط ہے..... وہ کیا جواب دے گی..... کیسے انہیں مطمئن کرے گی وہ تو رات بھی یہیں رہنا چاہتی تھی۔

سرخیل کا سامنا نہ کرنے کے لیے وہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ یہاں رہ کر بھی وہ اس کے دل سے نکلنے والا نہیں..... اس کمرے میں بھی..... وہ اسی طرح مضطرب رہے گی یہاں بھی وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہے گی۔ روتی رہے گی اور بچھتاہی رہے گی۔ وہ کبل لے کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ ساری رات کی جاگی ہوئی پریشان حال تھی اعصاب تھکے ہوئے تھے جسم دکھ رہا تھا..... تھوڑی دیر میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ نیند کی آغوش میں تھی۔ وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ سبیل اور عازہ فائزہ یونیورسٹی میں تھیں۔ ورنہ اسے بھلا کون سونے دیتا اور اُس کی حالت دیکھ کر سب کو اندازہ ہو جانا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے سبیل نے تو صاف کہہ دینا تھا کہ سرخیل اور نور میں لڑائی ہوئی ہے۔

چار پانچ گھنٹے وہ بے خبر سوئی..... امی دوبار آ کر اُسے دیکھ چکی تھیں پہلے تو انہیں پتہ نہیں تھا عقل چوہدری سے معلوم ہوا تو اُسے دیکھنے آئیں۔ مگر ہر بار وہ سوتی ہوئی ملی..... اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کوئی غیر معمولی بات ہے وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں اُسے سمجھانا چاہتی تھیں مگر اُن سے پہلے ہی سبیل وغیرہ نے آ کر اس پر ہلہ بول دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اور گھبرا کر اُن تینوں کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ تو تم ہمیں بتاؤ گی نور بی بی کہ کیا ہوا؟“

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو

تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

سبیل نے بڑے انداز سے کہا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”یہ آنکھیں کیوں سوچی ہیں محترمہ..... کیا روتی رہی ہو؟“

”نہیں تو..... رات سر میں درد تھا تو سونہیں سکی۔“ وہ گھبرائی۔

”اور سر میں کیوں درد تھا..... جو جاتی رہیں..... سرخیل بھائی نے کوئی دوا وغیرہ بھی نہیں دی..... آخر کس قسم کے ڈاکٹر ہیں وہ.....؟“

”چلو بس کرو سبیل..... تم تو پولیس والوں کی طرح سوالات کی بھرمار کر دیتی ہو..... اچھا نور تم نے کھانا کھالیا۔“

”ابھی تو ابھی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تو چلو آ جاؤ پھر..... ہمیں تو سخت بھوک لگی ہے۔“ سبیل کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔ فائزہ پیچھے پیچھے تھی۔

”مجھے بھوک نہیں عازہ..... تم جا کے کھا لو.....“

”کیوں بھوک نہیں؟“

”سوئی رہی ہوں نا..... اس لیے ہیوی ناشتہ ہضم نہیں ہوا۔“ وہ چور نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”مجھے پتہ ہے سرخیل بھائی کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اترے گا.....“ وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

”کاش ایسا ہی ہوتا..... پتہ نہیں سرخیل نے کچھ کھایا یا نہیں۔“ وہ سوچنے لگی۔ ساری رات جاگنے کے بعد کافی تک نہیں لی۔ سبیل اور فائزہ کے آنے سے پہلے ہی عازرہ آ گئی۔

”ہاں..... اب جلدی سے بتاؤ کیا کہانی ہے..... سبیل اور فائزہ نے تو شاید یقین کر لیا ہو لیکن میں تمہیں جانتی ہوں تمہارا چہرہ سب بتا رہا ہے..... تم نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے سو جی آنکھیں ان کے نیچے سیاہ حلقے، بے رنگ اور بے رونق چہرہ اور اس پر دکھ اور درد کی پرچھائیاں..... کیا ہوا ہے سچ بتاؤ سرخیل بھائی سے بدتمیزی کی ہے نا؟“ نور نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”تم جانتی تک نہیں ہو کیا بات ہے اور مجھے تصور وار سمجھ لیا؟“

”ہاں کیونکہ میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور انہیں بھی..... تمہاری زبان کا بھی اندازہ ہے بچپن سے اور ان کی شائستگی بھی دیکھ چکی ہوں..... کیا کیا ہے اب تم نے بیوقوف لڑکی؟“

”جب تم مجھے ہی تصور وار سمجھتی ہو تو یہ بھی اندازہ لگا لو نا کہ میں نے ہی کوئی بڑی بدتمیزی کی ہوگی ان سے..... پوچھتی کیوں ہو؟“

”کتنی بڑی بدتمیزی.....“ عازرہ فکر مند ہوئی۔

”بہت بڑی عازرہ..... اور مجھے یقین ہے اس بار وہ مجھے معاف نہیں کریں گے۔“ اس نے سر جھکا لیا

عازرہ نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

”تمہارا کوئی علاج نہیں..... تم نہیں سدھ سکتیں..... کبھی نہیں..... اب بھگتو.....“

”تم نے مجھے صلواتیں سنانے کے لیے پوچھا تھا..... بس ہوگی نہ غلطی۔“ وہ مایوسی سے بولی۔ اُسی وقت سبیل چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی۔

”کھانا تو تم نے کھایا نہیں..... چائے تو پیو گی نا؟“

”ہاں..... سر میں ابھی تک درد ہے۔“ وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر لگ رہی تھی۔

”آ خر تمہیں ہوا کیا ہے؟“ سبیل نے پوچھا۔

”ابھی ابھی سرخیل بھائی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تھے اور دو منٹ کے بعد ہی اُسی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر آئے اور سیدھے باہر نکل گئے۔ اور پتہ ہے اُن کی حالت بھی ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے ساری رات نہ سوئے ہوں۔“ سبیل کی نظریں معنی خیز تھیں۔

نور کا چہرہ ایک دم ہی مزید بے رونق ہو گیا..... وہ بے انتہا سنجیدہ ہو گئی۔ رات کو اس نے امی سے

پوچھا۔

”امی آج میں یہیں سو جاؤں؟ بہت دن ہوئے اپنا کمرہ بہت یاد آ رہا ہے اور میں شادی کے بعد کبھی نیچے رہنے نہیں آئی۔“ نور نے چور نظروں سے انہیں دیکھا۔

”تو تمہارا سسرال کونسا کسی دوسرے شہر میں ہے جو تمہیں اُداسی ہو رہی ہے۔ یوں بھی سارا دن تم نیچے

ہی رہتی ہو..... سچ بتاؤ کیا ہوا ہے آج..... کیا گل کھلا کر آئی ہو..... جو اوپر جا کر کسی سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں۔“

”امی آپ تو خواہ مخواہ شک کرتی ہیں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔
 ”بس دل چاہ رہا تھا.....“ وہ گم صم سی تھی۔

”نور میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں..... جو تم مجھے یوں بہلا رہی ہو..... اگر تو تم سرخیل سے لڑائی کر کے آئی ہو تو ابھی واپس چلی جاؤ..... مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ہر دو روز بعد لڑکیاں لڑ کر اپنے میکے میں پناہ لیں..... ابھی اٹھو اور سرخیل کے آنے سے پہلے اوپر چلی جاؤ..... اسے شک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ تم نیچے سونے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ چلو اٹھو مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ اس کے آنے سے پہلے اوپر پہنچو۔“ پھلکتی آنکھوں کے ساتھ وہ اٹھی اور تیزی سے چپل پہن کر باہر نکل گئی۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچی تو بڑے زور سے کسی سے ٹکرائی۔ ایک لمحے کو آنسو بھری آنکھوں سے آنے والے کودیکھا۔ وہ سرخیل تھا..... بے نیازی اور بے گانگی اُس کی آنکھوں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ وہاں سے بھاگی..... گیسٹ روم میں آئی اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ آنسو متوڑا بہہ رہے تھے۔ مگر وہ سوچ رہی تھی کہ جب سارا قصور میرا ہے تو میں کیوں سرخیل کو کمرہ بدر ہونے دوں..... گیسٹ روم میں مجھے سونا چاہیے ہمیشہ کی طرح.....

☆.....☆.....☆

پھر اس طرح کی کتنی ہی بھاری..... مضطرب اور سفاک راتیں گزریں..... رومی اور جانی ایک دوسرے کے لیے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح وہ راتیں گزارتے رہے۔ پولیس انہیں تسلی دیتی رہی۔ انہیں ڈھونڈنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھانے کی یقین دہانی کرتی رہی۔ جانی کچھ روز کے بعد آفس جانا بھی شروع ہو گیا۔ رومی نے بوجھل دل اور درد کی انتہاؤں سے گزرنے کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ایک تو فاضل ہونے میں دو مہینے رہ گئے تھے۔ دوسرے گھر بیٹھ کر وقت گزارنا مشکل تھا۔

پاپا کی حالت اُس سے دیکھی نہ جانی..... پھر بھی اُن کا خیال رکھنا اُس کا فرض تھا۔ اُن کو زبردستی کچھ نہ کچھ کھلاتا..... اور خود بھی زہر مار کرتا کہ زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے۔ اُن دونوں کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ امید دم توڑ رہی تھی۔ ایسے میں دونوں کا یہ حال تھا کہ اگر وکٹر بریڈی اُن کی آنکھوں کے سامنے آتا تو شاید وہ اُسے قتل ہی کر ڈالتے۔

وکٹر نے اُن دونوں پر دوسری بار یہ اوچھا دار کیا تھا۔ رومی بمشکل امتحانوں کی تیاری کر رہا تھا۔ کتابیں کھولتا تو سارے الفاظ جیسے کیری، ٹونی اور شیرلی میں تبدیل ہو کر ناچنا شروع کر دیتے خیالات بھٹک بھٹک جاتے..... کتنی مشکل سے امتحان دیا تھا یہ کچھ وہی جانتا تھا۔ اُسے تو یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن وہ کامیاب ہونا چاہتا تھا دوبارہ اس عمل سے گزرنا بہت تکلیف دہ ہوتا..... امتحان ختم ہوئے تو پھر وہی دلکش انتظار تھا، وہی اضطراب تھا۔ پولیس اسٹیشن کے چکر تھے اور مایوسی..... اپنے طور پر بھی اس نے تیز چلانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب اتنی تجربہ کار پولیس انہیں تلاش نہیں کر سکی تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ چار ماہ بعد پولیس نے اس کیس کی فائل بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”سوری مسٹر جانی..... ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں چلی رہا..... ابھی ہم یہ فائل کچھ دیر کے لیے کلوز کر رہے ہیں اور زیادہ سیریس کیمرز ہماری زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ ہم صرف ایک کیس کی خاطر دوسرے کیمرز کو نظر انداز نہیں کر سکتے..... لیکن اگر کسی وقت بھی ہمیں کہیں سے بھی چھوٹا سا کلو ملا تو ہم فوراً کارروائی کریں گے۔“

”زیادہ سیریس کیمرز.....“ جانی نے سرد لہجے میں کہا۔

”میری بیوی اور دو بچے چار ماہ سے لاپتہ ہیں پتہ نہیں کس حال میں ہیں اور آپ کو لگتا ہے اس سے زیادہ سیریس کوئی اور کیس ہے؟“

”ہم آپ کا دکھ سمجھتے ہیں..... اور ہم نے پوری کوشش کی ہے..... لیکن کرائم مافیا نے بھی اپنی حفاظت کا جال بہت مضبوطی سے بنا ہوتا ہے..... اسے توڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا اگر ایسی بات ہوتی تو گٹر بریڈی کبھی جیل سے نہ نکل سکتا..... پھر بھی ہم وقتی طور پر اپنی توجہ زیادہ اہم کیمرز کی طرف کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں نے تو سنا تھا یہاں کی پولیس مجرم کو قبر سے بھی نکال لیتی ہے اور آپ تین افراد کا پتہ نہیں چلا سکتے؟“

”کوئی بھی ادارہ پرفیکٹ نہیں ہوتا مسٹر جانی..... دنیا میں کئی کیمرز ہیں جو کبھی حل نہیں ہوتے..... اور آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ کہنا نہیں جاسکتا کہ وہ زندہ ہیں یا.....“

”بس.....“ جانی نے ایک دم ہاتھ اوپر کیا۔

”آگے کچھ مت کہنا..... ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں..... لیکن ایسے اندازے ظاہر مت کریں۔“

جانی اٹھ کر اندر چلا گیا تو رومی نے معذرت خواہانہ انداز میں پولیس آفیسر کی طرف دیکھا۔

”سوری آفیسر..... آپ جانتے ہیں ایسی حالت میں کوئی انسان کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔“

”ہم سمجھ سکتے ہیں مسٹر..... لیکن آپ کو اپنے پایا کو کچھ دیر کے لیے یہاں سے لے جانا ضروری ہے کسی ایسی جگہ جہاں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان ہوں جو ان کا دکھ بٹاسکیں..... میرا مطلب ہے کوئی رشتہ داروں کے پاس.....“ آفیسر چلا گیا تو رومی پُرسوج انداز میں اندر گیا..... جانی سر ہاتھوں میں تھا مے لاؤنچ میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ مرد تھا تو ضبط کر رہا تھا..... ورنہ ٹوٹ کر بکھر جاتا آنسوؤں کے دریا بہا دیتا..... پھر جوان بیٹے کا بھی خیال تھا۔ اُس نے ہمت ہار دی..... وہ ٹوٹ گیا تو رومی بھی ٹوٹ جائے گا۔ جو پہلے ہی باپ کی خاطر خود کو مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا۔ آج کل دونوں باپ بیٹوں کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ نہ کپڑوں کا..... نہ بال کٹوانے کا اور نہ ہی کھانے پینے کا..... گھر کی صفائی بھی رومی ہفتہ وار چھٹی والے دن کرتا کھانا بھی وہی بناتا۔

”پاپا.....“ رومی نے اس کے پاس بیٹھ کر اپنے ساتھ لگایا۔

”پلیز ہمت سے کام لیں..... ورنہ میں بھی خود کو نہیں سنبھال پاؤں گا..... بس دعا کریں..... بہت زیادہ دعا کریں کہ وہ بیٹوں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں..... اور جب بھی خدا کو منظر ہو ہم سے آئیں۔“ جانی نے زخمی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”پاپا میری ایک بات مانیں گے؟“ وہ منت بھرے دھی لہجے میں بولا۔

”بولو.....“

”کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے پاکستان چلے جائیں..... تھوڑا سا دھیان بٹے گا آپ کا.....“ جانی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اپنے دل کے تین ٹکڑوں کو یہاں مشکل میں چھوڑ کر پاکستان جاؤں..... یہ کیسے سوچا تم نے؟“

”پاپا پلیز..... آپ یہاں اُن کے لیے کچھ نہیں کر سکتے..... لیکن میں آپ کو اس حالت میں قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا..... میں بھی تو آپ کے دل کا ٹکڑا ہوں..... کچھ میرے بارے میں بھی سوچیں؟“

”تمہارے بارے میں کیا سوچوں..... تم محفوظ ہو میرے پاس.....“

”محفوظ ہوں..... لیکن آپ کو اس حال میں دیکھنا کتنا مشکل ہے میرے لیے..... یہ سوچیں آپ کہ مجھے ماما کی طرف سے بھی سکون نہیں آپ کی طرف سے بھی چین نہیں میں تو دونوں کے بیچ میں پس رہا ہوں۔“

”تم اپنی ماما اور بہن بھائی کو یہاں چھوڑ کر آسانی سے جاسکتے ہو؟“

”آسانی سے کون کہہ رہا ہے..... دھبی دل لیے جاؤں گا اور وہاں مرمر کرچیوں گا لیکن ہمارا دکھ بانٹنے والا کوئی ہوگا، کوئی ہمارے درد کی دوا بنے گا۔“

”یہ بہت قیمتی درد ہے رومی..... یہ درد مجھے بہت عزیز ہے..... میں اسے کسی میں بانٹنا نہیں چاہتا.....“

”میں اسے اپنے دل کی چار دیواری میں قید رکھنا نہیں چاہتا ہوں کسی کو بتانا نہیں چاہتا.....“

”تو ٹھیک ہے..... ہم کسی کو نہیں بتائیں گے..... اور ہم ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہے..... کچھ دیر بعد چکر لگائیں گے اور یہاں میرے دوست ہمیں صورت حال سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ دادو بھی ہمیں باخبر رکھیں گی..... ہم دادو کو پاکستان والے گھر کا ایڈریس دے کر جائیں گے..... مجھے پوری امید ہے ماما اور ٹوٹی شیریں ہم سے آئیں گے۔ اور میں چاہتا ہوں جب وہ ہم سے ملیں تو آپ صحت مند ہوں..... میں اب اور نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔“

”کیری کو چھوڑ جاؤں.....“ وہ جیسے دیوانگی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے..... میں ادھورا انسان وہاں کیسے جاؤں گا؟“ رومی نے خوف زدہ ہو کر اُسے دیکھا۔

”کیا پاپا کی ذہنی حالت بگڑ رہی ہے؟“

”کیری..... تم لوگ کہاں گم ہو گئے ہو؟“ جانی کا رواں رواں یہ سوال کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ کھلا تو کیری نے سرسری نظر سے دروازہ کھولنے والے کو دیکھا۔

”پاپا نے شاید نیپٹر رکھا ہے.....“ ٹوٹی اور شیریں بھاگتے ہوئے اندر گئے۔

”گرینڈ پاپا..... گرینڈ پاپا آم آ گئے.....“ پیچھے دروازہ بند ہوا تو وسیع لاؤنج میں آئے، لیکن یہ کیا.....

وہاں دس پندرہ افراد چہرے پر نقاب چڑھائے بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ جن کا رخ ان تینوں کی طرف تھا..... ٹوٹی اور شیریں خوفزدہ ہو کر اس کے دائیں بائیں آئے اور دونوں بازو تھام لیے۔

”کون ہو تم لوگ؟“ کیری نے حواس قائم رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہم آپ تینوں کو وکٹر کے پاس لے جانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔“

”پاپا کہاں ہیں؟“

”آپ ہمارے ساتھ چلیں آپ کو پتہ چل جائے گا۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ سختی سے بولی۔

”میری پاپا سے بات کرواؤ۔“ بات کروانے کی بجائے اُن میں سے ایک آدمی گن کے ساتھ آگے

بڑھا۔

”اپنے موبائلز ہمارے حوالے کر دیں۔“ کہہ کر اس نے خود ہی موبائل لے لیے..... کیری نے

حیرت سے اُسے دیکھا۔ پھر چاروں طرف دیکھا..... کوئی بھی ملازم نظر نہیں آ رہا تھا اس کا مطلب ہے

کچھ بہت غلط ہو گیا ہے۔

”پاپا کہاں ہیں؟ تم لوگوں نے کیا کیا ہے اُن کے ساتھ؟“

”آپ کے پاپا محفوظ مقام پر ہیں اور آپ کے منتظر ہیں..... اور اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ نہیں

گئے تو ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”کس سے؟“ کیری خود کو بے شکل کمپوز کر کے بولی۔

”ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں۔“

”جانا کہاں ہے؟“

”ہمیں یہ بھی بتانے کی اجازت نہیں..... آپ اگر آسانی سے ہمارے ساتھ چلیں تو مہربانی

ہوگی..... ورنہ آپ کے بچوں کو اور آپ کو خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”کیسا خطرہ.....؟“

”آپ تینوں کی جان بھی جاسکتی ہے۔“

”خبردار.....“ کیری نے رعب سے کہا۔

”میرے بچوں کو ہاتھ مت لگانا.....“

”پھر آپ لوگ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلیں۔“

”ٹھیک ہے چلو..... لیکن پہلے میں اپنے ہزبینڈ کو فون کرنا چاہوں گی انہیں بتانا ضروری ہے کہ ہمیں

دیر ہو جائے گی۔“

”اس کی اجازت نہیں ہے میم.....“ بادل نحو استہ اسے ہتھیرا ڈالنے پڑے۔ ان تینوں کی آنکھوں پر

پٹیاں باندھی گئیں..... اور پھر دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایک بڑے سے محل کے اندر لے جا کر کھولی گئیں۔

تینوں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ ایک عالیشان ہال تھا اور سامنے ایک کرسی پر وکٹر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ اور

پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ دوسری کرسی پر ایک قوی ہیکل کرخت شکل والا آدمی بیٹھا تھا.....

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض

چھلپی

Steroids Free Most Progressive Treatment

کے ممتاز معالج اچمل ذیدی کے صاحبزادے کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام
اقدس ذیدی

قیام موٹل امین

جی ٹی روڈ نزد مشنگری چوک پشاور شہر

موبائل: 0300-8566188

یکم فروری تا 6 فروری

یکم جون تا 6 جون

یکم اکتوبر تا 6 اکتوبر

پشاور

قیام گلف سنٹر

آفس نمبر 16، ہریک چوکی میٹروپولس شاہ نمبر 10
فیروز پور روڈ نزد قوسم آرکیڈ، لاہور

موبائل: 0300-8566188

11 فروری تا 20 فروری

11 جون تا 20 جون

11 اکتوبر تا 20 اکتوبر

لاہور

قیام فارچون سنٹر

آفس نمبر 706، ساقی سنٹرل شاہراہ قیام نرسری
بالقاعہ KFC کراچی

فون: 021-7012068-69

موبائل: 0300-8566188

یکم مارچ تا 10 مارچ

یکم جولائی تا 10 جولائی

یکم نومبر تا 10 نومبر

کراچی

قیام موٹل سلور سینٹر

ریلوے روڈ نزد چوک عزیز موٹل ملتان

فون: 061-4518061-62

موبائل: 0300-8566188

12 مارچ تا 17 مارچ

12 جولائی تا 17 جولائی

12 نومبر تا 17 نومبر

ملتان

مستقل پتہ: مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر 8-1

سریا چوک (تھلی چوک) اسلام آباد

فون: 051-2331725

موبائل: 0300-8566188

25 مارچ تا 25 مئی

25 جولائی تا 25 ستمبر

25 نومبر تا 25 جنوری

اسلام آباد



PILLAR OF LEUCODERMA



BOLAN EXCELLENCE AWARD



EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF EXCELLENCE



”پاپا.....“ وہ تینوں دوڑ کر وکٹر کے پاس آئے۔

”سب کیا ہے پاپا.....؟“

”ویکٹر ٹوڈ اسٹنڈ میسل..... میم..... میرا نام ولیم ہے اور میں اس محل کا مالک ہوں..... میرے ہی حکم پر وکٹر کو اور پھر تم لوگوں کو یہاں لایا گیا ہے۔“

”میں وجہ جاننا چاہوں گی۔“ کیری متانت سے بولی۔

”وجہ بھی پتہ چل جائے گی۔ پہلے ہمیں اپنی مہمان نوازی کا شرف تو حاصل کرنے دو۔“

”مجھے تمہاری مہمان نوازی دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ولیم..... تم مطلب کی بات کرو۔“

”مطلب کی بات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا میم..... اور رہی کھانے کی بات تو انکار کا کوئی فائدہ

نہیں..... آپ کو بہت دیر یہاں رہنا ہے..... اور اتنی دیر کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا..... فی الحال آپ لوگوں کو

آپ کے کمروں میں بھیجا جا رہا ہے وہاں جا کر وکٹر سے جتنی باتیں کرنا چاہو کر لیں۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن یہ تم اچھا نہیں کر رہے..... میں پاپا کو بھی یہی کہتی تھی کہ یہ حرام کام چھوڑ

دیں..... انہوں نے نہیں سنا اور انجام دیکھ لیا..... تم بھی کسی دن دیکھ لو گے.....“ خوبصورت سبے سجائے

پورشن میں پہنچ کر اس نے بے چینی سے وکٹر سے پوچھا۔

”پاپا..... یہ کیا ہے سب.....؟ ولیم کون ہے اور آپ کو یہاں کیوں لایا گیا ہے، ہمیں یہاں کیوں لایا

گیا ہے..... آپ جانتے ہیں جانی اور رومی کتنے پریشان ہوں گے ہمارے لیے..... یہ کیا کر دیا آپ

نے؟“ وہ تقریباً رونے والی ہو رہی تھی۔ وکٹر مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”پاپا..... میں کچھ پوچھ رہی ہوں آپ سے..... یہاں کیوں لایا گیا ہے آپ کو اور ہمیں؟ اور یہ ولیم

کون ہے؟“

”مجھے معاف کر دینا کیری..... تم ٹھیک کہتی تھیں..... مجھے میرے برے کاموں نے یہ دن دکھایا

ہے..... ولیم بھی کرائم ورلڈ کا بہت پاورفل ڈان ہے..... اور مجھے کمزور اور اولڈ ہوتے دیکھ کر وہ میرا

کاروبار اور میری مینشن اور سب کچھ جو میں نے آج تک حاصل کیا..... اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے..... اس

نے میرے ملازموں میں اپنے لوگ شامل کر دیے تھے۔ جس کی وجہ سے مجھ پر قابو پانے میں کامیاب

ہو گیا..... وہ چاہتا ہے میں سب کچھ اُس کے حوالے کر دوں۔“

”تو کر دیں سب اس کے حوالے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”اور ہم..... ہم کیوں ہیں یہاں..... ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”میری جائیداد کے تم لوگ ہی تو وارث ہو..... اس لیے تمہیں بھی اغواء کیا گیا ہے۔“

”مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے اس جائیداد میں سے..... یہ سب حرام کی کمائی ہے اور میں اس میں سے

ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔“

”لیکن ولیم کو یہ پتہ نہیں ہے۔“

”تو آپ بتادیں اسے..... سب کچھ اس کے حوالے کریں میں بھی سب کچھ اس کے نام سائن کرنے

کو تیار ہوں پھر وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے کیری..... وہ کبھی یہ نہیں کرے گا..... میں بھی سائن کر دوں..... اور تم بھی سائن کر دو تو وہ ہمیں پھر بھی نہیں چھوڑے گا..... اس کے بعد وہ ہمیں قتل کر دے گا تاکہ سارے ثبوت مٹا دے..... کوئی کچھ کہنے والا باقی نہ رہے۔“ کیری نے اس کی بات پر حیرت سے پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”پھر کیا ہے اس مسئلے کا حل؟“

”ہمیں ساری جائیداد اس کے نام منتقل کرنے میں زیادہ سے زیادہ دیر کرنی ہوگی تاکہ ہمیں زیادہ وقت مل جائے اور اس وقت میں شاید ہمارے بچاؤ کا کوئی راستہ نکل آئے۔“

”اور جانی..... اس کا کیا ہوگا؟“ کیری ڈوبتے دل سے بولی۔

”رومی کا کیا ہوگا..... وہ دونوں تو ہمیں اتنے دن غائب پا کر جانے کیا سوچیں؟ رومی یقیناً پولیس کے پاس جائے گا..... پھر کیا ہوگا..... اوہ مائی گاڈ جانی کتنا پریشان ہوگا..... میری تو سوچ کر جان نکلنے لگتی ہے..... پاپا میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی جانی اور رومی کا سوچ کر میرا دل رونے لگتا ہے..... پہلے انہیں صرف میری جدائی بھیلنی پڑی تھی تو اُن کا کیا حال ہوا تھا اور اب ہم تینوں کو کھوکھو کر دے مر جائے گا پاپا..... آپ نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا ہے؟“ سارا صبر اور سارا ضبط ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ماما.....“ شیریں اس سے لپٹ گئی۔ ٹوٹی نے بھی اس کے گرد بازو حائل کیے اور اُسے تسلی دینے لگی۔

”نہ روئیں ماما..... آپ ہمیں ساری زندگی کیا سکھاتی رہی ہیں اپنے خدا پر بھروسہ کریں ہم سب رورو کر اس سے دعا کریں گے..... وہ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے یہی تو وقت ہے کہ ہم اس پر اپنا بھروسہ قائم رکھتے ہوئے اس کے فضل پر یقین کریں۔ پاپا اور بھائی کے لیے بھی دعا کریں خدا اُن کو صبر دے اور ہماری جدائی برداشت کرنے کی طاقت دے.....“ کیری نے دونوں کو لپٹا لیا۔

”تم دونوں ٹھیک کہتے ہو میری جان.....“ انہیں پر تکلف کھانا سر دیا گیا..... لیکن انہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

”اپنے ماسٹر کو بلاؤ۔“ کیری نے آرڈر دیا۔ لیکن اس کے بدلے میں اسے ولیم کے پاس پہنچایا گیا۔

”ہم یہ کھانا نہیں کھانا چاہتے..... یہ حرام کی کمائی سے بنا ہے اور ہم حرام نہیں کھاتے ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا۔“

”اور کون سا مذہب ہے تمہارا؟“ وہ طنزیہ بولا۔

”اسلام..... میں مسلمان ہوں اور میرے بچے بھی..... اسلام میں حرام کھانا منع ہے۔“

”اوہ تو تم مسلمان ہو چکی ہو..... تمہارے اولڈ مین کو پتہ ہے.....“

”پتہ ہے.....“

”واؤ..... کوئلہ بریڈی کی بیٹی اور مسلمان.....“ وہ بھرپور تہنکہ لگا کر بولا۔

”پھر کیا کرو گی..... کب تک بھوکا رہو گی؟“

”میرے پاس پیسے ہیں..... اُن سے میرے اور میرے بچوں کے لیے کچھ منگوا دو۔“ وہ یوں ہنس رہا

تھا جیسے بہت مزہ لے رہا ہو..... لیکن کیری نے مناسب کھانے کے لیے چند ڈالرز اُسے پکڑا دیے..... اس کی ہمت اور جرأت دیکھ کر کچھ دیر تو وہ مبہوت اُس کے پُر اعتماد پُر عزم چہرے کو دیکھتا رہا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں اُسے اس غیر متزلزل ایمان والی مضبوط اور باہمت عورت کے وجود سے کیا کیا بھونٹا دیکھنا تھا۔

☆.....☆.....☆

سرخیل آدھی رات کو گھر آیا تھا..... مجبوری تھی اپنی عزت نفس اور بابا کے سوالات کا خیال تھا۔ ورنہ شاید رات آفس میں ہی گزار دیتا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کوئی نہیں تھا۔ بیڈ بھی خالی تھا ایسے ہی بنا ہوا تھا جیسے کوئی اس پر سویا نہ ہو۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے نور آج کمرہ اُس کے لیے چھوڑ کر خود گیٹ روم میں سونے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اُسے ایک دم ہی غصہ آ گیا۔ اُس کی ہزار کوششوں کے باوجود اس لڑکی کے دماغ میں عقل نام کی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی..... وہ کپڑے بدلے بغیر تیز قدموں میں گیٹ روم کی طرف چل دیا دروازہ کھولا۔

نیلے بلب کی روشنی میں اُسے بیڈ فریم کے ساتھ سرٹکائے بیڈھ کر سوتے پایا..... گالوں پر آنسوؤں کے نشان اور چہرے پر بے چینی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا اُسے دیکھتا رہا..... اس گھمبیر صورت حال میں بھی وہ دل میں کھسی جا رہی تھی۔ لیکن اپنے سارے جذبات پر بے چھک کر اس نے بازو سے پکڑ کر اسے ہلایا۔ وہ جوابی ابھی آنکھ لگنے سے لڑھک کر ہیڈ بورڈ سے جا لگی تھی ہڑبڑا کر اٹھی اور نیند سے جھل گلابی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”ک..... کیا ہوا.....؟“ وہ بس اتنا ہی بول پائی۔

”یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ سرخیل کا لہجہ سخت تھا اور چہرہ سپاٹ.....

”سونے کے لیے آئی تھی.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

”وہ آپ کا کمرہ ہے آپ کا اس پر زیادہ حق ہے..... آپ کو وہاں سونا چاہیے..... اس لیے.....“
”حقوق و فرائض کے بارے میں بات کرتے ہوئے لگتا ہے آپ مذاق کر رہی ہیں۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔

”بہر حال میں یہاں کسی معاملے میں بحث کرنے نہیں آیا صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ کو میری عزت کا کچھ خیال ہے یا نہیں؟ آپ کو یہاں دیکھ کر ملازم کیا سوچیں گے..... بابا کیا سوچیں گے..... کیا آپ ہمارے جھٹڑے کی بات سارے خاندان میں پھیلانا چاہتی ہیں۔“ نور تھوڑی دیر چپ رہی..... پھر بولنا ہی پڑا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں..... میں آپ کے آرام کی خاطر.....“

”میرا آرام.....“ اس نے پھینکی سی ہنسی کے ساتھ اُس کی بات کاٹی۔

”میرے آرام کا خیال کب سے ہونے لگا آپ کو..... یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ آپ ابھی اٹھیں میرے آرام کی فکر مت کریں..... ہاں اپنے آرام کی بات کریں..... لیکن آپ وہاں آرام سے ہیں یا نہیں..... سونا آپ کو وہیں پڑے گا..... کم از کم اس وقت تک جب تک ہمارے درمیان کوئی فیصلہ نہیں

ہو جاتا..... اس لیے میں جا رہا ہوں آپ فوراً اٹھیں اور اپنے کمرے میں آ جائیں۔“ وہ سختی سے کہہ کر فوراً باہر نکل گیا۔ لیکن نور کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا دھیان تو اس جملے میں انکس گیا تھا۔

”جب تک ہمارے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔“

”کون سے فیصلے کی بات کر رہا تھا وہ..... آخر کیا کرنا چاہتا ہے وہ.....“ ان سب باتوں اور خدشات کی موجودگی میں اُس کے وجود کے ساتھ اس کے کمرے میں رہنا کتنا مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی۔ ان سب باتوں کے درمیان ایک آسرا تھا ایک ڈھارس تھی۔ اس کمرے میں رہتے ہوئے سرخیل کے وجود کی کشش اور اس کے وجود سے اٹھتی توانائی کی لہریں جو سیدھی اس کے دل پر بارش کی طرح برس کر اس کی تمناؤں کو سیراب کرتی تھیں وہ اس کے لیے اس مشکل وقت میں نعت کا درجہ رکھتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ولیم اتنی جلدی اٹھنے کا عادی کب تھا..... لیکن آنکھ کھل گئی تو سوچنے لگا سوچ ہی رہا تھا کانوں میں کچھ فاصلے سے ایک آواز نکل رہی تھی۔ اس نے وکڑ کیری اور بچوں کو قریبی کمروں میں ہی ٹھہرایا تھا۔ تاکہ کسی قسم کی گڑبڑ کا خدشہ نہ رہے۔ ویسے تو گارڈز کا ہر وقت پہرہ ہوتا تھا۔ لیکن جب سے اس نے وکڑ کے گارڈز میں اپنے گارڈز شامل کروا کر اپنا مطلب حاصل کیا تھا۔ اُسے اُن پر اندھا اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ خود بھی الرٹ رہ کر صورت حال کا جائزہ لیتے رہنے کا قائل تھا۔

سوچتے سوچتے اس کا دھیان پھر سے آواز کی طرف مڑ گیا۔ وہ غصے میں اٹھ کر گارڈز کو گالیاں دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آواز میں جانے کیا تھا کہ سماعت سے نکلنے والی اس آواز نے جسم کو بے جان کر دیا۔ کچھ ایسا جادو تھا اس آواز میں کہ جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

اس وقت کیری قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آواز اور لہجہ دونوں ہی بہت خوبصورت تھے اور پھر دل سے نکلتی یہ آواز ہوا کے دوش پر لہرائی ولیم کے کانوں تک پہنچی تو ولیم بے بس سا ہو گیا۔ اسے ایک لفظ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کی مٹھاس اور ان جانے الفاظ نے دل پر رعب سا طاری کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑا سنتا رہا کہ اچانک آواز بند ہو گئی وہ جیسے طلسم سے نکل آیا۔ یہ تو وہ جان گیا تھا کہ آواز کیری کی تھی۔ طلسم سے نکلتے ہی وہ غیض و غضب سے اٹھا۔ ولیم کو اس طرح کسی بھی بات سے مرعوب ہونا پسند نہیں تھا۔ وہ تو خود سب کو مرعوب کرنے کا عادی تھا۔ سیدھا زور سے بھاری قدم رکھتا کیری کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کبھی وہ باہر نکلی۔ پورے سر کو حجاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اور ابھی ابھی تلاوت کی وجہ سے اس کے چہرے پر پاکیزگی اور آنکھوں میں روشنی سی پھیلی تھی۔ ولیم اُسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیا بات ہے ولیم..... تم اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے؟“ وہ متانت سے بولی۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم کیا پڑھ رہی تھی؟“

”میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔“

”وہ مسلمانوں کی کتاب؟“

”ہاں..... اُسے قرآن کہتے ہیں ولیم.....“ کیری سنجیدگی سے بولی۔
 ”وہ تمہارے پاس کہاں سے آئی۔“

”میرے پرس میں موجود رہتی ہے ہر وقت..... اور خدا کا شکر ہے ورنہ تمہاری قید میں یہ نعمت مجھے کہاں سے ملتی..... میں قرآن پاک کی برکتوں سے محروم ہی رہ جاتی۔“
 ”اور اگر میں تم سے چھین لوں پڑھنے نہ دوں تو.....“ ولیم کے لہجے میں سفاکی اتر آئی۔
 ”تو میں ان حصوں کی تلاوت کر لیا کروں گی جو مجھے زبانی یاد ہیں..... ویسے تو مجھے اپنے خدا پر اتنا یقین ہے کہ تم ایسی جرأت نہیں کرو گے۔“

”تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ ولیم کے بارے میں ایسی بات کرو۔“ وہ جلال میں آ گیا۔
 ”خدا نے دی ہے..... خدا پر تو یقین رکھتے ہونا..... کہ خدا کو بھی نہیں مانتے۔“
 ”یہ سب کمزور لوگوں کی بناٹی ہوئی باتیں ہیں..... لوگ ہمارے اشاروں پر چلتے ہیں ہم خود ہی اپنے خدا ہیں۔“

”ایسے بڑے بول نہ بولو ولیم.....“ وہ بے انتہا نرمی سے بولی۔
 ”خدا کی پکڑ بہت مضبوط ہوتی ہے..... اس کے قہر کو دعوت نہ دو۔“ کیری کے لہجے میں ولیم کی سفاکی کے باوجود ایسی نرمی اور محبت تھی کہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ ابھی دم بخود کھڑا تھا کہ دوبارہ سے تلاوت کی آواز آئی۔ یہ شیریں تھی ولیم نے غم صم ہو کر کیری کی طرف دیکھا۔
 ”یہ کون ہے؟“

”یہ شیریں ہے..... شیریں کے بعد ٹوٹی یہی قرآن پڑھے گا..... اور مجھے یقین ہے ولیم اس کی آوازیں تمہارے گھر اور تمہارے دل کو نرمی عطا کریں گی..... اور تمہیں بھی بدل کر رکھ دیں گی۔“
 ”شٹ اپ یوفول..... ولیم فولاد ہے..... وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا..... نو نیور.....“ وہ پاؤں پٹختا پلٹ گیا..... اور کیری کے لبوں پر نرم سی خوبصورت مسکراہٹ آ گئی۔ ولیم کا کیری جیسی خاتون سے کہاں واسطہ پڑا تھا۔ وہ تو حکم دینے اور اس پر فوری عمل کروانے کا عادی تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ کیری کی شخصیت میں ایسی کیا بات ہے جو اُسے کچھ کر گزرنے سے روک رہی ہے..... کچھ تو تھا اس میں جو اُسے بے بس کر رہا تھا۔
 اور یہی بات اُسے غصے سے پاگل کر رہی تھی۔ انہیں سزا دینے کی خاطر وکٹر کے ساتھ ساتھ کیری اور بچوں کو ناشتے سے محروم کر دیا گیا۔ بھوک بڑے سے بڑے طرم خان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جس مذہب کا بانی پیٹ پر دو دو بھاری پتھر باندھ کر بھوک کے جن کو قابو میں کرنا جانتا ہے۔ اس کے ماننے والوں میں سے کوئی تو ہوگا جو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو چاروں نے صبر کا مظاہرہ کیا..... وکٹر کی نظریں جھک گئیں۔
 ”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کیری..... میری وجہ سے تم اور تمہارے بچے اس بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔“

”میرے بچے کیا آپ کے کچھ نہیں لگتے پاپا.....“ کیری نرمی اور دکھ سے مسکرائی۔
 ”انسان پر جو بھی مشکل آتی ہے خدا کی طرف سے آتی ہے اور اس میں بھی اُس کی کوئی حکمت ہوتی ہے۔“

ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ کو بہت سی باتوں کی سمجھ آ گئی ہے۔ اسی طرح کسی دن ولیم بھی سمجھ جائے گا۔ بس مجھے تھوڑا وقت دیں..... میں سب سنبھال لوں گی..... شاید ہمارے اور آپ کے یہاں قید ہونے میں خدا کا کوئی بڑا مقصد پورا ہونے والا ہے آپ آرام کریں..... میں جا رہی ہوں..... ٹوٹی اور شیری کا خیال رکھیں..... میں آپ کے لیے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“

وہ وہاں سے سیدھی ولیم کے پاس پہنچ گئی۔ گارڈز اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ولیم نے اُسے دیکھا تو رعونت سے مسکرایا۔

”ایک وقت بھوکا رہنے سے ہی ہتھیار ڈال دیے..... معافی مانگنے آئی ہو یا رحم کی بھیک؟“

”رحیم تو صرف خدا ہے۔“ کیری نے متانے سے بولی۔

”رحم کی درخواست میں صرف اسی سے کرتی ہوں اور جب میں نے کوئی جرم نہیں کیا تو معافی کیسے؟“

وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”پھر یہاں آنے کی جرات کیوں کی؟“ ولیم کرخت لہجے میں بولا۔

”میں تم سے ایک ذیل کرنے آئی ہوں۔“

”کیسی ذیل؟“ اس کے چہرے پر تمسخر تھا۔

”دیکھو صبح تم نے خدا بننے کی اور ہمیں ناشتے سے محروم رکھا..... حالانکہ تم خود کو بہت طاقتور اور بااختیار آدمی سمجھتے ہو..... لیکن تم نے اپنی فطرت کے عین مطابق عمل کیا..... اس سے میرے دل میں ڈر نہیں پیدا ہوا..... بلکہ تم میری نظروں میں اور چھوٹے ہو گئے ہو.....“ ولیم نے غصے میں کچھ بولنے کی کوشش کی تو کیری نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا..... کیری کے اس عمل میں جانے کیا تھا کہ وہ چپ رہ گیا..... حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

”پہلے میری پوری بات سن لو ولیم۔“ کیری دھیمی آواز میں بولی۔

”بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو بااختیار ہوتے ہوئے بھی کسی سے برا نہ کرے..... اس میں تو کوئی بڑائی نہیں تھی جو تم نے ہمارے ساتھ کیا..... کوئی بھی طاقتور شخص اپنی طاقت کا ہی مظاہرہ کرتا ہے..... مجھے تم سے ایسی ہی توقع تھی۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو پھر اتنے بڑے ظالم ڈان اور مافیا کے سربراہ کیسے ہوتے..... لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بیٹی بھی ہوں اور ایک ماں بھی تمہاری نظر میں شاید میں کمزور ہوں لیکن ایک بیٹی اور ماں کی طاقت کا شاید تمہیں اندازہ ہی نہیں۔“

”اچھا تمہاری طاقت کیا کرے گی؟“

”وہ تم شاید بعد میں کبھی دیکھو..... لیکن اس وقت میرا مسئلہ اپنے بچوں اور باپ کو کھانا مہیا کرنا ہے..... میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں..... اس لیے تم مجھے کوئی ایسا کام دے دو جس کے بدلے میں مجھے اتنے پیسے مل جائیں کہ میں اُن سے کھانا خرید سکوں۔“

”بہت خوددار ہو تم..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ولیم کی قید میں ہوتی ہمت ہے تم میں؟“ ولیم محظوظ ہو کر بولا۔

(جاری ہے)

جنت

~~~~~

### منزہ سہام

~~~~~

”ہنستی کھیلتی بچی ایکدم خاموش ہو گئی ہے بہو معلوم تو کرو ایسا کیا ہوا؟“ زمانی بیگم نے بہو کو کڑے تیور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اماں امتحان ہونے والے ہیں اسی لیے کھیل کود نہیں کر رہی آپ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہیں۔“ نمرہ نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔

”ایسے کون سے امتحان ہو رہے ہیں یہ موا کرنا تو پر پھیلائے بیٹھا ہے نہ اسکول ہیں نہ پڑھائی گھر سے آن لائن امتحان ہو رہے ہیں یہ بھی کوئی امتحان ہیں۔“ اماں نے بمشکل آن لائن کہا تو نمرہ سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپانے لگی۔

نمرہ زمانی بیگم کی بہو سے پہلے بھتیجی تھی۔ اس کی پیدائش پر ہی یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ زمانی بیگم کے چہیتے بیٹے راشد کی بیوی بنے گی۔ خاندان کی بات تھی لہذا بنا کسی مشکل نمرہ اور راشد کی شادی ہو گئی۔ شادی کے پہلے سال جب گلابی سی گڑیا ان کے گھر رحمت بن کر آئی تو سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور یوں

منہی پری کا نام ثروت جہاں رکھا گیا۔ دادی کا ماننا تھا ثروت بالکل اپنی بڑی بھوپتی فرحت جہاں کی شکل ہے جبکہ نمرہ کو اپنی گڑیا اپنے چھوٹے بھائی محسن سے ملتی ہوئی لگتی تھی۔

راشد نے اپنی رائے اس معاملے میں محفوظ رکھی ہوئی تھی وہ ماں اور بیوی دونوں کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ منہی ثروت خیر سے 8 سال کی ہو چکی تھی اور اس قدر شیطان تھی کہ راشد اور نمرہ چاہتے ہوئے بھی دوسرا بے بی پلان نہ کر سکے۔ ثروت نے نچلا بیٹھنا تو سیکھا ہی نہیں تھا پھر تھی بھی حد سے زیادہ پیاری گلابی چہرہ گول موٹے موٹے بازو نمرہ پہناتی بھی اس کو بغیر آستنیوں کی فراکیں تھیں جو دیکھتا ثروت کا دیوانہ ہو جاتا۔

اب کچھ دنوں سے ثروت سہمی سہمی تھی مگر نمرہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ دادی نے کئی بار نمرہ کی توجہ اس کے بازوؤں اور گردن پر لگی چوٹوں کی جانب مبذول کرائی مگر نمرہ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ اماں آپ دیکھیں نہ یہ کتنی شیطان ہے۔“ زمانی بیگم نے کئی بار سوچا

پاس خاموش کھڑی تھی۔ زبانی بیگم کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

”بہو ثروت کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔“ انہوں نے پوتی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
نمرہ نے حیرت سے ساس کو دیکھا۔
”اماں آپ کیسے سنبھالیں گی اس آفت کی پرکالہ کو.....“

”سنبھال لوں گی فکر مت کرو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ثروت کو آواز دی۔

”آج ہم دادی پوتی خوب باتیں کریں گے۔“ نمرہ نے بھی محسوس کیا کہ ثروت کے چہرے پر خوشی کا واضح احساس تھا وہ بھی شاید نہیں جانا چاہتی تھی۔ زمانی بیگم ثروت کو اپنے ساتھ اندر لے آئیں۔

”میری پیاری بیٹی کیا تم اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے دادی کے سر میں ڈابر آملہ ہیئر آئل کی چھپی کرو گی؟“ انہوں نے ثروت کے پھولے گالوں پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

”جی دادو بٹ اگر تیل آپ کے کپڑوں پر گر گیا؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”تو کیا ہوا یہ ڈابر آملہ ہیئر آئل ہے اس کا نشان تھوڑی پڑتا ہے۔ لیکن ہم پھر بھی کاندھوں پر تولیہ ڈال لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے دادو.....“ ثروت ایک دم خوش ہو گئی۔ زمانی بیگم کی نظریں ایک بار پھر اس کے ننھے ننھے بازوؤں پر بنے لال اور نیلے نشانوں میں الجھ گئیں۔ ثروت نے ڈابر آملہ

کہ راشد سے بات کریں مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گئیں۔

”اماں میں گرو سری لینے جا رہی ہوں آپ کو کچھ چاہیے؟“ نمرہ نے شولڈر بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا ویسے تو کچھ نہیں چاہیے مگر احتیاطاً ڈابر آملہ ہیئر آئل کی دو بڑی والی بوتلیں لے لینا۔“ اماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے اماں میں لیتی آؤں گی، لیکن اماں آپ یہ تیل بہت لگاتی ہیں۔“ نمرہ نے اماں کی سائیڈ نیبل پر ڈابر آملہ ہیئر آئل کی نئی کنور بوتل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی ہم پرانے زمانے کے لوگ ہیں روزنہا کربالوں میں ہلکا ہلکا ڈابر آملہ ہیئر آئل لگاتے ہیں تم لوگوں کی طرح تھوڑی کے مہینے میں ایک بار لگایا اور دس منٹ کے بعد جا کر سر دھولیا۔“ اماں نے پیار سے ڈابر آملہ ہیئر آئل کی بوتل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا سنو کیا ثروت کو بھی لے جا رہی ہو ساتھ؟“

”جی اماں لے جا تو رہی ہوں مگر امی کی طرف چھوڑ دوں گی کرونا کی وجہ سے بازار نہیں لے جاؤں گی وہاں محسن کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہے گی واپسی پر لے آؤں گی۔“ نمرہ نے تسلی سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ۔“ زمانی بیگم بہو کے ساتھ دروازے تک آئیں تو دیکھا ثروت پورچ میں گاڑی کے

ہیر آئل کی بوتل سے تھوڑا سا تیل دادو کے سر پر ڈالا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے پتل لگانے لگی۔

”ثروت اگر تم اس طرح تیل لگاؤ گی تو یہ چپی ہوگی اور مجھے بہت آرام ملے گا۔“ زمانی بیگم نے ہاتھوں کے اشارے سے اس کو بتایا۔

”دادو اس کی Smell کتنی اچھی ہے۔“ وہ اب بڑی مہارت سے دادی کے سر پر چپی کر رہی تھی۔

”اچھا میری گڑیا یہ بتاؤ کہ امتحان کب سے ہیں؟“

”دادو نیکسٹ ویک سے.....“

”تیار ی پوری ہے.....“ زمانی بیگم نے پوتی سے پوچھا۔

”جی دادو.....“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”میری بیٹی کو برا تو نہیں لگا دادو نے نانی کے گھر جانے سے روک لیا..... اچھا چلو بابا سے کہوں گی کہ امتحانوں کے بعد تمہیں وہاں چھوڑ آئیں۔“

اور زمانی بیگم نے ثروت کے ہاتھوں کی لغزش کو بخوبی محسوس کیا۔

”ثروت دادو کو بھی نہیں بتاؤ گی کیا بات ہے؟“ انہوں نے ننھی ثروت کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔

”کیا دادو کیا بتاؤں؟“

”تمہارے یہ چوٹیں کسے لگیں؟“ زمانی بیگم نے خوف کے سائے واضح طور پر اپنی ننھی

شہزادی کی آنکھوں میں دیکھے۔ انہوں نے ثروت کو اپنے سے لپٹا کر بٹھالیا۔

”دادو تمہارے ساتھ ہیں اور وہ سب جانتی ہیں مگر بیٹی تم مجھے خود بتاؤ۔“ زمانی بیگم ثروت کے جسم میں واضح کپکپاہٹ محسوس کر رہی تھیں۔

جہاں دیدہ خاتون تھیں بہت کچھ سمجھ چکی تھیں مگر چاہتی تھیں کہ ثروت جس خوف کے زیر اثر ہے اس سے نکل جائے اور وہ تبھی ممکن تھا جب وہ بولتی۔

اب دادی نے پوتی کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”بول میری بچی بول.....“ اور تب ثروت دادو سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی وہ روتی جا رہی تھی اور دادو کو سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ زمانی بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔

”بس بچی بہت دکھ اٹھالیے اب تیری دادو سب ٹھیک کر دے گی۔“ ثروت اب بھی دادی سے لپٹی سسکیاں لے رہی تھی۔

”اجا میری بچی تیرے سر میں اچھی سی چپی کروں ڈا بر آملہ ہیر آئل کی اور پھر تم یہیں میرے کمرے میں سو جانا.....“

”دادو میں ہمیشہ اب آپ کے ساتھ ہی سوؤں گی۔“ ثروت نے دادو کو ڈا بر آملہ ہیر آئل کی بوتل تھماتے ہوئے کہا۔

”اور ہمیشہ آپ سے ہی تیل لگوؤں“

گیا۔“
 ”کیوں نہیں میری بچی.....“ زمانی بیگم نے ثروت کے سر پر خوب اچھی سی ڈاڑھ آملہ ہیز آئل کی چھٹی کی دادی پوتی نے شاید پہلی بار اتنی ساری باتیں کیں۔ پھر ثروت وہیں دادو کے بستر پر سو گئی۔ نمرہ واپس آئی تو بہت حیران تھی۔

”بڑی دوستی ہو گئی ہے آپ دونوں میں.....“ اس نے ڈاڑھ آملہ ہیز آئل کی دونوں بوتلیں ساس کی الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”شش شش.....“ انہوں نے بہو کو ٹوکا۔
 مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھیں کہ راشد بھی آفس سے آ گیا۔

”سلام اماں.....“ آپ اس وقت یہاں باہر خیریت ہے؟“ اس نے لان میں بیٹھی ماں سے سوال کیا۔

”کیوں میں لان میں نہیں بیٹھ سکتی؟“ انہوں نے بیٹے سے سخت لہجے میں پوچھا۔
 ”ارے نہیں اماں موسم بدل رہا ہے نا اور آپ ویسے بھی مغرب کے بعد باہر نہیں نکلتیں اس لیے کہا۔“ اتنے میں نمرہ چائے لے آئی۔
 ”راشد آپ فریش ہو جائیں میں ثروت کو بھی اٹھاتی ہوں۔“
 ”کیا مطلب ثروت اس وقت سو رہی ہے۔“ راشد نے حیرت سے بیوی سے پوچھا۔
 ”سونے دوا سے پتہ نہیں کب سے جاگ رہی تھی۔“ زمانی بیگم کے جواب پر دونوں

میاں بیوی نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا اور جب اماں نے دھیرے دھیرے ساری بات راشد اور نمرہ کو بتائی تو دونوں منہ کھولے ماں کو تکتے رہے۔

پھر راشد نے غضبناک ہو کر اپنے سر کو فون کیا اور خانساں کو فوری طور پر پولیس کے حوالے کرنے کی تاکید کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھا پھر رک کر ہچکیوں سے روتی بیوی کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”نمرہ اس غیر ذمہ داری پر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”دیکھو نمرہ اور راشد قصور وار تم دونوں ہی ہو بچے دونوں والدین کی ذمہ داری ہیں اور بیٹی نمرہ یہ جو پرانی ماؤں کا طریقہ تھا نہ کہ چھٹی والے دن بچوں کے سر کی چھٹی کرتی تھیں اس سے دو فائدے حاصل ہوتے تھے ایک تو ڈاڑھ آملہ ہیز آئل کی بدولت بال چمکیلے اور گھنے رہتے دوسرے بچے ماں سے ہر چھوٹی بڑی بات شیر کرتے تھے اور یوں سب محفوظ رہتے..... آج کل کے اس افراتفری کے دور میں ڈاڑھ آملہ ہیز آئل کو غنیمت جانو اور پابندی سے استعمال کیا کرو دیکھو تمہاری آنکھیں بھی تو ڈاڑھ آملہ ہیز آئل کی وجہ سے کھلیں اور نمرہ نے نمناک آنکھوں سے ساس کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”ڈاڑھ آملہ ہیز آملہ آئل شکریہ.....!“



سہارا

~~~~~

وہ صحیح تھی مرد عورت کا سہارا ہے تو پھر بھائی یہ سہارا کیوں نہیں  
بننے ضروری ہے کہ عورت کو بار بار عذاب سے گزارا جائے.....

~~~~~

نہ وہ پاس ہی تخت پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

ارے بیٹا اس کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس
لیے نہیں آئی میں نے تو خود پچھلے ایک ماہ سے اس کی
شکل نہیں دیکھی میں بھی زیادہ کچھ نہیں بولتی بیاہی بیٹی
ہے ڈر لگتا ہے ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے عمر بھر کا داغ
لگ جاتا ہے پان لگانی خالہ بولتی چلی جا رہی
تھیں کچھ لوگ اگر بولنے سے پہلے ذرا سا سوچ لے
تو کتنا اچھا ہو ملاحت ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

بہت ہی ظالم ہے اس کی ساس ایسا ناک میں دم
کیا ہوا ہے میری سدرہ کا امجد بھی کہاں سنتا ہے بس
جو ماں نے کہا مان لیا بہت برداشت والی ہے میری
بچی جو چپ چاپ سہہ لیتی ہے ورنہ اتنی برداشت
کہاں ہوتی ہے لڑکیوں میں خالہ کن اکھیوں سے
ملاحت کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ملاحت کا دل چاہا وہ
بولے کہ کتنا آپ کی بیٹی پر ظلم ہو رہا ہے نظر آ رہا ہے
تب ہی تو آئے دن سدرہ اپنے شوہر امجد کے ساتھ
کہیں نہ کہیں گھومتی نظر آتی ہے خود ملاحت نے کہیں
بار اسے اسکول سے آتے ہوئے دیکھا تھا مگر بہت

بیاہی بیٹی اجڑ کر ماں باپ کے گھر آ کر بیٹھ
جائے تو اس کا درد لفظوں میں بتایا نہیں جاتا راشدہ
صحن میں تخت پر بیٹھی اپنی بہن ندرت سے آرزوگی
سے بولیں نزدیک ہی باورچی خانے میں آنا گوندھتی
ملاحت کے ہاتھ ایک لمحے کو کانپے۔ اماں تم کبھی
میری عزت نہ رکھنا ہر آئے گئے کے سامنے یہی رونا
رو کر مجھے مزید میری نظروں میں کمتر کر دیتی ہو اور
جب یہی لوگ ہمدرد بھری نظروں سے دیکھتے ہیں تو
اس ہمدردی کے پیچھے چھپا مسخردیکھ کر مجھے تم پر
افسوس ہوتا ہے کہ کیوں اپنی بیٹی کو ہر کسی کے سامنے
ارزاں کر دیتی ہو آنکھوں میں آئی نمی کو اندر دھکیلتی
ہوئی سنک میں لگے ٹل سے ہاتھ دھوتی ہوئی سوچنے
لگی اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی
باہر آ گئی جہاں صحن میں ہی ندرت خالہ بیٹھی
تھیں۔ سلام خالہ وہ مسکراتی ہوئی ان کے پاس
آ گئی۔

ارے کیسی ہو میری چندا ندرت خالہ اس کو پیار
کرتی ہوئی بولیں۔ ٹھیک ہوں خالہ سدرہ کو لے آئی

ماں سے بولی۔

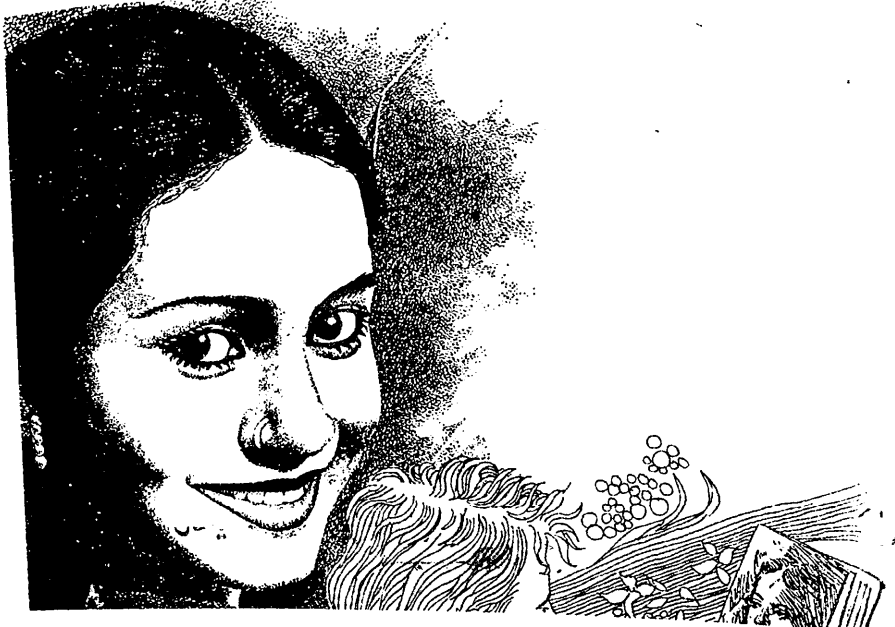
برداشت کرنا پڑتا ہے تب جا کر گھر بنتا ہے
چھالیہ سروتے سے کترتی راشدہ بولیں وہ ماں کی
بات پر افسوس سے ان کو دیکھ کر رہ گئی اور خاموشی سے
اٹھ کر وہاں سے چل دی۔ بجھتی نہیں نگلی بھلے کے
لیے بولتی ہوں کہ بھائی بھائی کا رویہ دیکھ رہی ہے
پھر بھی نہیں سمجھ رہی راشدہ فکر مندی سے بیٹی کے
بارے میں سوچ کے رہ گئی۔ دوپہر جب سب کھانے
کے بعد آرام کر رہے تھے وہ خاموشی سے چھت پر
چلی آئی۔ آج اس کا دل بے حد اداس تھا بار بار
آنکھیں نم ہو رہی تھیں اما کے الفاظ اس کے کانوں
میں گونج رہے تھے برداشت کرنا پڑتا ہے تب کہیں
جا کر گھر بنتا ہے۔

خدا کے واسطے راجیل میری برداشت کا امتحان
مت لیں کپڑے پر لیں کرتی ملاحظہ جو راجیل کی
باتیں سن رہی تھی اس کی باتوں سے عاجز آ کر بولی
اس کا سر پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا رات بھر جاگ کر
بچوں کے امتحانی پرچے چیک کرتی رہی فجر کی اذان

سے لوگوں کو عادت ہوتی ہے جب تک دوسرے پر
اپنے طنز کے تیر نہ چلا لے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا
وہی حال ندرت خالہ کا تھا۔

اچھا چلو میں چلتی ہوں ندرت کھڑی ہوتے
ہوئے بولیں۔ کوئی مناسب رشتہ ہو تو بتانا راشدہ
ندرت کا ہاتھ تھام کے سرگوشی میں بولیں جس پر پاس
کھڑی ملاحظہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ ضروری
ہے ہر آئے گئے کے سامنے اس تماشے کی ندرت
خالہ کے دروازے سے نکلتے ہی ملاحظہ خفگی سے
ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

کون سے تماشے کی بات کردی میں نے کیا
شادی نہیں کروگی ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی رہوگی
باپ تمہارا ہے نہیں آج میں ہوں کل نہیں میرے
آنکھ بند کرتے ہی دنیا نے بھی تم سے آنکھیں بند
کر لینی ہیں راشدہ کا اشارہ اپنے بیٹے بہو کی جانب
تھا۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے ہی ان کی آنکھیں
بند ہو چکی ہیں ملاحظہ جل کر بولی اور پہلی شادی سے
کونسا سکھ نصیب ہوا ہے جو دوسری شادی سے ہو گا وہ



نمبر تھا سب ہی شادی شدہ تھے ملاحظہ نے گریجویشن کیا ہوا تھا اور مقامی اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھی۔

راجیل بہت کم عمر تھا جب اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا تھا اس کو اس کی خالہ نے ہی پالا تھا مگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد جیسے ہی اس کی اچھی جگہ نوکری لگی تو وہ اپنے اس گھر میں شفٹ ہو گیا جو اس کے ماں باپ کا تھا۔ خالہ مجھے آپ غلط مت سمجھنا مگر میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری بہنوں کو لے کر غلط بات کریں اس کا اشارہ اپنی خالہ زاد نندا اور سونیا کی طرف تھا جبکہ خالہ اس کی بات پر دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں ان کی دونوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کی شادی راجیل سے ہو جائے ان کو اس کا واپس جانا برا نہیں لگ رہا تھا جتنا اس بات پر افسوس تھا کہ وہ ان دونوں کو اپنی بہن مانتا ہے۔

کیا فائدہ ہوا پال پوسنے کا جب کچھ ہاتھ ہی نہیں آیا خالہ ملال سے سوچ کر رہ گئیں اور پھر ایک تقریب میں راجیل ملاحظہ کی من موئی صورت پر فریفتہ ہو گیا اس نے ان کی توجہ ملاحظہ کی طرف دلائی تھی جس پر مجھے دل کے ساتھ خالہ نے ملاحظہ کا رشتہ دے دیا جسے کچھ دن بعد ملاحظہ کے گھر والوں نے منظور کر لیا تھا۔ اتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے کہاں جانے دیتے ہیں لوگ پھر سر پر ساس سسر بھی نہیں ظاہر ہے عیش کرے گی خالہ کلس کر رہ گئی تھیں اور شادی کے کچھ دن بعد ہی ملاحظہ نے خالہ کے انداز سے بھانپ لیا تھا کہ ان کو ملاحظہ کچھ خاص پسند نہیں کیونکہ روز خالہ اور ان کی دونوں بیٹیاں چلی آتیں اور پھر اٹھتے بیٹھتے اس پر طنز کے تیر چلائے جاتے ایک دو بار دبے لفظوں میں اس نے راجیل سے بولنے کی کوشش بھی کی جس پر اس نے ڈانٹ کر چپ کر دیا تھا، آئندہ میری ماں بہن کے بارے میں بولنے سے پہلے سوچ لینا میں اگر تم کو اس پر

ہو رہی تھی جب فارغ ہوئی تو گھر سمیٹ کر راجیل کا ناشتہ بنا کر اسے آفس کے لیے اٹھا دیا۔ راجیل جلدی سے ناشتہ کر لیں مجھے اسکول بھی جانا ہے وہ جلدی جلدی ہاتھ چلاتی ہوئی بولی۔ تم سے میں نے رات بولا تھا میری بلیک شرٹ استری کر دینا تم نے یہ نیلی کس خوشی میں کر دی وہ غسل خانے سے نکلا تو اسٹینڈ پر رکھی نیلی شرٹ دیکھ کر اسے جھارتے ہوئے بولا۔

اوہ میں واقعی میں بھول گئی تھی یقین کریں رات کی تھکن اس قدر تھی وہ بولی۔ میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا تم رات بھر کیا کر رہی تھی یا تم کتنا تھک چکی ہو وہ اسے گھورتے ہوئے بولا جس پر وہ خاموشی سے بلیک شرٹ نکال کر استری کرنے لگی معمول کی طرح آج صبح کی شروعات بھی اس کی لڑائیوں سے ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے استری ہوئی شرٹ وہ چھین کر لیتے ہوئے پہننے لگا پھر ناشتہ کر کے خاموشی سے بائیک ٹی چابی اٹھا کر آفس کے لیے نکل گیا ملاحظہ ٹھنڈی سانس بھر کر ناشتے کی میز کے قریب آگئی اور کرسی پر بیٹھ کر ایک سلاکس میں مکھن لگا کر چائے کے ساتھ کھانے لگی اس کی نگاہ کھڑی بر پڑی تو جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھر کھڑی ہوئی اور ہاتھ دھو کر ہلکی سی لپ اسٹک لبوں پر لگا کر دو پیٹھ سر پر اوڑھ کر وہ گھر کا دروازہ بند کر کے اسکول کے لیے نکل گئی۔ اسکول میں بھی سارا وقت اس کا دل عجیب بو جھل سارہا۔ پتا نہیں مجھے عادت کیوں نہیں ہو جاتی راجیل کے اس رویے کی روز نئے سرے سے کڑھتی ہوں واپسی میں گھر آتے ہوئے وہ افسردگی سے سوچنے لگی۔

ملاحظہ اور راجیل کی شادی آج سے ڈھائی سال پہلے ہوئی تھی۔ راجیل کی خالہ نے ملاحظہ کو ایک تقریب میں دیکھا تھا ان کو اپنے بھانجے کے لیے ملاحظہ بہت اچھی لگی تھی ملاحظہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی دو بڑی بہنیں اور دو بھائیوں کے بعد اس کا

گھر میں لاسکتا ہوں تو باہر بھی کرسکتا ہوں وہ دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا تذلیل کے احساس سے وہ چپ سی ہوگئی اور پھر جب خالہ اور ان کی بیٹیوں نے دیکھا کہ کچھ بھی بولا اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تو انہوں نے راحیل کے گھر آنا آہستہ آہستہ کم کر دیا جس پر ملاحظہ نے سکون کا سانس لیا مگر راحیل کی طرف سے یہ پہلی پھانس تھی جو اس کے دل میں چھپی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ راحیل کے مزاج میں کئی آتی جا رہی تھی جس پر ملاحظہ کو بہت حیرت ہوتی تھی بعض اوقات تو وہ اپنی غلطی ڈھونڈتی رہ جاتی مگر اسے اپنا تصور سمجھ نہیں آتا تھا۔ راحیل ایک بات پوچھوں آپ سے رات کھانے سے فراغت کے بعد وہ باورچی خانہ سمیٹ کر اس کے پاس آ بیٹھی جوئی وی دیکھ رہا تھا۔ ہاں پوچھو وہ بے توجہی سے بولا آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔ ایسے سے کیا مطلب وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ مطلب شادی کے اوائل دنوں سے ہی بیزار ہے وہ گھبراتے ہوئے بولی۔ اچھا تو تم کو میرا رویہ بیزار نظر آیا وہ طنز سے بولا جس پر ملاحظہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا جب آپ کو میں پسند نہیں تھی تو آپ نے شادی کیوں کی وہ افسردگی سے بولی۔ ہاں بہت بڑی غلطی ہوئی راحیل کی بات پر وہ حق دق اس کی شکل دیکھنے لگی وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا وہ جاتی آنکھوں سے اسے جاتا دیکھنے لگی۔ اگلے دن وہ خاموشی سے اپنے کام کرتی رہی وہ منتظر تھی کہ راحیل اپنے ناروا سلوک کی خود معافی مانگے مگر بڑھتے دن کے ساتھ اس کے مزاج میں کئی آتی جا رہی تھی ملاحظہ کے ہاتھ کوئی سرا نہیں آ رہا تھا۔ اب اکثر راحیل آفس سے سیدھا خالہ کی طرف چلا جاتا تھا ملاحظہ کا دل جاتا راحیل عشاء تک کے ساتھ وقت گزارے اس

سے باتیں کرے مگر وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ مجھے کیا امی سے بات کرنی چاہیے ملاحظہ میکے آئی ہوئی تھی اور مستقل سوچ رہی تھی کہ کس طرح سے بات کرے، کیا سوچ رہی ہو مہرین اپنے بچے کو تھکتے ہوئے اس سے بولی۔ نہیں تم لوگوں کو سن رہی ہوں وہ بات بتاتی ہوئی اپنی دونوں بہنوں سے بولی، سن رہی ہوتی تو ہماری بات کا جواب دیتی جو یہ یہ کی بات پر وہ گڑ بگڑائی۔ ایسا لگ رہا ہے راحیل بھائی کی بہت یاد آ رہی ہے مہرین شرارت سے بولی جس پر اس کے لبوں پر پھپھکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

میں امی کو بتاتی ہوں راحیل کے رویے کے بارے میں شام وہ بات کرنے کے ارادے سے ماں کے کمرے کی جانب آ گئی مگر وہاں ندرت خالہ پہلے سے موجود تھیں۔

بس آج کل کی لڑکیوں میں برداشت بہت کم ہوگئی ہے آپا اتنی سی شوہر نے کوئی بات کی اور لے کر بیٹھ گئی برائیاں کرنے میری نیتوں بیٹیاں ہی بہت اچھی ہیں مجال ہے سسرال یا شوہر کی کوئی بات کریں یہ تو ہر گھر میں چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں۔ کیا میری بیٹیوں کے گھر میں نہیں ہوتی ہوگی مگر میں نے ان کے لبوں پر اف نہیں سنی راشدہ تفر سے ندرت سے بولیں ملاحظہ گہرا سانس بھر کر واپس پلٹ گئی۔

وہ جانتی تھی اس کی ماں اور خالہ ان کے محلے میں رہنے والی ماریہ کی بات کر رہی تھیں جو آج کل شوہر سے لڑ کر میکے آ بیٹھی تھی۔ دوسرے دن وہ ماں سے کچھ کہے بناء خاموشی سے واپس آ گئی تھی یہ سوچ کر کہ راحیل اس کی عزت ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ پیچھے اس کے شوہر کو برا بھلا کہے۔

مل کئی فرصت وہ گھر میں داخل ہوئی تو راحیل سامنے ہی کھڑا تھا۔ میں سمجھی آپ مجھے لینے آئیے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ کیوں تم میں کوئی سرخاب کے پر لگے ہیں جو لینے آتا راحیل کی بات پر اس کے

تیزی سے باورچی خانے کی طرف پلٹ گئی کام کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مستقل آنسو بہہ رہے تھے راحیل مجھے کیوں زلیل کرتے ہیں اتنا ہر آئے گئے کے سامنے وہ جلتے دل سے سوچنے لگی ہر بار اسے راحیل کی وجہ سے خفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر میری ماں اور بھائی بھابھی کے سامنے کتنے اچھے بنتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں راحیل بہت محبت کرتا ہے مجھ سے اور ایک ماں ہے میری جسے بیٹی کے چہرے پر سچی بے بسی نظر ہی نہیں آتی وہ املیت بنائی ہوئی سوچے جا رہی تھی۔

لاؤ میں مدد کروں تمہاری تھوڑی دیر بعد ندا بھی وہیں چلی آئی ملاحظہ نے ایک نظر ندا کو دیکھا جو اس قدر رنج و جھج کے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر کام میں لگ رہی میں نے کچھ کہا ہے تم سے ویسے راحیل ٹھیک کرتا ہے تمہارے ساتھ ندا استہزاء یہ انداز میں بولی۔ رہنے دو مجھے تمہاری مدد نہیں چاہیے یہ نہ ہو گرمی سے تمہارا میک اپ بہہ جائے اس لیے جا کر اندر بیٹھ جاؤ ملاحظہ ٹھنڈے انداز میں بول کر کام میں لگ گئی رات تک خالہ کھانا وغیرہ کھا کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ رات کے برتن دھو رہی تھی کہ راحیل وہیں چلا آیا تم نے کیا بکواس کی تھی ندا سے وہ بگڑے تیور سے بولا۔ اس نے میری بکواس بتادی اپنی نہیں بتائی ملاحظہ پلٹ دھوتی ہوئی بولی۔

بکواس بند کرو راحیل کے تھپڑ پر وہ سناٹے میں آگئی تھی وہ بے یقینی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آج یہ پہلا تھپڑ مارا ہے تمہاری بدزبانی کو روکنے کے لیے اس کے بعد تم خود اب نتائج کی ذمہ دار ہو گئی وہ کہتا ہوا تن فٹ کرتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ ایک ہی پوزیشن میں اپنے گال پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑی رہی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ راحیل اس پر ہاتھ بھی اٹھا سکتا ہے پہلے

دل کو ٹھیس لگی پتا نہیں یہ دل ہر بار کیوں ٹوٹ جاتا ہے اس کو عادت کیوں نہیں ہو جاتی وہ بھاری دل سے سوچتی ہوئی اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی اور کچھ دیر میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آگئی۔ میں چائے بنا رہی ہوں آپ کے لیے لاؤں وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹے موبائل میں گم راحیل سے پوچھنے لگی۔ ہاں لے آؤ وہ تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی میکے میں خوب دل لگ گیا ہوگا وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس سے چائے کا کپ لیتے ہوئے بولا ہاں بہت زیادہ دل چاہ رہا تھا اور رک جاؤں وہ اس کے برابر بیٹھتی ہوئی سادگی سے بولی۔

تم ایک کام کیوں نہیں کرتی راحیل کی بات پر وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تم ہمیشہ کے لیے وہیں کیوں نہیں رک جاتی۔ راحیل کی بات پر اس کے دل کو دھچکا لگا تھا اس سے پہلے وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھلتی راحیل کے سیل فون پر کال آنے لگی وہ اٹھ کر باہر چل دیا پیچھے بیٹھی ملاحظہ کو اپنا دل شدت سے جلتا ہوا محسوس ہوا وہ اپنی گیلی آنکھیں صاف کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اگلے دن چھٹی تھی اس کی آنکھ باہر سے آنے والی آوازوں پر کھلی وہ منہ ہاتھ دھو کر بال بنا کر باہر آگئی۔ خالہ اب تو آپ آتی ہی نہیں راحیل صحن میں کھڑی خالہ سے شکوہ کرتے ہوئے بولا جو اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ موجود تھیں۔

بس ہم نے سوچا کسی کو پتا نہیں ہمارا آنا اچھا لگتا ہو یا نہیں خالہ کن آنکھوں سے سامنے سے آتی ملاحظہ کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ جس کو اچھا نہیں لگتا وہ یہاں نہ رہے راحیل ان کا اشارہ سمجھتے ہوئے بدلحاضی سے بولا۔ میں چائے بناتی ہوں آپ لوگوں کے لیے ملاحظہ سلام کر کے پلٹتی ہوئی بولی۔ کم عقل عورت صرف چائے ہی نہیں ناشتہ بھی بنا کر لاؤ راحیل کے سب کے سامنے بولنے پر اسے سبکی کا احساس ہوا سامنے بیٹھی ندا اپنی ہنسی دبانے لگی۔ وہ خفت سے

زبان کی مار مارتے تھے اور اب ہاتھ بھی اٹھالیا۔ آنسو بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ملاحت کے لبوں پر بلکل چپ سی لگ گئی تھی اور کتنے ہی دن ملاحت کو انتظار رہا کہ راجیل اس بار ضرور اپنی غلطی پر نادم ہوگا مگر اس کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہی جتک آمیز ہی رہا اب بات بے بات وہ ہاتھ اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا تھا ملاحت کو اس کا ساتھ تھکا لگا تھا اسے لگتا وہ ایسے سفر میں ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں ماسوائے تھکن کے آج بھی صبح کسی بات پر راجیل نے اس کو تھپڑ مار دیا تھا وہ بجھے دل سے اسکول چلی آئی تھی۔ ملاحت کلاس لے کر اسٹاف روم میں آئی تھی وہ بے دلی سے کاپیاں چیک کر رہی تھی مس طلعت اور مس مونا آپس میں کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی گناہ ہے خود پر ظلم سہنا مس طلعت کسی بات پر بولیں ملاحت کو نہیں پتا تھا ان کے درمیان کس موضوع پر بحث ہو رہی تھی مگر اس کا دماغ ان کے اس فقرے پر انک سا گیا تھا گھر آکر بھی وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھی رہی شام راجیل آفس سے آیا تب بھی وہ غائب دماغی کی ہی کیفیت میں تھی راجیل اس سے کوئی بات کر رہا تھا جس پر وہ گم صم کی کھڑی تھی جس پر چراغ پا ہو کر اس نے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا اس سے پہلے وہ دوسرا تھپڑ مارتا سانسے کھڑی ملاحت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مجھے یہاں اس لیے بیاہ کر لائے تھے وہ درحقیقت سے بولی ملاحت کی اس جرات پر راجیل آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے وہ دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا لمحے کی چوٹائی میں ملاحت نے فیصلہ کیا تھا وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھی اور اپنا سامان سمیٹنے لگی وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے آیا تم جیسی بدکردار عورت کو میں اپنے ساتھ رکھنا بھی نہیں چاہتا راجیل کی بات پر الماری سے کپڑے

نکالتی ملاحت ایک لمحے کو سن سی ہو گئی میں بدکردار نہیں ہوں وہ یکدم حلق کے بل چلاتی ہوئی بولی مجھے گالی مت دینا وہ چیختی ہوئی بولی مگر سامنے کھڑے راجیل کے چہرے پر پھیلی مسخرانہ ہنسی پر وہ سامان گھسیٹتی ہوئی اس دروازے سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی جہاں سے آئے روز اسے نکالے جانے کی دھمکیاں دی جاتی تھی، کچھ وقت بعد راجیل نیاں پر الزام تراشیوں اور بہتان کے ساتھ طلاق دے دی تھی اور کچھ وقت بعد اسے پتا چلا کہ راجیل کی شادی ندا سے ہو گئی ہے بقول زرینہ خالہ کے ہمارے بھانجے نے نباہ کی بہت کوشش کی مگر آپ کی بیٹی میں ہی گن نہیں تھے گھر بسانے کے راشدہ کو بیٹی کی طلاق کا بہت افسوس تھا۔ اگر راجیل اتنا برا تھا تو انہوں نے کیوں کر لی اپنی بیٹی کی اس سے شادی بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی سے سخن میں بیٹھی بول رہی تھیں گھر میں داخل ہوتی ملاحت خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی اسے افسوس ہوتا تھا کہ اس نے گھر میں سب کو راجیل کے سلوک کے بارے میں بھی بتایا تھا وہ کب تک اس کا پردہ رکھتی اب جس طرح وہ اس پر ہاتھ اٹھاتا تھا وہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا اس پر اٹھتے بیٹھتے بھابھیوں کے طعنے کہ لڑکیوں میں اتنی برداشت تو ہونی چاہیے وہ ان کی اس قدر جہالت پر افسوس سے ان کو دیکھ کر رہ جاتی کہ یہ برداشت ہے یا خود پر ظلم سہنا ہے اور پھر اس کا وجود سب کو ہی ناگوار لگنے لگا تھا اسے اپنے دونوں بھائی بھابھیوں کی آنکھوں میں اپنے لیے ناگواری صاف نظر آنے لگی تھی۔ دونوں بہنیں ہفتے کے ہفتے آتی تھیں وہ بھی اپنے بچوں میں گم بعض اوقات اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس سے پوچھے اس کے دل کا حال اور وہ اس کو پوچھنے والے کے گلے لگ کر اتار دے کہ اس کے دل پر جو بوجھ ہے وہ سب ہلکا ہو جائے مگر

کی تکلیف سے بہتر تھا وہ ایک بار ہی اس اذیت سے گزر جاتی۔ کیا سوچا پھر تم نے رات اما اس کے کمرے میں آئی ہوئی بولیں۔ آپ منع کروں کتاب پڑھتی ہوئی وہ بولی۔ ارے دماغ خراب ہو گیا ہے ماں کی آنکھ بند ہونے کی دیر ہے یہی اپنے نوج کھا بیٹنگ۔ آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی آنکھیں بند ہو چکی ہیں اپنوں کی وہ کتاب رکھتی ہوئی طنز سے ہنستی ہوئی بولی۔ عورت کا تن تہا زندگی بسر کرنا آسان نہیں یہ معاشرہ اسے جینے نہیں دیتا اما بولیں۔ شادی ہوئی تھی تب کونسا میں زندگی بسر کر رہی تھی تب بھی گھسیٹ رہی تھی وہ مضبوطی سے بولی۔ شوہر کا نام تو تھا ساتھ چار دیواری تو تھی اما سمجھاتے ہوئے بولی۔

ہاں یہ تو ہے شادی شدہ کا ٹیگ ضرور لگا تھا مجھ پر باقی یہ قیہر کا حال تو اللہ جانے یا مردہ جانے وہ اندر کمرے میں آتے دونوں بھائی بھابیوں کو دیکھتے ہوئے طنز سے بولی۔ مرد عورت کی بہت بڑی سہارا ہوتا ہے بڑے بھائی بولے۔ آپ بھی تو مرد ہیں آپ کیوں نہیں ہے میری سہارا وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی جس پر وہ جزبہ ہو کر رہ گئے۔ وہ مضبوط مرد ہوتے ہیں جو عورت کی سہارا ہوتے ہیں مضبوط شجر ہمیشہ اپنی چھاؤں میں بیٹھنے والوں پر سایہ فگن ہوتا ہے مگر کمزور شجر تو ایک آندھی کی زد میں آ کر چھاؤں لینے والے پر ہی آگرتا ہے۔ کیوں بار بار خود کو میں آزمائش میں ڈالوں میں اپنی چھلنی روح کس کو دکھاؤں جو اس کی زبان سے ہوتی تھی زبان کی مار تو سہہ لی اما اگر اب ہاتھ کی مار نہیں سہہ پانی تھی وہ ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو سہارا مجھے بار بار دروازے کی جانب اشارہ کر کے بے سہارا کرنے کے ڈراوے دیتا تھا جو دن رات میری عزت نفس کو اپنے پیروں تلے مجروح کرتا تھا میں پھر ایک بار ویسی ہی آزمائش میں خود کو ڈال لوں زندگی بہت مختصر ہے اما مجھے بھی حق ہے اس کو اپنے طور جینے کا دوسرے

یہاں النان سب کی باتوں سے اس کے دل پر بوجھ آنے لگا تھا۔ وہ ہمیشی سے کبھی ماں کی صورت دیکھتی تو النان کے چہرے کی پریشانی اسے احساس ندامت میں مبتلا کر دیتی، وہ دوبارہ اسکول میں پڑھانے لگی تھی ساتھ ساتھ یوشن بھی ایک گھر میں دینے جاتی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا وجود کسی پر بوجھ بنے بھابیوں آئے دن کوئی نہ کوئی رشتہ بتاتی جو کسی بڑے عمر یا تین چار بچوں کے باپ کا ہی ہوتا تھا۔ اب ملاحت بھی طلاق یافتہ ہے اسے کوئی کنوارا تو ملے گا نہیں بڑی بھابھی بولیں۔ آج کل ایک رشتے پر اما غور و فکر کر رہی تھیں پچاس سال کا آدمی تھا بچے بھی بڑے تھے پیسے والے لوگ تھے بقول بھائی بھابیوں کے کسی چیز کی تنگی بھی نہیں تھی۔ اما نے اسے سوچنے کا وقت دیا تھا اور اسے ان کو جواب دینا تھا۔ بلی اس کے پیر سے نکراتی ہوئی گئی تھی وہ گھبرا کر ماضی سے حال میں چلی آئی تھی اور نیچے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

بڑی بھابھی کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اچھا ہے شادی ہو اس کی جائے یہاں سے فضول میں ایک کمرہ گھرے بیٹھی ہے بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی سے بولیں۔ میں نے سنا ہے جس کی ملاحت سے شادی ہو رہی ہے پہلی بیوی کو بہت مارتا تھا تب ہی اس کی پہلی بیوی نے بھی اسے چھوڑا تھا۔

ارے آج کل عورتوں میں برداشت ہی کہاں ہے اتنی سی بات کو اتنا بڑا بنا کر پیش کرتی ہیں پھر طلاق کا داغ ماتھے پر لگا کر اس ملاحت کی طرح ماں باپ کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتی ہیں بڑی بھابھی بیرحمی سے بولیں اور باہر کھڑی ملاحت سوچ رہی تھی۔

سچ ہے عورت ہی عورت کی دشمن ہے وہ وہاں کھڑے کھڑے فیصلہ کر چکی تھی جانتی تھی اس کے اس اقدام سے قیامت برپا ہو جائے گی مگر روز بروز

کے ہاتھوں میں میں اپنی زندگی کی ڈور تھا کر اپنی زندگی کا تماشہ نہیں دیکھ سکتی میں کیوں جانتے بوجھتے اس ہی کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں جس سے نکل کر آئی ہوں میرے پاس ہے اللہ کا سہارا جو دنیاوی سہاروں کے آگے سب سے مضبوط سہارا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے ایسا سہارا جو بظاہر سہارا دے مگر روز میرا وجود اذیت میں جلے آپ لوگ بھی تو سہارا ہو کیا آپ لوگ میرے اپنے نہیں مگر کیا آپ میں سے کسی نے بولا کہ ہم ہیں تمہارے ساتھ، ہم ہیں تمہارا سہارا کیا کوئی بولا وہ سب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ نہیں آپ سب تو میرے لیے ایک ایسے مضبوط سہارے کی تلاش میں ہیں جو میرے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے مگر آپ لوگوں کو اطمینان ہو کہ چار دیواری کی پناہ تو ہوگی کیونکہ میں یہاں ہوں تو ایک کمرہ تو میں نے ہی لے لیا وہ دونوں بھابیوں کو دیکھتی ہوئی بولی جو سخت سے منہ پھیر گئیں۔

میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں رہی چار دیواری کی بات تو وہ میں ہاسٹل میں اپنا انتظام کر لوں گی وہ کہہ کر ہٹ گئی۔ اس کے اس فیصلے پر ایک طوفان برپا ہو گیا کوئی راضی نہ تھا بھائیوں کو ڈرتا دینا تو تھوکرے گی مگر بیویوں کے سمجھانے پر بھی وہ وہ سمجھ گئے تھے۔ بیٹا منع کر اسے اچھا لگتا ہے گھر ہوتے ہوئے بھی ہاسٹل میں رہے رات وہ اپنے دونوں بیٹوں سے بولیں اما اس کا فیصلہ غلط نہیں اگر شادی نہیں کرے گی تو کیا ساری زندگی اس گھر میں ہی رہے گی اب بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کو بھی جگہ چاہیے ویسے ہی گھر اتنا چھوٹا ہے آپ کے کمرے میں پہلے ہی چھوٹی بھابی کی دونوں بیٹیاں سوتی ہیں میرے بیٹے بھی جوان ہو رہے ہیں اب ملاحت کے ساتھ ان کا سونا مناسب نہیں۔ اپنا کماتی ہے پھر ہفتے میں چکر لگایا کرے گی ہم بھی پوچھ لیا کریں گے کوئی بڑی بات ہے بیٹے کی بات پر ماں دھک سے رہ گئی

تھیں۔ صحیح کہہ رہی ہے ملاحت اپنوں نے تو آنکھیں بہت پہلے ہی بند کر لی ماں لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے باہر آ گئی۔

اچھا اما اجازت دیں وہ سامنے کھڑی ماں سے اجازت مانگ رہی تھی اشکبار آنکھوں سے ماں نے اسے رخصت کر دیا تھا۔

کیا مصیبت ہے چپ کر جاؤ جان عذاب کر دی تمہارا باپ کم ہے زندگی تو جہنم بنانے میں جو تم لوگوں نے بھی بنا رکھی ہے ندا صحن میں لڑتے بچوں پر چلا تے ہوئے بولی۔ کیوں شور مچا رکھا ہے چپ کر آؤ ان کو بد سلیقہ عورت راجیل وہاں آتے ہوئے ڈھارتے ہوئے اس پر بولا۔

میں کیوں چپ کر آؤں تم نہیں کر سکتے تمہارے بھی بچے ہیں وہ وہ دودھ و جواب دیتے ہوئے بولی۔ زیادہ زبان چلائی نہ تو دوپٹہ مارونگا وہ اسے گھورتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ کیا میری شکلیں دیکھ رہے ہو پڑ گئی کلچے میں ٹھنڈا کو بے عزت کروا کے وہ بیٹوں بچوں کو پھڑپھڑاتی ہوئی بولی جو سہمے کھڑے تھے۔ اما تم نے بھی میرے ساتھ بہت اچھا بدلہ لیا جو یہ مصیبت میرے سر مادی شام زرینہ ملنے آئی تو وہ جو بھری بیٹھی تھی ماں کو دیکھ کر پھٹ پڑی۔

ملاحت کے سر سے عذاب اتار کر بیٹی کے سر پر ڈال دیا کتنی خوش نصیب ہے وہ ملاحت جو اس راجیل کی زندگی سے نکل گئی وہ روہا سی ہوتے ہوئے بولی۔

بکواس مت کر تو ہی شادی کے لیے مر رہی تھی یاد نہیں کتنا روتی تھی اس سے شادی کے لیے کہ راجیل نہیں ملا تو مر جاؤ گی حالانکہ وہ تجھے اپنی بہن بولتا تھا مگر تیرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا زرینہ بیٹی پر غصہ ہوتے ہوئے بولی کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے راجیل کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ

آگئی۔ وہ صحن میں آکر تخت پر بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اسے آج بھی یاد تھا طلاق کے کچھ دنوں بعد خالہ نے اس سے کہا تھا بیٹا میں نے تم سے زندگی میں کچھ نہیں مانگا مگر میں اب چاہتی ہوں کہ تم میری ندا سے نکاح کر لو اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ خالہ بولیں میں جانتی ہوں تم اس کو اپنی بہن ماننے ہو مگر یہ تمہاری سگی بہن تو نہیں ہے ویسے بھی مجھے تمہاری بڑی فکر لگی رہتی ہے کیونکہ تم خود تو اپنا خیال رکھتے نہیں ہو خالہ محبت سے فکر مندی سے بولیں وہ ان کی اس قدر محبت پر بے انتہا ممنون تھا کہ کس طرح اب بھی وہ اس کی فکر میں مبتلا ہیں اور کچھ دن بعد ندا اس کی بیوی بن کر اس کے گھر آگئی تھی وہ اس کا بے حد خیال کرتا تھا ندا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی زندگی کا سفر اس ہی طرح بڑھتا رہا کہ اس دوران وہ تین بچوں کا باپ بن گیا تھا۔

ایک صبح وہ آفس جاتے ہوئے اپنی کوئی ضروری فائل بھول گیا تھا جسے لینے وہ آدھے راستے سے واپس پلٹا تھا گھر آیا تو اپنے کمرے سے نکل رہا تھا اسے برابر کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اوہ خالہ آئی ہوئی ہیں وہ سلام کی غرض سے کمرے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ خالہ کی آواز پر ٹھک کر رک گیا، کتنے پاؤں پیلے ہیں میں نے اس ملاحظت سے اس راہیل کو بدظن کرنے میں وہ تو اس کے عشق میں پاگل تھا میں نے بھی شادی سے پہلے ہی کانوں میں زہرا نڈیلنا شروع کر دیا تھا شروع دن سے ہی اس کا کردار مشکوک بنا دیا تھا کہ لڑکی کی بھابھی بول رہی ہے لڑکی کا چکر ہے نہیں مگر اس وقت تو راہیل کے کان پر جوں نہیں رہیں گی۔

مجھے یہ کہہ کر جھٹلادیا تھا سنی باتوں پر مت جایا کریں مگر بیٹا وہ بولتے ہے نہ پتھر پر بھی پانی

پڑتے پڑتے سوراخ ہو ہی جاتا ہے دیکھ لو کیسا بدظن گیا کہ اس کو شک کی عینک لگا کر ہی دم لیا آخر کار اس کی برداشت بھی جواب دے ہی گئی ویسے ایک بات ہے وہ ملاحظت بھی بڑی برداشت والی اس کے بدلے کوئی اور عورت ہوتی تو کب کا چھوڑ کر چلی جاتی باہر کھڑے راہیل کو لگ رہا تھا اس کے وجود کو کسی نے جلتی آگ میں ڈال دیا ہو اس دن کے بعد سے ندا کی آزمائش کے دن شروع ہو گئے تھے وہ ماں کے سامنے آٹھ آٹھ آنسو روٹی تھی۔ میں نے جب کسی شادی میں تم کو پہلی بار دیکھا تھا میں تب ہی تم سے محبت کر بیٹھا تھا مگر تمہارے کردار کو لے کر شادی کے اوائل دنوں میں ہی مشکوک سا ہو گیا تھا اگر چاہتا تو شک کی عینک اتار کر دیکھتا تو تمہارا کردار مجھے سہرا نظر آتا یہ سزا میں نے خود اپنے لیے چنی ہے اب ساری عمر اس ملال میں جیتا رہوں گا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو گنوا دیا اور میری اس نفرت کی آگ ندا کو تباہ کر جاتی رہے گی وہ کرب سے سوچ کے رہ گیا۔

زندگی میں اب ٹھراؤ آ گیا ہے کوئی خوشی نہیں تو کوئی غم بھی نہیں آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی ایک چیز کی خوشی ہے کہ میں نے یہاں آنے کا فیصلہ بہت اچھا کیا تھا اما کی موت کے بعد دونوں بھائیوں نے وہ گھر بیچ دیا تھا بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں کو لے کر دوسرے شہر چلے گئے تھے وہاں ان کی نوکری لگ گئی تھی چھوٹے بھائی اپنے سسرال میں شفٹ ہو گئے تھے اور وہاں گھر داماد کی حیثیت سے رہ رہے تھے باقی دونوں بہنوں کو مہینے دو مہینے میں جب اپنی بہن کی یاد آتی ہے تو آکر مل جاتی ہیں۔

اللہ سے بڑا کوئی سہارا نہیں دنیاوی سہاروں کا کیا ہے کب بے سہارا کر دے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر تازہ ہوا میں اطمینان بھرا سانس لینے لگی۔



ایک سہانی شام

~~~~~

تین بڑے نام شاعر امجد اسلام امجد، مصنفہ حسینہ معین اور ان کہی کی (شنا  
مراد) شہناز شیخ کے ساتھ ایک سہانی شام لاہور کی فضاؤں سے

~~~~~

ڈرامہ آرٹسٹ بہترین مکالمہ لکھنے والی برصغیر مشعل راہ کی بانی آمنہ آفتاب صاحبہ نے کیا تھا یہ
پاک و ہند میں اپنی بے پناہ فلمی صلاحیتوں سے سب تقریب حسینہ معین کی تکریم و تعظیم کے سلسلے میں کی گئی



کا دل جیتنے والی لاکھوں ناظرین کی بہت پسندیدہ
شخصیت حسینہ معین سے ڈیفنس کلب لاہور میں ایک
یادگار ملاقات کا احوال.....
جس کا انتظام اسپیشل بچوں کی معروف تنظیم ہم
تھی۔ معروف اداکار ارشد محمود اور حسینہ معین کی چھوٹی
بہن غزالہ قاضی بھی تنظیم کے بورڈ ممبران میں شامل
ہیں۔
حسینہ معین نے 20 نومبر کو کانپور کے ایک انتہائی



اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے میں جنم لیا تقسیم اور آزادی کے بعد حسینہ معین کے والد محترم معین الدین صاحب اپنے خانوادے کے ساتھ پاکستان تشریف لائے اور راولپنڈی میں رہائش اختیار کی وہ بہت روشن خیال تھے اور اپنی بچیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ حسینہ معین ان کی چوتھی صاحبزادی تھیں جب نرس نے ان کو چوتھی بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی تو وہ اپنی بیگم اور خاندان کے دیگر افراد کے برعکس بہت خوش ہوئے اور سب میں مٹھائی تقسیم کرائی۔ حسینہ معین کی والدہ قدرے سخت مزاج تھیں۔ مگر والد صاحب بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ کانپور کا بہت اعلیٰ شان گھر بھی حسینہ معین کے خواب و خیال میں بسا رہتا۔ ان کو اپنی والدہ کے کمرے میں بچھے اس خوب



ساتھ وہاں چھوڑ آئی تھیں۔

مگر پھر آنکھوں میں بے خوابیوں نے ان کو فینٹسی ورلڈ میں گم کر دیا۔ ان کو خواب دیکھنا اور خوابوں کی خوش رنگ دنیا میں رہنا بہت اچھا لگتا جب کراچی یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹر کی ڈگری مل گئی۔ تو انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا شروع کیا اور پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ایسے سیریل لکھے جن کی شہرت ملک سے باہر بھی تھی۔

اور ہندوستان کے اداکار و ہدایت کار راج کپور نے اپنی فلم حنا کے مکالمے بھی حسینہ معین سے ہی لکھوائے۔

حنا کے لیے زیبا بختیار کا نام بھی حسینہ آپا نے

صورت پلنگ کے چاندنی کے پاؤں کا بھی ملال رہتا جو وہ پاکستان آتے ہوئے سارے ساز و سامان کے

کے حذف کر دیا گیا تھا۔

حسینہ آپا نے پاکستان میں بھی چند فلموں کے مکالمہ لکھے اور بہت شہرت پائی۔ ان کے قلم میں واقعی جادو ہے۔ وہ اپنی بہت خوب صورت دنیا میں رہتی ہیں اور خوابوں سے جڑی اس دنیا میں وہ بہت خوش رہتی ہیں۔ جہاں دکھ تکلیف بہت کم ہیں۔

جہاں بہت ساری تیلیوں کے ہمراہ وہ خوش رنگ جنگل میں امن محبت اور دوستی کے خوب صورتی کے سچے خواب دیکھتی ہیں۔

گو میری حسینہ آپا سے مختصر ملاقات تھی مگر مجھے اس ملاقات کی خوشبو اور افادیت بہت سرشاری عطا کرے گی۔

کہ بالآخر میری ملاقات ’ان کہی‘ شہ زوری‘ انکل عرفی‘ تنہائیاں‘ دھوپ کنارے اور ایسے بہت سارے خوب صورت ٹی وی ڈراموں کی تخلیق کار کے ساتھ چند نشاط بھری گھڑیاں نصیب سے مل گئیں۔



تجویز کیا تھا۔ مگر جن دنوں راج کپور کی حنا فلم پر کام ہو رہا تھا ان دنوں بابری مسجد کا سانحہ پیش آ گیا تو پھر حسینہ آپا کی خواہش پر ان کا نام فلم میں بطور مکالمہ نگار



پسند

~~~~~

موجودہ دور میں غلط کو غلط کہنا اور پھر اس پر قائم رہنا ہی ہمت ۔  
کی بات ہے اور صائمہ کا شمار بھی ہمت والوں میں ہوتا تھا.....

~~~~~

ہاں بولو مسلسل بجتی فون کی گھنٹی پر اس نے
ریسیور اٹھا کر کہا۔
کیا بات ہے، بہت جلدی میں ہو، سانس بھی
پھول رہا ہے کہاں سے بھاگتی آئی ہو نیبا اشارت ہو
چکی تھی۔
کچھ نہیں بس آجکل کچھ مصروفیت زیادہ ہے فنا
فٹ کام نمٹا رہی تھی خیر تم بتاؤ بڑے دن بعد میری یاد
آئی صائمہ نے سکون سے جواب دیا۔
بھائی کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے اگلے ماہ
کی کو انشاء اللہ نکاح ہے۔
ارے واہ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے آنٹی کو،
سب گھر والوں کو بہت بہت مبارکباد دینا۔
سوری اپنے کام خود کرو ویسے بھی امی خاص کر
تمہارا پوچھ رہی تھیں کہاں رہتی ہو کتنے ہی دنوں
سے نہ فون کیا نہ گھر آئیں، بھائی الگ میرا ریکا ڈلگا
رہا تھا کہ کہاں تو اتنی دوستی کہ دن میں دو پہر تک کالج
میں ساتھ رہنے کے باوجود شام سے رات تک فون
پر تھکی رہتیں تھیں محترمہ کاب دور دور تک پتہ ہی نہیں

لگتا ہے پھڑا ہو گیا ہے یہاں نے منہ بگاڑ کر اسد کی نقل
اتاتے ہوئے کہا۔
خیر اس کو تو عادت ہے اول فول بولنے کی صائمہ
نے ہنستے ہوئے کہا۔
اور اس دن کا بھی اسے انتظار ہے جب ہماری
دیرینہ دوستی کسی لڑائی کی نظر ہو جائے اور انشاء اللہ اس
کا انتظار، انتظار ہی رہے گا خیر میں نے تمہیں سب
سے پہلے خوش خبری سنائی ہے اب ساری مصروفیات
کو پیچھے ڈالو اور میرے ساتھ بازار جانے کے لیے
کمر کس لو، نیبا پر جوش تھی۔
وہ ایسا ہے نیبا کہ ابھی ۱۰، ۱۱ دن تو میرے بہت
بڑی ہیں اس کے بعد ہی تمہارے ساتھ چل سکوں گی
، صائمہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔
ہیں میڈم اس کے بعد وقت ہی کیا رہ جائے گا
اور پھر اصل مرحلہ تو لہن کے عروسی جوڑے کا ہے مجھ
کو تو پہلے ہی ڈر ہے کہ ایک ماہ میں کوئی برا سنڈل بنا
نے پر راضی ہوگا بھی یا نہیں ملکی حالات سے تم واقف
ہی ہو کر ونا کی وجہ سے تو سارے کام ہی چو پٹ

ہو گئے ہیں اوپر سے ٹیلر کے نخرے الگ الگ ایک ایک سوٹ پہنے میں اتنے دن لگا دیتا ہے زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں بجائے آگے بڑھ کر ذمہ داری لینے کے محترمہ فرما رہی ہیں کہ ابھی بڑی ہوں سیدھی طرح تیار ہو جاؤں میں ۴ بجے تک پک کروں گی۔

ہمیشہ کی طرح ضدی نیہا بغیر اسٹاپ لیے بولتی جا رہی تھی، اس کو اپنی منوانے کی عادت جو رہی تھی۔

اوکے..... آ جاؤ، آج ہی چلتے ہیں لیکن خدا کے لیے لسٹ بنا کر آنا، اتنا وقت نہیں ہے کہ بازار جا کر سوچو کیوں آئے شے، کیا لینا تھا، کہاں جانا تھا، ترتیب سے خریداری شروع کرنا۔

اچھا اچھا بی اماں بس زیادہ نہیں، حسب عادت نیہا نے صائمہ کی نصیحت پر کان سے کبھی اڑائی تھی۔

☆.....☆.....☆

شہر کے مشہور بوتیک پر وہ دونوں ڈھیروں برا نڈل ڈریمز کھولے کھسر پسر کر رہی تھیں، جو نیہا کو پسند آ رہا تھا وہ صائمہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار دونوں ہی کسی اور جگہ دیکھنے کے لیے اٹھ گئیں اور

آدھا دن اسی تلاش ہی میں گزر گیا۔ اگلے کئی دن تک یہی صورتحال رہی، اور ایک جگہ آخر کار دونوں ہی کو کلر، ڈیزائن و کام پسند آ گیا لیکن اب آرڈر پر دینے میں بحث چھڑ چکی تھی۔

آخر تم کو سیلو لیس پر کیوں اعتراض ہے، ساری شواستین اور اس پر لائننگ سے ختم ہو رہی ہے، نیہا کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

اور تم کو بغیر آستین ہی کا سلوانے پر کیوں زور ہے۔ صائمہ کا لہجہ تنکھا تھا۔

ارے ڈیزائن پر منحصر ہے نا، کیا ہو گیا اگر آستین نہیں ہے تو آج کل کا فیشن ہی یہی ہے۔ تم کیا دلہن کو پردے کی بولو بنانے کے چکر میں ہو، ایک سے بڑھ کر ایک فیملی آئے گی، جدید دور ہے، ہزاروں کا جوڑا بھی بناواؤ وہ بھی فل آستین کے چکر میں آوٹ آف فیشن، کیا ہو گیا صائمہ، نیہا بھنچلا چکی تھی۔

تو بھائی پھر مجھے کیوں ساتھ رکھا ہے، تمہارے بھائی کی شادی ہے نا، تو تم جانو۔ اب صائمہ روٹھ چکی تھی۔

اف میرے اللہ، یہ تم کہہ رہی ہو، کیا جانتی نہیں



ہے سر عام بے لباسی اور سفلانہ خواہشوں پر عمل کرنا
ماڈرن ازم بن چکا ہے اور جیسے چاہو جیو کی تفسیر ہے،
صابر بنو نیہا صابر.....

میں صائمہ کیا ہو جاتا ہے تم کو، بولنے پر آتی ہوتو
بولے چلی جاتی ہو، اب یہاں صبر کہاں سے آگیا،
سوچ کر تو بولا کرو۔ نیہا آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

ہاں صابر ہی کہا ہے میں نے، ہم لوگوں نے صبر
کو صرف میت پر سلی دینے ہی کے لیے سمجھا ہے جبکہ
صبر دراصل زمانے کے بدلتے حالات میں اپنا ذہنی
توازن برقرار رکھنے کا نام ہے۔

زمانہ بدل رہا ہے تو ہم بھی اپنا توازن کھودیں،
بدل جائیں، وہ بے لباس ہو رہا ہے تو ہم بھی شرم و حیا
سے عاری ہو جائیں۔ وہ لوٹ کر کھا رہا ہے تو لوٹنا

ہمارا بھی حق بن جائے، وہ گندگی پھیلا رہا ہے تو ہم
اس سے زیادہ اپنے آپ کو گندگی پھیلانے میں حق
بجانب سمجھیں۔ اس نے سود، رشوت، غبن کے

ذریعے راتوں رات دولت اکٹھی کر لی تو ہم کیوں
پیچھے رہیں، اس نے گندی زبان، دُش اشارے کیے
تو کیا ہم بھی اس کے جیسے بن جائیں، بولو، کیا تم کو

اچھا لگتا ہے جب کوئی تم کو برے لفظوں سے چھڑتا
ہے، اس وقت کیوں پھر زمانے کو برے لفظوں سے چھڑتا
بھلا کہتی ہو، تب یہ کہوں نہیں سوچتیں کہ اس کے پیچھے

کیا محرک ہے، ابھی کوئی میٹھی چیز لا کر بغیر ڈھکے رکھ
دو، کیا ہوگا بولو، بے شمار کھیاں بھٹھکنا جائیں گی نا تو
اس میں قصور کبھی کا ہوا یا اس کا جس نے کھلی چیز سر

عام رکھ دی۔ اپنی ہر قیمتی چیز کو لاکر میں رکھتی ہو، بند کر
کہ رکھتی ہو اور خود اپنا حسن، اپنی نسوانیت کو کھلا چھوڑ
رہی ہو صرف لوگوں کی ستائش کے لیے، دکھاوے

کے لیے، نیہا صبر کرو صبر، خوشیوں میں بھی صبر کہ جو
کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے وہ تمہارے خلاف
جست نہ بن جائے اور یہ مان لو کہ زمانہ برا نہیں ہوتا
بلکہ لوگوں کے عمل برے اور خلاف تہذیب ہوتے

کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو، کیا عدیل صرف میری
بھائی ہے، ہاں میں ہی پاگل ہوں نا جو تم کو بہن سمجھتی
رہی، نیہا نے رندھے لہجے میں کہا۔

میری پیاری سی بہنا پھر مان کیوں نہیں لیتی
میری بات، صائمہ نے نیہا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔
ہاں تو ماننے والی بات بھی تو ہو، اتنے دنوں کی
خاک چھان کر چیز پسندائی تو تم آستین پر انگ گئیں،
نیہا واپس اپنی جون میں آچکی تھی۔

میں یا تم، صائمہ کا لہجہ ٹھوس ہو چکا تھا۔ میں تم کو
سیلوئس کی اجازت یا مشورہ ہرگز نہیں دوں گی، اب جو
تم چاہو۔

ارے تو لا جگ بھی تو دونوں، آخر کیوں سیلوئس نہ
بنوانے پر مصر ہو۔

لا جگ، تم نہیں جانتی لا جگ، اپنے دل سے
پوچھو، تم مجمع میں بنا آستین کے آ جاؤ گی۔

بولو تم پہن لو گی سیلوئس شرٹ.....
ارے تو میرا کیا ذکر، میں تو دلہن کی بات کر رہی
تھی نا.....

تو دلہن انسان نہیں، کیا کوئی جنس ہے جسے بازار
میں سب کی نگاہوں کا مرکز بنانے کے لیے سجادو، جو

تم اپنے لیے نہیں پسند کرتیں تو اس کے لیے کیوں،
اور صرف یہی وجہ کہ جدید دور ہے تو کیا بے لباسی کا

نام جدت ہے؟
یہ شوشا، مووی، مگس گید رنگ، کیا ان سب کو

کرنے سے منع کرنے کی لا جگ چاہ رہی ہو، تمہارا
دل، تمہارے ایمان سے بڑھ کر ہو گیا۔

خاندان میں شوشا اور واہ واہ کے چکر میں تم اپنی
شناخت بھول گئیں، کون ہو تم، کس دین کی پیروی کا رہو

جس جدید دور کے تقاضوں کی تم بات کر رہی ہو وہ
اپنی جڑوں تک گلاسٹرا نظام حیات کو لے کر چل رہا

ہے جہاں کسی کا کسی سے کوئی پردہ نہیں، کوئی لحاظ نہیں
صرف اپنا دل ہے جس کی ہر آواز پر بلیک کہنا لازم

ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی برائی کی اشاعت میں شامل ہو جائیں۔

او کے بابا، میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میرے ساتھ بہترین مقررہ موجود ہے، باز آئی میں، بخشو مجھے نیہانے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

میں سنجیدہ ہوں نیہانہ۔ صائمہ نے گلوگیر لہجہ میں کہا، تم بے شک مذاق اڑاؤ یا پکڑ سمجھو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ضد تصعب اور ہٹ دھرمی کے نقل چڑھا لیے ہیں اور اپنے آپ کو، اپنی شناخت کو بھلا بیٹھے ہیں۔

کوئی نہیں بھلا رہا، چلو بس اب موڈ صحیح کرو، نہیں بنوا رہی میں سیلو لیس، بس خوش، چلو ابھی اور دوسرے کام بھی پٹنا ہے۔

☆.....☆.....☆

کہنے کو تو نیہانہ صائمہ کو اطمینان دلا دیا تھا لیکن وہ اپنے دل میں تہیہ کر چکی تھی اور عین شادی والے دن اسکی بھابی سفید سیلو لیس عروسی لباس میں بقول اس کے آسمان سے اتری اپسرا لگ رہی تھی، مخلوط گید رنگ میں ہر فرد کی نگاہ دہن پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور فخر و غور سے نیہا کی گردن جھکنا بھول چکی تھی، لوگوں کے ستائش پھرے جملوں میں وہ گم اپنی عزیز سہیلی کو بھول چکی تھی کہاں کہ اس کا دن ملے بغیر یا بات کیے بغیر نہیں گذرتا تھا کہاں اب وہ شادی کے ہنگاموں میں صائمہ کی نصیحتوں کی وجہ سے اسے نظر انداز کر چکی تھی، اپنی پسند پر تو وہ ویسے بھی کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتی تھی اور اب تو یہ اکلوتے بھائی کی شادی کا معاملہ تھا جس پر وہ اپنے دل کھول کر ارمان نکالنا چاہتی تھی۔

دوسری طرف صائمہ کو نیہا کی بے رخی نے گویا مار ہی ڈالا تھا وہ کئی بار فون کرتی، میسج کرتی بلکہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر اس کے گھر بھی ملنے چلی گئی تھی لیکن وہ مل ہی نہیں رہی تھی، یا تو فون انگریج ہو جاتا، یا آف، گھر پر وہ ملتی ہی نہیں تھی حتیٰ کہ شادی کا کارڈ

تک اس کی امی نے دیا کہ وہ مصروف ہے اب تم شادی ہی میں ملنا۔

ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا کہ نہ جائے شادی میں جب اس نیہانے نہ کال کی اور نہ ہی کسی کال اور میسج کا جواب دیا تو وہ بھی خاموشی سے گھر ہی بیٹھی رہے لیکن سالوں کی دوستی و محبت کے خیال سے وہ شادی میں آگئی تھی اور اب مسلسل پچھتا رہی تھی، مخلوط و کھلا ڈلا ماحول تو ویسے بھی کبھی بھی اس کو پسند نہیں تھا اور یہاں تو نیہا کی بے رخی والے جواب نے اس کی پلکیں نیم کر دیں تھیں جب اس کے شکوہ پر وہ یہ کہہ کر چلی گئی تھی۔

ہاں یار بہت سوں کی کال و میسج کے جوابات وہ مصروفیت کی بنا پر نہ دے سکی تھی اور صائمہ اس کے کسی کہنے پر شدت غم سے رو دی تھی۔ کہ اب وہ بھی کسی ہے، اس سے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا گیا وہ اٹھ کر بنا کھانا کھائے خاموشی سے چلی آئی تھی۔ ویسے بھی اپنے عبا یہ کے ساتھ وہ اس محفل میں مس فٹ ہی لگ رہی تھی۔

صائمہ کی متورم آنکھیں اور غم سے بو جھل چہرے کو دیکھ کر جب اس کی امی نے کہا اور بنو بی ملانی، ٹھونسنے جاؤ اپنے نظریات اور اپنی پسند، یہ تو ہونا ہی تھا، بلا ضرورت معاملات میں دخل اندازی کا یہی انجام ہونا تھا۔ یا تو اپنی پسند بدل لو اور اپنی گم شدہ دوست و ساتھی کو پالو، یا اپنی پسند پر اپنی دوستی کو قربان کر دو لیکن اللہ کے لیے یہ رونا دھونا بند کرو، حالت دیکھو اپنی کیا بنائی ہے، سیدھی طرح منہ دھو، اور سب جھٹک کر کھانا کھانے آؤ، امی تو صائمہ کو جھاڑ پلا کر کچن میں چلی گئیں تھیں اور جیسے ایک دم ہی صائمہ کے سکتے لبوں پر کسی نے پھایا رکھ دیا ہو۔

یا تو پسند بدل لو یا دوستی قربان کر دو اور اس نے دوستی قربان کرنے کے متمنی فیصلے پر پہنچ کر آنکھیں پوچھ ڈالی تھیں اسکی پسند رب کی رضا جوئی۔

□□.....□□

وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے

~~~~~

سو میری بزمِ سخن آج بھی ہوئی ہے  
ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام ادب  
سرائے میں جب ہماری مہمان ہوئیں ڈاکٹر رخسانہ  
صبا تو مجھے ان کا انٹرویو کرتے ہوئے ایک فخر اور خوشی  
کا احساس گھیرے ہوئے

تھا کہ جہاں اس بناوٹی  
دور میں خود نمائی کے  
دلدادہ خود ساختہ ادیب  
، شاعر اور تنقید نگار کا ملمع  
چڑھائے، خوش آمدی  
بسیا کھیاں اٹھائے نام  
و نمود کی خواہش میں اس  
دوڑ میں شامل ہیں وہاں  
ہی سب سے پرے  
نسائیت کی ردا میں لپٹی  
سادہ مگر پُر وقار انداز  
انہائے محترمہ رخسانہ صبا  
کبھی تنقید کی سنگلاخ



چٹانوں پر تیشہ زن ہیں تو کبھی حقیق کے سمندر سے  
نئے نئے موتی کشید کر رہیں ہیں، شاعرہ ایسی جیسے  
کوئی ساحرات کے پچھلے پہر پورے چاند سے اپنی  
ادھوری باتیں کرے، نظامت کار ایسی کہ اپنی گفتگو کی

کسی بھی انسان کو شخصیت بننے کے عمل میں آس  
پاس کے ماحول اور اُس سے وابستہ انسانی رویوں کا  
بڑا دخل ہوتا ہے یہ ناظر آنے والے وہ تیز ہتھیار  
ہوتے ہیں جو اس کی تراش خراش میں اپنا حصہ ڈال  
رہے ہوتے ہیں۔

ہماری آج کی مہمان  
شاعرہ بھی اپنی زندگی کی  
شاہراہ سے گذرتے ہوئے  
نہ تو ماحول سے عاری رہ سکیں  
اور نہ انسانی جذبوں کے  
شیریں اور تلخ رویوں سے بچ  
کر گزر سکیں بلکہ وہ سب کچھ  
اپنے دامن میں بھرتی رہیں  
پھر ان سب احساسات کو  
شاعری کے روپ میں  
ڈھال کر اپنی گذرتی زندگی  
کے نقشِ محسوسات کی  
صورت لکھتی رہیں۔ اس کے  
علاوہ تحقیق کے سمندر اور تنقید کے میدان میں اپنا لوہا  
منواتی رہیں۔

اُن کا ایک شعر ہے  
میں مجھ رہی ہوں مگر میری راکھ ہے روشن

ریشمی دوڑ سے سب کو باندھ لیں اور استاد وہ جن کی فہم و فراست کے سامنے سر تو کیا نگاہیں بھیجی رہیں مگر دامن علم کے لعل و جواہر سے بھرتے رہیں۔ کراچی میں جنم لینے والی رخسانہ صبا نے گریجویشن کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ انہوں نے جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ماسٹرز کی سند حاصل کرنے کے علاوہ بی ایڈ اور ایم ایڈ بھی اور دوران ملازمت آغا خان یونیورسٹی سے ایڈوائس ڈپلومہ ان ایجوکیشنل لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ کا کورس مکمل کیا۔

آپ نے تحقیق کے میدان میں جب قدم رکھا تو اردو کی طویل نظموں کے تناظر میں نظم 'انسان' کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ جس پر جامعہ کراچی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔

ڈاکٹر رخسانہ صبا آج کل جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ممبر آف رزیٹنگ فیکلٹی سے وابستہ ہیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ 'راکھ روشن ہے' 2017ء میں شائع ہوا۔

سرسید کی دو سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ان کی مرتب کردہ کتاب 'جہات سرسید' 2017ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوئی۔

طویل نظمیں اور جمیل الدین عالی کی نظم 'انسان' کے نام سے تحقیقی مقالہ بھی کتابی شکل میں 2018ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا۔ جیسے پاکستان پبلیشرز ایسوسی ایشن کی جانب سے ایکسپو بک فیئر 2018ء میں بہترین تحقیقی کتاب کا ایواڈ بھی ملا۔

ڈاکٹر رخسانہ صبا کا یہ انٹرویو نشریاتی رابطہ fm 93 پر نشر کیا گیا اس پروگرام کی ایگزٹو پروڈیوسر

محترمہ شگفتہ آفتاب، پروڈیوسر محترمہ سیما رضا اور ریکاڈنگ انجینئر انوار حسین تھے۔ ادب سرائے سننے والوں نے نہ صرف سنا بلکہ اپنی پسند کا اظہار بھی کیا اور جو نہیں سن سکے ان کے لیے قسط اس پر رقم کر کے ماہنامہ دوشیزہ کے توسعت سے آپ سب کی نذر کر رہی ہوں اس تعاون کے لیے ماہنامہ دوشیزہ کی ممنون ہوں اور آپ سب کی آرا کی منتظر بھی۔ ادب سرائے: آپ نے اپنے نام کے متعلق اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ نام کیسے آپ کا ہوا۔ کچھ اس کا تذکرہ ہو جائے؟

رخسانہ صبا: امی بتاتی تھیں کہ جن دنوں میری پیدائش ہوئی ان دنوں کسی مقامی اخبار میں ایک گمنام مجاہدہ کی داستان چھپ رہی تھی جس کا نام رخسانہ تھا لہذا میری بہن نے تاریخ کے اس گمنام کردار سے متاثر ہو کر میرا بھی یہی نام رکھ دیا۔ میری بہن ایک بہت اچھی نثر نگار اور افسانہ نگار تھیں لیکن اس لمحے شاید وہ یہ بھول گئی تھیں کہ مجاہدے اور ریاضت کی دنیا کتنی کٹھن ہوتی ہے اس کٹھن کی برداشت کرتے کرتے میں بھی تاریخ کا کوئی گمنام کردار ہو گئی، میرا مطلب ہے میرے اندر کی لڑکی۔

ادب سرائے: آپ نے اپنی کتاب میں اپنے اندر کی لڑکی سے تو بہت باتیں کیں ہیں۔ آج ہمارے سننے والوں (ادب سرائے ریڈیو پروگرام) کو بتائیے کہ اندر کی شاعرہ سے کب ملاقات ہوئی؟ رخسانہ صبا: میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں والدہ اور بڑی بہن کو کتابوں سے محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے دیکھا۔ میری بڑی بہن بہت وسیع المطالعہ تھیں۔ ان کے افسانے اور مضامین اس زمانے کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی بدولت بہت کم عمری میں مجھے کتابوں سے عشق ہو گیا تھا۔ لڑکپن ہی سے اشعار بڑی تیزی سے میرے

اب مری مٹی کو بھی اکسیر کر  
 اب مرے پاؤں کو بھی  
 دے محبت کی ٹھکن  
 کر انہیں اپنی تینا میں نڈھال  
 اب مری خالی ہتھیلی پر بھی رکھ  
 اک چراغ عشق  
 جس کی لو سے پھولے خواہش رنگ وصال  
 اے خدائے ذوالجلال!

ادب سرائے: اصناف سخن میں نثری نظم کی کیا  
 حیثیت ہے۔ کیا نثری نظم کا کوئی رول ماڈل ہمارے  
 سامنے ہے؟

رخسانہ صبا: نثری نظم کے تو نام پر ہی ایک عرصے  
 تک اتفاق نہیں ہو سکا۔ لفظ نثری میں 'ی' کے  
 استعمال نے اسی صفت نسبتی کا درجہ دے دیا ہے  
 ۔ پروفیسر حنیف کیفی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا  
 ہے کہ مغرب میں اس صنف کو نثر کی طرح  
 پیراگرافوں میں ہی تحریر کیا ہے۔ انہوں نے شمس  
 الرحمن فاروقی کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے نظم کو نثر  
 میں شاعری کہا ہے۔ اس صنف کو اب تک کوئی رول  
 ماڈل نہیں ملا اس لیے یہ مقبول نہیں ہو سکی۔

ادب سرائے: سماج پر شاعری کے کیا اثرات  
 مرتب ہوتے ہیں؟

شاعری اور سماج ایک دوسرے کا آئینہ ہیں  
 ۔ شاعری میں جذبات کو براہِ بیخیتہ کرنے کی اور انقلابی  
 فکر کو پروان چڑھانے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی  
 ہے۔ اسی لیے جوش کی نظم 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزند'  
 سے خطاب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انگریز سرکار  
 نے اس پر پابندی لگا دی تھی۔ فیض کی شہر نظم 'ہم  
 دیکھیں گے' 1997ء میں کسی اور تناظر میں لکھی گئی تھی  
 لیکن 2019ء میں ہندوستان کے نوجوانوں میں  
 ایک نئی معنویت کے ساتھ مقبول ہوئی۔ یہ شاعری کی

حافظے میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ درجہ ہشتم میں اسکول  
 کی وال میگزین کے لیے (جس کی میں مدیر بھی تھی)  
 وطن کے حوالے سے پہلا نمونہ لکھا تھا۔ درجہ نہم تک  
 آتے آتے میں نے کئی ادبی شاہکار اپنے مطالعے کا  
 حصہ بنا چکی تھی۔ اختر ایمان کی 'آب جو' کا مطالعہ بھی  
 انہیں دنوں کیا تھا۔ اپنے اندر کی شاعرہ سے ملاقات  
 اسی مطالعے کی دین ہے پھر اس دوران مشہور شاعر  
 ، صحافی براڈ کاسٹر اور ہمہ جہت ادیب امداد نظامی  
 ہمارے خاندان کا حصہ بنے اور ان کی شادی میری  
 بہن سے ہوئی تو میرے شعری ذوق کو جلا بھی ملی اور  
 اس کی آبیاری بھی ہوئی۔

اس پروگرام میں باتوں کے ساتھ ساتھ شاعری  
 کا تذکرہ بھی ضروری ہے تو آپ کچھ سنائے!  
 رخسانہ صبا: ابتداء میں اپنی حمدیہ نظم سے کرنا  
 چاہوں گی جس کا عنوان ہے۔ اک چراغ  
 کون دل کے آنے ہر ڈال کر گرد و ملال  
 روح پر بینائی کے در کھولتا ہے  
 اور جسم و جاں کو دیتا ہے توانائی کی ڈھال  
 کون چروں کی نمائش گاہ میں  
 دامن دل کر دکھاتا شناسائی کی آنچ  
 مانگ میں بھرتا ہے پہلے بے یقینی کا غبار  
 اور اس کے بعد یک دم کھینچ دیتا ہے ہمارے گرد

خوابوں کا حصار  
 کون مٹھی سے گرا دیتا ہے ریت  
 راستوں پر اجنبیت کے بچھا دیتا ہے جال  
 کون ہے؟ تو ہی تو ہے  
 جس نے میری روح میں روشن کیے  
 آگہی کے زاویے، زندگی کے خدو خال  
 جس نے میرے خوش نصیب آنچل میں ڈالی  
 آنسوؤں کی یہ متاع لازوال  
 میرے حرف و صوت کو بخشا جمال

قوت کا خوف ہی تو تھا۔ جس کی بنیاد پر ہر عہد میں پاکستانی نوجوان کو اقبال کی شاعری کی حقیقی روح سے دانستہ بگانہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

اپنی کوئی نظم سنا ہے

رخسانہ صبا: جی ضرور میری ایک نظم ہے کس آواز کی انگلی تھامیں

خواب غلامی کی دہلیز پہ نم دیدہ چپ چاپ کھڑے تھے

ازن رہائی کی حسرت میں

اپنی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں

ہونٹوں پر اک انجانی چپ

آنے والے سناٹوں کے خوف سے گویا رکی ہوئی تھی

کان ہر اک دستک بھول چکے تھے

ایسے میں تیری آواز کا شعلہ لپکا

چپ کا بھید کھلا، اک تازہ دستک ابھری

اور ہمارے خواب

تری آواز کی انگلی تھامے ایسی راہ پہ نکلے

جس پر صبح آزادی

خوشبو کے تھخے لیے کھڑی تھی

آج مگر اے قائد اعظم!

خواب ہمارے

اپنی ہی دہلیز پہ گم سم کھڑے ہوئے یہ سوچ رہے ہیں

اب تو آنکھیں بھی گروی ہیں

نیلامی کا جشن ہے برپا

چاروں جانب آوازیں ہی آوازیں ہیں

لیکن پھر بھی دھند میں گم ہیں سارے رستے

کس دروازے پر دستک دیں؟ کس آواز کی

انگلی تھامیں

ادب سرائے: کیا مشاعرے اردو ادب اور

زبان کے فروغ کا موجب بنتے ہیں؟

رخسانہ صبا: جی ہاں! مشاعرے کسی زمانے

میں شاعر اور سامع دونوں کی ادبی ولسانی تربیت گاہ کا

درجہ رکھتے تھے۔ اب مشاعرے اپنا یہ کردار انجام

نہیں دے رہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک مختصر نشستیں

شاعری تربیت کا فریضہ انجام دیتی تھیں مگر اب ان کی

صورتحال بھی زیادہ اچھی نہیں اس لیے سنجیدہ لکھنے

والے زیادہ تر گوشہ عافیت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

ادب سرائے: تنقید کے بارے میں کیا کہیں گی

آج کل کیسی تنقید لکھی جا رہی ہے؟ یا یہ میدان خالی

ہے؟

رخسانہ صبا: اردو میں تنقید لکھی تو جا رہی ہے کچھ

اچھی کتابیں بھی آئیں ہیں لیکن مجموعی طور پر آج کی

تنقید اپنے بنیادی منصب کو فراموش کر چکی ہے۔ متن

کی قدر و قیمت کے تعین کے ساتھ تنقید کا ایک اہم

مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ذوق ادب کی آبیاری کرے

اور قاری کو اچھا ادب پڑھنے کی طرف راغب کرے

۔ میں نے ایک مرتبہ اقبال کی نظم 'خضر راہ' پر پروفیسر

آل احمد سرور کا ایک مضمون پڑھا مجھے اس نظم سے ہی

محبت ہو گئی۔ آج کی تنقید میں تعلقات باہمی کی بنیاد

ہر تحسینی مضامین کی بھرمار ہے حالانکہ صحیح معنوں میں

ان کا شمار تنقید میں نہیں ہوتا دوسری طرف بعض

نقادوں کے ہاں مغربی نظریات و اصطلاحات کی بھر

مار ہے اور انداز تحریر بھی بے حد ادق اور نقل ہے لہذا

عام قاری تو درکنار ادب کا عام طالب علم بھی تنقید

پڑھنے سے گریزاں ہے۔ تو نئے لکھنے والوں کی

تربیت کیسے ہوگی۔ تہذیبی اور لسانی روایات سے

آگاہی، فنی لوازم سے شناسائی اور علوم پر دسترس کے

ساتھ ساتھ ایک نقاد میں تخلیقی جمالیات کی تہہ میں

اُترنے کی صلاحیت بھی درکار ہے۔

ادب سرائے: تو کیا اردو ادب روبہ زوال ہے؟

لاکھ بجھاؤں پھر بھی ماند نہیں پڑتی  
کیسی اشک فشانی مجھ میں روشن ہے  
ادب سرائے: آپ اردو زبان کے مستقبل تو کیسا  
دیکھ رہے ہیں؟

رخسانہ صبا: بولنے اور سننے کی حد تک تو اردو  
زبان کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے مغرب میں بھی  
اردو کی نئی بستیاں آباد ہو چکی ہیں لیکن اردو رسم الخط کو  
سخت خطرہ لاحق ہے۔ ہندوستان میں تو پہلے ہی اردو  
کے شعرا اپنے مجموعی دیواناگری رسم الخط میں چھپوا  
رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ موبائل  
فون پچھرنے رومن رسم الخط میں اردو لکھنے کی روش کو  
پروان چڑھایا ہے۔ والدین اساتذہ اور ہم تمام  
بڑوں کا فرض ہے کہ اس رجحان کو روکیں ورنہ  
ہزاروں کتابوں اور تحریروں دستاویزات کی شکل میں  
ہمارا علمی و ادبی اثاثہ ضائع ہو جائے گا۔

ادب سرائے: اردو زبان و ادب کے فروغ کے  
لیے الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا کیا کردار ہے؟  
رخسانہ صبا: دونوں ہی کا کردار بہت اہم ہے  
کیونکہ دونوں ہمیں براہ راست عوام پر اثر انداز ہوتے  
ہیں۔ اور ان کی ذہن سازی کرتے ہیں ابتدائی  
عشروں میں ادبی رسائل، اخبارات ریڈیو پاکستان  
اور پاکستان ٹیلی ویژن نے جو کردار ادا کیا وہ سب پر  
عمیاں ہے لیکن گذشتہ پچیس برسوں میں خصوصاً نجی  
وی چینلوں کی بھرمار کے بعد یہ کردار نہ صرف کمزور ہوا  
ہے بلکہ قوم کی شاندار ادبی، تہذیبی اور تخلیقی ورثے  
سے مجرمانہ غفلت بھی ہے۔

ادب سرائے: سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی  
میں نفاذ اردو کی راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں اس کا نفاذ  
اب تک کیوں نہیں ہوا جبکہ فیصلہ اسکے حق میں ہوا؟  
رخسانہ صبا: رکاوٹ کوئی نہیں ہے بس نیت  
خراب ہے مقتدرہ قومی زبان کا نام ہی بدل دیا گیا۔

رخسانہ صبا: ادب کے زوال اور اس کی طرف  
سے مایوسی کا اظہار حسن عسکری، جمیل جالبی، سلیم احمد،  
انصار حسین اور ترغیہ العین حیدر جیسے نابغہ روزگار تخلیق  
کاروں اور نقادوں نے بھی کیا تھا اس میں کوئی شک  
نہیں کہ اب اسکول سے لے کر جامعات کی سطح تک  
اردو کے بیشتر اساتذہ تخلیقی اور تنقیدی جمالیات سے  
محروم نظر آتے ہیں۔ پھر سستی شہرت کے خواہش مند  
ایسے لکھنے والوں کی بھی کثرت ہے جو کا تا اور لے  
دوڑی کے مقولے پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن گذشتہ تیس  
ہینتیس برس میں سنجیدہ تخلیق کاروں کے ایسے  
شاہکار بھی نظر آئے ہیں جو ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی  
پچیدہ زندگی کی معنویت کو بڑی ہنرمندی اور بھرپور  
ادبی جمالیات کے ساتھ اظہار میں لائے ہیں۔  
میرے خیال میں اب یہ ایک نعرے کی صورت  
اختیار کر چکا ہے۔

ادب سرائے: آپ کا مشق سخن شاعری کی دو  
اصناف ہیں ایک غزل اور دوسری نظم ہم نے آپ  
سے نظمیں تو سنی اب اگر غزل بھی سنا دیں۔

رخسانہ صبا: ضرور غزل سنیں

اک تعبیر پرانی مجھ میں روشن ہے  
خوابوں کی حیرانی مجھ میں روشن ہے  
اب بھی زخم ہے تازہ اس کے لہجے کا  
اب تک ایک فشانی مجھ میں روشن ہے  
کون اچانک دستک دے کر لوٹ گیا  
ایک خلش انجانی مجھ میں روشن ہے  
تیری آنکھوں کی تحریروں کی صورت  
اک بے نام کہانی مجھ میں روشن ہے  
تجھ میں تو آباد رہے تازہ موسم  
لیکن اک ویرانی مجھ میں روشن ہے  
جب سے راکھ ہوئے ہیں برگ و بار مرے  
اک شعلہ سامانی مجھ میں روشن ہے



رخسانہ صبا: میرے نزدیک لکھنے والی خواتین پر دوہری ذمہ داری ہے وہ بالکل لکھیں، معیاری لکھیں اور لکھتے ہوئے نسوانیت کا مرمریں احساس کھونے نہ پائے اس کا بہت خیال رکھیں۔

ادب سرائے: اپنا کلام عطا کیجیے۔  
رخسانہ صبا: ایک غزل پیش کر رہی ہوں۔  
جنوں کو بھی عرض حال کا اہتمام کرنا سیکھا رہی

ہوں  
میں دل کی دھڑکن کو شور و غم سے کلام کرنا سیکھا  
رہی ہوں  
سکھا رہی ہوں چراغ کو یہ، جل کے بجھنے کا حسن  
کیا ہے

ہواؤں کو روشنی کا میں احترام کرنا سیکھا رہی  
ہوں  
وہ زندگی جس کے ناز اٹھائے، نہ جانے کس لمحہ  
رخ بدل لے  
اسی لیے تو میں اپنی صبحوں کو شام کرنا سیکھا رہی  
ہوں

نئے مفاہیم راہ پائیں، نئے معانی سفر پہ نکلیں  
سوحرف کو شہر آگہی میں قیام کرنا سیکھا رہی ہوں  
سنددورں کے سفر میں آخر یہ کن جزیروں کی  
روشنی ہے

نئی زمینوں کے راز ساحل کو عام کرنا سیکھا رہی  
ہوں  
یہ دائرے، زاویے، قوسیں یہ نوک پر کار کا ہنر  
ہیں

اسی ہنر سے تمام کو نام کرنا سیکھا رہی ہوں  
نہ آہ کوئی، نہ آنسو، یہ درد کی بزمیے سودل کو  
بڑے سلیقے سے جشن کا انتظام کرنا سیکھا رہی

۶



استعماری طاقتوں کے آلہ کار حکمران، لسانی اور سیاسی  
مفادات کے حامل سیاست دان، نام نہاد اشرافیہ،  
مغرب کے پروردہ بیوروکریسی پاکستان مخالف  
قوتیں نفاذ اردو میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔  
میں ادیبوں، شاعروں کے کمزور دریے اور اساتذہ  
اور اردو سے وابستہ اداروں کی اس صورت حال چشم  
پوشی اور علمی جدوجہد سے گریز کو بھی اس کا ذمہ دار  
قرار دیتی ہوں۔

ادب سرائے: اس بوچھل ماحول کو ایک غزل سنا  
کر لطیف کر دیں۔  
رخسانہ صبا: مسکراتے ہوئے ایک غزل سناتی  
ہوں۔

حرم دیدہ ترمانگتی ہے  
آنکھ روٹنے کا ہنر مانگتی ہے  
اب تو رستوں کی جھلک بھی مجھ سے  
خواہش ترک سفر مانگتی ہے  
مجھ میں روشن ہے جواک بے خبری  
اپنے ہونے کی خبر مانگتی ہے  
اپنی پہچان کے پاگل پن میں  
رات بھی رنگ سحر مانگتی ہے  
لفظ بازار میں یک جاتے ہیں  
زندگی کا سہرا مانگتی ہے

ادب سرائے: آپ نے شاعری میں اپنے آپ  
سے باتیں کیں ہیں اپنی اس شاعری کو کیا کہیں گی؟  
رخسانہ صبا: یہاں پر میں پھر یہی کہوں گی کہ

بقول: Leonard Cohen

"Poetry is just the evidence of  
life. If your life is burning  
well, poetry is just the ash"

ادب سرائے: لکھنے والی خواتین کے لیے کوئی

پیغام۔

# سو جا میری راج ڈلاری

~~~~~

میں ماں ہوں نہ تیری قبر سے لپٹ کر رو سکتی
ہوں مگر تجھے روز مرتے نہیں دیکھ سکتی.....

~~~~~

ساتھ ہی خاتمہ ہوگا۔ اس شور کے ساتھ زیست  
کے کتنے ہی برس وہ گزار چکی تھی اور نہ جانے ابھی  
کتنا سفر باقی تھا۔ وہ لاعلم تھی بے خبر تھی۔ کیونکہ وہ  
تو انسان بھی عالم الغیب تو نہیں تھی جو جان سکتی کہ  
اس کی اسیری کی مدت کتنی ہے۔

ملحقہ کمرے سے بہت مدھم سی آوازیں  
ابھرتیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ یوں جیسے گس کی  
بھینھناہٹ ہو یوں جیسے کانوں میں سرگوشیاں کی  
جاری ہوں۔ وہ خود سے گفتگو کے بارے میں  
اندازے لگا رہی تھی۔

”اماں..... اماں.....“ گڑیا شاید اچانک  
نیند سے بیدار ہوئی۔ اس کی آواز بوچھل اور  
چہرے پر کرب چھایا تھا۔

اپنی سوچوں میں غرق گل مینہ مکمل طور پر متوجہ  
نہ ہوئی۔ بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔

”اماں..... اماں.....“ دوبارہ سے ندا بلند  
ہوئی جس میں احتجاج بھی تھا۔ شاید ماں کی  
لا پرواہی کے خلاف بے دھیانی کے خلاف یا پھر

میرا ظرف سمجھو یا میری ذات کا پردہ  
جب سے ٹوٹی ہوں خاموش رہتی ہوں  
تپتی ریت پر تیزی سے رینگتے سانپ کی  
طرح شام رات میں داخل ہو رہی تھی۔ وقفے  
وقفے سے کچھ سرسراہٹ کا شور سنائی دیتا اور پھر  
خاموشی چھا جاتی۔ چند لمحوں کے لیے ماحول پر  
سکوت چھا جاتا۔ سناٹا گہرا ہونے لگتا رات کی  
تاریکی بڑھنے لگی تو جھینگروں کی آواز سنائے کے  
سینے کو چیر ڈالتی۔ بے ہنگم شور سماعتوں سے ٹکرانے  
لگا ایک طوفان سا برپا ہو جاتا اور کانوں کے  
پردے پھٹنے لگتے۔ وہ گھبرا کر دونوں کانوں پر  
ہاتھ رکھ کر چند لمحوں کے لیے بہرہ ہونے کی دعا  
کرنے لگتی۔ تاکہ اس جاں مسلسل شور سے نجات  
حاصل ہو۔ جھینگروں کا شور تھم چکا تھا۔ ماحول پر  
ایک بار پھر خاموشی کی حکومت قائم ہو جاتی اور گرد  
و پیش پرسکون قابض ہونے لگتا۔ باہر کے شور سے  
وقتی طور پر نجات مل جاتی تھی مگر اندر کا شور تو یوں  
لگتا تھا کہ اب عمر بھر کا ساتھ ہے اور موت کے

الاتعلقى كے خلاف.....

تھیں۔

”ہاں میری جان.....“ گل مینہ تڑپ کر بولی۔ وہ ماں ہی کیا جو اولاد سے لاپرواہ رہ سکے۔ لاتعلق رہ سکے یہ ماں کی شان ہی نہیں کہ اولاد پکارے اور وہ متوجہ نہ ہو۔ ماں تو وہ ہستی ہے جو دنیا سے جا کر بھی اولاد کے لیے فکر مند رہتی ہے۔ اور اس کی روح چند لمحوں کے لیے خدا کے حضور اجازت مانگتی ہے کہ ایک نظر اپنے نخت جگر نور نظر کو دیکھ آئے۔ گل مینہ تو ابھی زندہ تھی کیسے غافل رہتی۔ روح قفس عنصری میں قید تھی۔ بصارت سلامت تھی۔ سماعت قائم تھی۔ اپنی اولاد کو دیکھ سکتی تھی چھو سکتی تھی۔

”ہاں میری لاڈلی.....“ داوری میں چننی پیستے اس کے دونوں ہاتھ تھم گئے۔ گڑیا کے گالوں پر آنسو بہنے لگے تو گل مینہ نے تڑپ کر اس کو خود سے قریب کر لیا اور چوکی پر بٹھا دیا ساتھ والے کمرے میں سرگوشیاں اب قہقہوں میں بدل گئی

”یہاں.....“ عین معدے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”نہیں.....“ گڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہاں..... ادھر..... اوپر یا نیچے۔“ گل مینہ تشویش سے بولی اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے درد کا اصل مقام معلوم کرنے کی سعی کی۔

”اماں..... سب جگہ درد ہو رہا ہے۔“ کہتے ہوئے وہ بے حال ہونے لگی اور ماں کی ٹھوکیں سر



”مگر کیوں خان جی۔“ گل مینہ کی پیشانی پر سلو میں نمایاں ہونے لگیں۔

”حکیم ولی خان..... دوسرے شہر گیا ہے کسی رشتے دار کی شادی میں..... تم بیٹھو آرام سے گھر میں۔“ بادل خان کی بے فکری گل مینہ کو تپا گئی۔ گڑیا کو گود سے اتار کر بستر پر لٹاتے ہوئے وہ بادل خان کی جانب بڑھی۔ وہ اس کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ ایسے تو وہ تن کر بھی اپنے لیے کھڑی نہ ہوئی تھی مگر آج بات اور تھی۔ آج وہ ماں بھی اولاد کی تکلیف پر مضطرب تھی ہر خوف سے آزاد تھی۔

”خان جی..... تو پھر کسی ہاسپٹل میں لے جاتے ہیں۔“ گل مینہ بولی۔ بادل خان اس کے تیور دیکھ کر چونک گیا۔ آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی چہرے کر رنگ متغیر ہونے لگے عورت کی دلیری تو اس کو ہرگز گوارا نہ تھی۔ وہ جرأت مندانہ انداز میں بات کرے یا مشورہ دے۔ یہ اُس کے مسلک کے خلاف تھا وہ مسلک جو روایت و اقدار کا مسلک تھا جس کی بنیادیں فخر و تکبر سے رکھی گئی تھیں۔ وہ مسلک جس میں اصولوں کو خدا کی حیثیت حاصل ہوتی ہے جس کی تعلیمات کے مطابق عورت پیر کی جوتی ہے۔ جہاں اس کو دلیر ہوتے دیکھو بولتا دیکھو جرأت محسوس کرو اس کو پچل ڈالو عورت کی اوقات ہی نہیں کہ وہ مرد کے منہ لگے۔

تیری نفرت اور تیرا گلہ بھی مجھ سے ہے افسوس اے ابن آدم تیرے ہونے کا سلسلہ بھی مجھ سے ہے

”کیا تکلیف ہے اسے؟“ بادل خان جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

”پیٹ میں درد ہے۔“ گل مینہ نے پھر سے

رکھ کر رونے لگی مگر ہاتھ ابھی بھی پیٹ پر دھرا تھا۔ اولاد کی تکلیف پر تو مامتا تڑپ جاتی ہے۔ یوں جیسے سمندر میں طغیانی آ جاتی ہو اور دیوانی موجیں چٹانوں سے اپنا سر ٹکرانے لگیں۔ الماریاں دوا کے ڈبے سب کھنگال مارے مگر دوا نہ ملی۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس نے تفکر سے گھڑی پر نظر ڈالی جو رات کے دس بج رہی تھی۔ اس وقت تو کوئی میڈیکل اسٹور بھی کھلا نہ ہوگا۔ کلینک بھی بند ہوگا۔

”حکیم ولی خان.....“ گل مینہ کے دماغ میں تیزی سے خیال کوندا تو کھونٹی سے اپنی اجلی سفید چادر اتار کر اپنے گرد لپیٹی۔ حکیم ولی خان اس علاقے کا مشہور و معروف حکیم تھا۔ رب کریم نے بہت شفا رکھی تھی اس کے ہاتھ میں..... چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ہوتا یا بڑی تکلیف وہ نبض پکڑ کر بتا دیتا۔ تونج کے لیے تو اس کے پاس ایسی نایاب پھکیاں اور پورن تھے کہ پورا علاقہ حیرت زدہ رہ جاتا تھا یوں آرام آتا جیسے جادو کر دیا ہو۔ گڑیا کو گود میں لینے کی غرض سے بڑھی تھی کہ بادل خان کی کرخت آواز پر چونک گئی۔

”کہاں جا رہی ہے تو اس وقت.....؟“ بادل خان مونچھوں کو بل دیتے ہوئے شکی نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے تھا۔ آنکھوں کی سرخی دگنی لگ رہی تھی۔

”خان جی..... گڑیا کے پیٹ میں درد ہے۔ حکیم ولی خان کے پاس لے کر جا رہی ہوں۔“ گل مینہ نے مجرموں کی طرح سر جھکاتے ہوئے صفائی پیش کی۔

”کوئی ضرورت نہیں۔“ نسوار کی چنگلی منہ میں ڈالتے ہوئے وہ رعب دار انداز میں گویا ہوا۔

میں قدموں کی آہٹ پر اس نے اک نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ کیا زبان تو مجبور تھی مگر دل خوب زہر اگل رہا تھا۔

بادل خان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جو کسی سنگینی کا عندیہ تھا مونچھوں کو بل دیتے ہوئے وہ کمرے میں ہولے ہولے قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ گل مینہ نے اک سرسری نگاہ ڈالی مگر کچھ پوچھا نہیں کیونکہ گڑیا کی تکلیف اس کی ہر سوچ پر حاوی تھی۔

”اب کیسی ہے گڑیا؟“ بادل خان بہت دیر بعد بولا۔ اس کے لہجے میں ہرگز پریشانی نہیں تھی اور چہرہ بے تاثر ہی تھا۔

”دوا کے بغیر کیسی ہو سکتی ہے؟“ گل مینہ نے گڑیا کے زرد مرجھائے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”لڑکیوں کو مضبوط ہونا چاہیے..... کیا پتہ آگے کی زندگی آسان ہو کہ مشکل..... تم نے تو خواہ مخواہ ہی اسے چھوٹی موٹی بنا دیا ہے۔“ بادل خان جذبات سے عاری لہجے میں بولتا زہر لگا تھا۔ مردوں کو عورتوں کے بارے میں یہی گمان

رہتا ہے کہ وہ مضبوط ہوں صابر ہوں۔ اُف نہ کریں مگر کبھی خود اپنے لیے یہ نہیں سوچتے کہ انہیں بھی آئندہ آنے والی زندگی کے حوالے سے کچھ کرنا ہے کچھ سوچنا ہے کچھ بدلنا ہے۔ مگر نہیں پیدائش سے لے کر موت تک مرد پر صرف حاکمیت کا غرور چھایا رہتا ہے نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ گھر بنانے اور پکاڑنے کی ذمہ داری فقط عورت کے حصے میں آتی ہے۔

”آگے کی زندگی.....“ گل مینہ کے دل کو کھٹکا سا ہوا۔

”ہاں..... ہاں آگے کی زندگی دو دن بعد

بتایا۔

”یہ تو تھوڑا اس کی چٹکی دو۔ ابھی سب درد کا فور ہو جائے گا۔“ بادل خان نے نسوار کی چٹکی بیوی کی جانب بڑھائی۔ گل مینہ کا نفرت کے مارے برا حال ہونے لگا تھا۔ دل جلنے لگا۔

کوئی شخص اپنی اولاد کے لیے اتنا سنگدل ہو سکتا ہے۔ الفاظ نوک زبان پر پھلنے لگے۔ مگر وہ بات بگڑنے کے ڈر سے چپ رہی۔ وہ کمزور تھی اور بادل خان حاکمیت کے نشے میں چور تھا۔ گل مینہ چیخ چلا کر صرف ہنگامہ کرتی اور مار کھاتی گالیاں سنتی اور وہ گڑیا کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہ رہی تھی۔ جو درد کے مارے بے سدھ پڑی تھی۔ بادل خان جیسا بد لحاظ انسان جو کسی کی تکلیف کیا سمجھتا نہ اس کا ہاتھ رکے گا اور نہ ہی زبان.....

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔“ گل مینہ انکار کرتے ہوئے گڑیا کے پاس جا بیٹھی۔

”تمہاری مرضی.....“ وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا تا ہوا یوں بولا جیسے گڑیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

کہ تمہاری اولاد ہے تم جانو..... ہمیشہ کی طرح ہر الجھن اور ہر غم سے بے نیاز رہتا تھا وہ ہر دکھ صرف گل مینہ کے حصے میں آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ سناٹا پھیلنے لگا گل مینہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے ناجانے یہ مرد اولاد پیدا ہی کیوں کرتے ہیں۔ جبکہ اُن کی تکلیف دیکھ کر انہیں ذرا سی بھی احساس نہیں ہوتا بیٹی کے معاملے میں تو یہ احساس بالکل صفر ہوتا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے مسلسل قہقہوں کی آواز سن کر گل مینہ کی جان جل رہی تھی۔ کمرے

اس کا نکاح رکھ دیا ہے برادری نے..... گل خان کے ساتھ۔“ بادل خان کی بے حسی اپنے عروج پر تھی۔

گل مینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ آنسوؤں نے ہر شے کو دھندلا دیا۔ سات سالہ بچی کا نکاح..... وہ بھی 50 سال کے مرد سے..... گل مینہ کا سینہ پھٹنے لگا تھا کہ دل ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نہ نکل آئے۔ وہ منہ پر دوپٹہ رکھے بے آواز رونے لگی۔ وہ اپنی چیخوں کو روک رہی تھی کہ کہیں گڑیا جاگ نہ جائے۔ جو بد نصیب درد سے بے حال ہو کر نا جانے کب سو گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی گڑیا کی نیند خراب ہو۔

”یہ کیا رو رو کر خوشست ڈال رہی ہے۔“ بادل خان نے اسے یوں روتے دیکھا تو بولا۔ اُسے غموں کے جنگل میں دھکیل کر وہ بک بک جھک جھک کرتا باہر جا چکا تھا۔

گل مینہ ضبط کرتے کرتے بے حال ہونے لگی تو کھڑکی کے قریب جا پہنچی۔ وہ غم زدہ تو ابھی اپنے غم پر ہی نوحہ کناں تھی۔ اور اب اس کی بیٹی کو بھی پابند سلاسل کیا جا رہا تھا عمر بھر کے لیے..... اک انجانے خوف نے اس کا سرخ و سفید چہرہ لٹھے کی طرح بے رنگ کر دیا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو نوچتی بھی اپنا سر پیٹتی۔ وقت پھر سے وہی سب دہرانے لگا تھا۔ جب برادری کے ظالم رسم و رواج اس کا بچپن نگل گئے تھے۔ وہ تو ابھی کلی تھی جو کھل بھی نہ پائی تھی۔

مگر اسے تحمل دیا گیا تھا۔ بادل خان سے اس کا نکاح کروا دیا گیا تھا کہ اُس کا باپ جوئے میں رُف جو ہار گیا تھا اور بدلے میں اپنی بیٹی دے کر اپنی جان چھڑائی تھی۔ گل مینہ کے بارے میں کچھ نہ سوچا گیا تھا کہ وہ معصوم کیا کرے گی۔ کیسے رہے

گی ماں کے بغیر..... جب وہ گزریوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ گڈے گڑیا کی شادی کرتی تھی اپنی سکھیوں کے ساتھ مل کر ان کے کپڑے بناتی تھی اس کی اپنی شادی ہو گئی۔ وہ تو لفظ ’نکاح‘ سے بھی نا آشنا تھی۔ رخصتی کے وقت وہ بار بار ماں کے ساتھ لپٹ جاتی۔ رو رو کر بے حال ہونے لگی مگر..... ماں بھی بے بس تھی اس کے پاس بیٹی کے لیے دعاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے بادل خان کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

”ماموں جان..... ہم کہاں جا رہے ہیں؟“  
”ماموں جان..... مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔“

”ماموں جان..... مجھے واپس گھر جانا ہے۔“ وہ تمام راستے اُس سے پوچھتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔

وہ بادل خان کو ماموں کہا کرتی تھی وہ ان کا دور پار کا رشتہ دار تھا جس کی عمر 50 سال اور گل مینہ کی عمر صرف 10 سال تھی۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ اب بادل خان اس کا شوہر ہے۔

وہ گھر جانے کی ضد کرتی تو بادل خان چیختا چلاتا تو وہ سہم کر چیپ ہو جاتی۔ جب بھی زیادہ روتی تو بادل خان پتھر مار کر چیپ کرواتا۔ وہ مار کھا کر کسی کونے میں دبک جاتی اور ماں کو یاد کرتی رہتی۔ جس کی زندگی میں ظالم سیاہ بادل آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اب اُس کی زندگی میں اندھیرا اچھا گیا تھا صرف تاریکی ہی تاریکی تھی ہر سو زندگی بے نور ہو چکی تھی خوشیوں کے کنول مرجھا گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

صرف چند دن ہی بادل خان نے اس کے بچپن پر رحم کھایا تھا۔ پھر مردانگی میں اُبال پیدا

رہتی۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کے بعد بادل خان کی بہن نے گل مینہ کے گرد پہرہ سخت کر دیا۔ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ سونے سے پہلے اس کا بازو اپنے بازو کے ساتھ دوپٹے کی مدد سے باندھ کر سوتی۔

ایک عورت چاہے جتنی مرضی تدبیریں لڑالے۔ ایک عیار مرد کے سامنے وہ ناکام ہی رہتی ہے۔ وہ ایسی چال چلتا ہے کہ شطرنج کی پوری بساط الٹ جاتی ہے اور بازی اُس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ موقع کی تلاش میں تو وہ پہلے ہی سے تھا۔ بہن کی بیماری نے اسے نادر موقع دے دیا۔ دوا میں بے ہوشی کی دوا کی آمیزش سے بادل خان ہتھیار سے لیس ہو کر میدانِ کارزار میں اترا۔ مخالف کو لالکارا۔ بے کوئی جو میرے مد مقابل آئے۔ جواب نداد۔..... میدان خالی تھا۔ مخالف تو بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ بادل خان کی چال چل گئی۔ اب اسے اس کے ارادوں سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

منہمی گل مینہ چیخ چیخ کر مددگار کو پکارتی رہی مگر کوئی اس کی مدد کو نہ آیا تھا۔ اس کی معصومیت کا بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ بچپن تباہ کر دیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ کسی کونے میں پڑی سسکنے لگی۔ زندگی تاراج ہوئی وہ موت سے پہلے مر گئی۔ اداسی کی سیاہ چادر نے اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا تھا۔

خوف دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گیا۔ وہ بادل خان کو دیکھ کر خوف سے رونے لگتی۔ خود کو کمرے میں بند کر لیا کرتی۔ اسے نیند کے تصور سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ مگر بادل خان کے منہ کو خون لگ

ہونے لگا جیسے گرم کھولتے پانی میں ابال آتا ہے اور بلبلے تیرنے لگتے ہیں بادل خان کی شکاری نظریں گل مینہ پر ہی جمی رہتیں۔ جو اس تاک میں ہوتا کہ کب شکار غفلت میں ہو اور وہ اس پر حملہ کر دے۔ گل مینہ کو اس کی سرخ آنکھوں سے بہت خوف آتا تھا۔ بادل خان کی بیوہ بہن ساتھ ہی رہا کرتی تھی وہ گل مینہ کی حمایت میں اکثر بادل خان سے اُلجھ پڑتی۔

”بادل خان..... کچھ شرم کر کچھ حیا کر..... بچی ہے وہ..... کچھ اپنی اور اس کی عمر کا فرق ہی دیکھ لے۔“ وہ عورت بھی گل مینہ کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر ترپ اٹھتی۔ گل مینہ کو اپنے پیچھے چھپا کر وہ خود ڈھال بن جایا کرتی تھی۔

”تو کیا غلط کر رہا ہوں..... منکوحہ ہے میری..... نکاح کر کے لایا ہوں انواء نہیں کیا۔“ بادل خان ازلی ہٹ دھرمی سے بولتا۔ وہ بھرا ہوا بھیڑیا بنا ہوتا تھا۔ جس کے منہ سے شکار چھین لیا گیا ہو۔ اس کا دماغ الٹ جاتا تھا۔ منہ سے کف اڑاتا ہوا وہ گل مینہ کو کھانچ جانے والی نگاہوں سے گھورتا۔ جو خوف سے ہر تھڑکانپ رہی ہوتی تھی۔

”مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔“ گل مینہ روتے ہوئے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ اس کا رونا دھونا بادل خان کو اور طیش دلا رہا تھا۔ وہ جنونی انداز میں آگے بڑھا اور اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ خوب دھکم پیل ہوتی، ہنگامہ ہوتا گل مینہ کی چیخیں آسمان کو چھونے لگتیں۔

”ہرگز نہیں بادل خان..... میرے ہوتے ہوئے تو اس معصوم بچی کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔“ بادل خان کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے ارادے خاک میں مل جاتے اور ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آتی۔ وہ مفتوح اور اس کی بہن فاتح

”اماں..... اماں.....“ گڑیا کی آوازیں اسے ماضی کی تلخیوں سے یوں کھینچ لاتی تھیں جیسا جھاڑیوں میں الٹا دوپٹہ زور لگا کر کھینچا جائے تو تار تار ہو جائے۔ کچھ حصہ جھاڑیوں میں رہتا ہے اور کچھ کھینچنے والے کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔

”ہاں میری بچی..... میری جان.....“ گل مینہ تڑپ کر بولی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ ڈالے اور چہرے پر مسکراہٹ سجائی..... خشک ہونٹوں کو زبان پھیر کر کرکھا۔

”اماں..... بہت درد ہو رہا ہے۔“ گڑیا کی حالت غیر ہونے لگی۔ درد کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

دو دن بعد گڑیا کا نکاح ہے۔ جب اس کے پیٹ میں درد اٹھا کرے گا..... جب وہ بخار میں جلا کر رہے گی۔ جب تیزی سے سبزی کاٹتے ہوئے ہاتھ زخمی کر بیٹھے گی..... اور جب شکاری رات کے اندھیروں میں اُس پر حملہ آور ہوا کرے گا..... جب گڑیا چلا کرے گی۔ رویا کرے گی تڑپ کر اُسے پکارے گی کمزور ہرنی کی طرح اپنا وجود چھپانے کے لیے بھاگا کرے گی۔ مگر کب تک آخر شکاری اُسے بے بس کر ڈالے گا۔ نکاح کے نام پر درندگی رقص کرے گی..... معصومیت پامال ہوگی..... ننھا سادل ماتم کرے گا..... گل مینہ یہ سب سوچ کر تھرا اٹھی۔ اسے لگا وہ بے جان ہو کر زمین بوس ہو جائے۔ جسم سے روح الگ ہو جائے گی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”کم بخت زندگی ابھی..... بھی زندہ ہے۔“ وہ غمزہ ہوئی۔

”اماں تم چپ کیوں ہو..... مجھے کوئی دوا کیوں نہیں دیتی..... تاکہ میرا درد دور ہو جائے اور میں میٹھی نیند سو جاؤں۔“ گڑیا درگھ سے بے حال ہوتے

چکا تھا۔ بس شکار پہلی بار ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو داؤ پیچ خود بخود آ جاتے ہیں۔ وہ با آسانی اپنا شکار کرنے لگا۔ اب نہ اسے کوئی روک سکتا تھا اور نہ ہی قابو کر سکتا تھا۔ بادل خان کسی کے قابو آنے والوں میں سے تھا بھی نہیں.....

☆.....☆.....☆

حالات کی مار کھا کر وہ جلد ہی بڑی ہو گئی۔ بے فکری کا زمانہ رخصت ہوا اور فکروں کا انبار اس کی ذات کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ زندگی بھی بڑی ڈھیٹ شے ہے وقت سے پہلے اس کا خاتمہ ہی نہیں ہوتا..... موت سے بچنے لڑائی ہے خود کو بچانے کے لیے اپنی حفاظت کے لیے..... گل مینہ نے متعدد بار اس کے خاتمے کی سعی کی مگر گھر بار نا کام رہتی..... اس کی زندگی کی تلخیاں ہر بار پہلے سے زیادہ ہو جاتی اسے اکثر اماں یاد آتیں..... جب وہ بخار میں جل رہی ہوتی..... گھر کا کام کاج کرتے ہوئے تیز چھری سے اس کا ہاتھ زخمی ہو جاتا..... خون کے قطرے فرش پر جھنے لگتے وہ دھاڑیں مار مار کر روتی اور اماں کو آوازیں دیتی..... ہنڈیا پکاتے ہوئے کبھی دوپٹہ جل جاتا تو خوف سے چلا چلا کر روتی رہتی مگر خالی گھر دیواروں کے ساتھ اُس کی چیخیں سر ٹکراتی..... اور خون و خون ہو کر گر پڑتی۔ کبھی تو بے پروائی کو ڈالتی تو ہتھیلیاں جلا بیٹھتی..... اور اپنے جلے زخمی ہاتھوں سے رات کو بادل کی ٹانگیں بھی دباتی..... خدمت میں کوئی کوتاہی ہوتی تو بادل خان ڈنڈے جوتوں سے اس کی تواضع کرتا..... اس کا کمزور بدن ٹوٹ پھوٹ جاتا۔

وہ رات بھر درد سے تڑپتی اماں کو پکارتی رہتی مگر ہر طرف بس اندھیرا مایوسی اور دکھ ہی ہوتا جو رگیں چیر ڈالتا..... زندگی مسکرا نا بھول گئی تھی۔ وہ بس آنسو بہانا جانتی تھی۔



ہوئے معصومیت سے بولی۔

چھوڑ گئی تھی۔

”ٹھک..... ٹھک..... ٹھک.....“ چٹنی پینے کی آوازیں رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔

”اری او پاگل عورت..... رات کے اس پہر یہ کیا ٹھک ٹھک شروع کر دی ہے اس وقت تیرے پچھلوں نے آکر کھائی ہے۔“ نیند میں ڈوبی آواز بادل خان کی تھی۔ وہ اکثر اس کے ماں باپ کے لیے یونہی لفظ بولتا تھا۔ باوجود اس کے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے پھر بھی وہ گالیاں نکالتا۔

”بند کر ذلیل عورت..... یہ تماشہ.....“ بادل خان حلق کے بل چلایا۔ مگر آج گل مینہ کو اس سے خوف ہی نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ نہ ہی وہ کچھ سن رہی تھی۔ وہ تو گہرا خاموش سمندر دکھائی دے رہی تھی۔ جس میں ذرا سی بھی لرزش نہ ہو۔ وہ چٹنی پیستی رہی تھی۔ ایک دو بار پانی نور نظر کو دیکھا تھا جو در سے بے حال ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ ایک آہ نیم کش اس کے لبوں سے خارج ہوئی۔

مرد ایک بے حس مخلوق ہے جس میں دل نام کی کوئی چیز نہیں۔ جسے عورت صرف ضرورت کے وقت یاد آتی ہے۔ چاہے وہ کتنی دکھوں کی ماری کیوں نہ ہو۔ پیار ہوا چار ہو مرد کو اس کی تکلیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کاش مرد کی بے حس دور ہو جائے وہ عورت کو بے جان سمجھنا چھوڑ دے۔ نہ تو وہ پتھر کی بے جان مورتی ہوتی ہے اور نہ ہی پیر کی جوتی.....

”میں تیرے لیے لڑ نہیں سکتی..... روایات و اقدار کی اندھی حاکمیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی..... میں تجھے تیرے باپ کی بے رحمی سے نہیں بچا سکتی۔ میں تجھے ہوس کے پجاریوں سے نہیں چھپا سکتی۔ میری راج دلاری..... مگر.....“ وہ سسکاری تھی۔ چٹنی پس چکی تھی۔ گل مینہ آہستگی سے اٹھی۔ چچ بھر چٹنی لی اور گڑیا کے پاس چلی آئی۔ اس کی لرزنی ٹانگیں اس کا

جو صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا درد دور ہو جائے اور وہ سو جائے۔ اس سے آگے کی کوئی سوچ نہ تھی۔ مگر گل مینہ..... کے دل پر گویا برجھی ماردی ہو..... وہ چتا پر پڑی لاش کی طرح سلگنے لگی۔ آنکھوں سے برستا پانی بھی چتا کی آگ کو بجھانہ پارہا تھا۔

وہ لوگ عورت کو جسم سمجھ لیتے ہیں روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں

گل مینہ کے دماغ میں تیزی سے کوئی خیال کوندا۔ یقیناً وہ کسی خوف کی پیداوار تھا۔ مگر خیال اتنا ہیما نہ تھا کہ گل مینہ سوچ کے کانپ گئی۔

”نہیں نہیں..... ہرگز نہیں..... بالکل بھی نہیں.....“ مگر حالات کا کوڑا جب ننگی پیٹھ پر پڑتا ہے تو کھال کھینچ لیتا ہے۔ تو ایسے میں خیالات جنم لیتے ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خیال ثبت ہے یا مٹتی..... اس پر عمل کرنا درست ہے یا غلط..... اس عمل کا نتیجہ کیا نکلے گا..... بس خوف..... یہ خوف ہی ہوتا ہے جو کچھ سوچنے نہیں دیتا..... انسان کو پھر اندھیرے سے خوف نہیں آتا..... گہری کھائی دیکھ کر دل نہیں ٹھہراتا..... بلند پہاڑوں سے گرنے کا خوف نہیں رہتا۔ تنہا رہنے کی وحشت نہیں لرزاتی۔ بس انسان بے حس ہو جاتا ہے ہر خوف ہر غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بس اس کے من میں جو سودا سما جاتا ہے وہ اس کے پیچھے چل پڑتا ہے نتائج سے کلی بے پرواہ ہو کر..... آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے اس نے اک نگاہ گڑیا کے وجود پر ڈالی۔ اور داوری کے قریب آکر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز چال ڈھال کسی مضبوط فیصلے کی گواہی دے رہے تھے۔ چہرے کی سٹیکنی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ داوری میں آدھی پس ہوئی چٹنی ابھی بھی پڑی تھی۔ جیسے وہ

چھلکنے لگا۔

گل مینہ اسے پھرائی ہوئی آنکھوں سے تک رہی تھی۔ جانتی تھی آج کے بعد گڑیا کو دیکھ نہیں پائے گی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا اور پیشانی پر بوسہ لیا۔

وہ بالکل ساکت تھی یوں جیسے استھان پر کوئی بت رکھا ہو۔ مگر جب اس کی آنکھوں سے دوشفاف موتی گرے تو گمان ہوا کہ بت میں روح کا گزر ہوا۔ جیسے جان پڑ گئی ہو۔

کاش..... اے ابن آدم تو یہ بھی کبھی سوچے کہ عورت بھی بنت آدم ہے۔ عورت مرد کے لیے عیش و آرام کا کوئی کھلونا نہیں ہے جسے جب چاہا کھیل لیا اور جب چاہا توڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

رات صبح کے اجالے کی منتظر تھی۔ ہر سو اجالائے سحر بکھر گیا۔ تو گل مینہ کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ گڑیا کا بے جان وجود اس کے سامنے پڑا تھا۔ اب اس میں کوئی حرارت نہ تھی۔ ماں سے لوری سن کر وہ ابدی نیند سوچتی تھی۔

ہر دکھ ہر غم سے نجات پا گئی تھی۔ دیکھوں کی ماری ماں نے اپنے ہاتھوں اپنی گودا جاڑ ڈالی تھی۔ تاکہ اس کی گڑیا کو کوئی غم نہ ملے۔ ایک ماں کو اپنی گود کے علاوہ اگر کسی گود پر بھروسہ ہوتا ہے تو وہ صرف قبر کی گود ہے۔ جہاں ظالموں کے ہاتھوں سے وہ دور ہو جاتی ہے۔ اپنی بیٹی کو خوف سے آزاد کر دیا تھا۔ اب کوئی اس ننھی مٹی کو نہیں مسلے گا رات کے اندھیروں میں اپنے باپ کی عمر کے شخص کی ہوس کا شکار نہیں ہوگی۔ جو نکاح کے نام پر جسموں کو پامال کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔

وہ روتے روتے سے ہنسنے لگی تھی۔ بے تحاشہ ہنستی جا رہی تھی۔ گڑیا کے فرار ہو جانے پر بادل خان

وجود سنبھال نہیں پارہی تھیں۔

”کب تک یہ ننھی مٹی کلیاں مسلی جاتی رہیں گی۔ آخر کب تک اندھی اور فرسودہ روایات اُن کی جان لیتی رہیں گی۔ یہ انسانی اندھے قانون ماؤں کی گودا جاڑتے رہیں گے۔ بیٹی کا نصیب اپنی ماں جیسا ہوتا ہے..... کیوں آخر کیوں..... اسے اختیار ملتا تو وہ رب کائنات سے اپنی لاڈلی کا نصیب خود لکھنے کی اجازت مانگتی۔ گل مینہ نے آنسو حلق میں اتارے جیسے زہر یلا اہل حلق میں اتار لیا ہو۔ وہ محبت پاش الوداعی نگاہوں سے اپنی بچی کو ہٹنے لگی۔

”گڑیا..... میری راج دلاری..... دوا کھالو.....“ کہتے ہوئے الفاظ تھرتھرا سے گئے۔

”اٹھ میری بیٹی.....“ گل مینہ نے اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھایا۔ اس کے ہاتھ بری طرح سے کپکپا رہے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سنگین قدم اٹھا رہی ہے۔ بادل خان کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ مگر اپنے عیش و آرام کے لیے جو گڑیا کا سودا کیا تھا۔ وہ ادھورا رہ جائے گا۔ صرف وہی اپنی گڑیا کے لیے تڑپے گی۔ مگر وہ سہہ لے گی یہ جانتی تھی۔ کیونکہ ایک اور بادل خان..... اس کی گڑیا کا بچپن چھین لے..... اس کی مصعومیت کا قتل کر دے۔

”نہیں..... نہیں.....“ اس نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ گڑیا نے ایک نگاہ ماں کے چہرے پر ڈالی اور دوا کھالی۔ اس کے زرد چہرے پر پھیلنے لگی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ گڑیا سکون سے لیٹ گئی۔ کیونکہ اس کی ماں نے اسے دوا کھلا دی تھی اب وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ممنونیت بھری نگاہیں ماں کے چہرے پر تھیں۔

”اماں لوری سناؤ نا..... مجھے نیند آ جائے گی۔“ گڑیا کو درد سے نجات ملی تو آنکھوں سے نیند کا خمار

# غزل

مشکل میں ڈالتا ہی نہیں میرا رب مجھے  
حیرت سے دیکھتے ہی رہے سب کے سب مجھے  
میں امتی ہوں اور نبی ﷺ کی غلام ہوں  
دل سے عزیز تر ہے یہ نام و نسب مجھے

ایسے نہ ٹوکیئے مجھے یوں نہ سکھائیے  
معلوم ہیں سبھی تو حدودِ ادب مجھے  
لہجہ بدل کے ایسے ستانا نہیں قبول  
کچھ دینی ہوگی اُن کو رعایت بھی اب مجھے

یوں تو نہیں آپ کو میں جانتی نہ ہوں  
اس روٹھنے کا خوب پتہ ہے سبب مجھے

آپس میں مل کے خوب ہی موجیں اُڑائی ہیں  
سب دوستوں نے رکھا سدا تشنہ لب مجھے  
جھوٹی گواہیوں پہ نہ اصرار یوں کریں  
ڈھب جھوٹ بولنے کا بھی آتا ہے کب مجھے

تم کو ہی چاہتا ہوں چاہوں گا میں سدا  
اُس نے کہا تھانس کے یہی زیر لب مجھے  
ہاں مانتی ہوں بات، شگفتہ یہی ہے سچ  
آتا ہے بس خیال ترا روز و شب مجھے

شگفتہ شفیق

کے ناکام ہونے پر..... بادل خان نے ایک نظرا سے  
یوں ہستے دیکھا تھا اور پھر کفنِ دُن کے انتظام کے  
لیے باہر نکل گیا تھا۔

”بے چاری..... بیٹی کی موت کے غم میں پاگل  
ہو گئی ہے۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

”اب تیرا دوپٹہ نہیں جلے گا گڑیا..... نہ ہاتھ  
جلیں گے اور نہ ہی تو بیماری میں بے حال ہو کر مجھے  
پکارے گی۔ میں نے تجھے بچالیا..... تجھے  
چھپالیا..... ہر روز مرنے سے تیرا ایک بار مرنا ہی بہتر  
ہے..... سو جا میری نبھی پری..... آرام سے  
سو جا.....“

☆.....☆.....☆

شہرِ خموشاں میں ایک نبھی قبر کا اضافہ ہو گیا تھا۔  
مٹی کی مہک ہر سو بکھری تھی فضاءِ سوگوار تھی۔ سناٹا  
جان لیوا سناٹا۔

وہ گڑیا کی قبر سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو رہی  
تھی۔ مگر اب یہ رونا عمر بھر کا تھا۔

”ہاں میں نے تجھے مارا ہے..... میں تیری  
جدا کی برداشت کر لوں گی مگر تیری آپس میرا دل  
چیر دیتا..... تیرے بین میرا کلیجہ چھننی کر دیتے.....  
میں نے تجھے چھپالیا ہے۔ میری لاڈلی میری راج  
دلاری سو جا..... اب تجھے کوئی نہیں ستائے گا۔ اب  
تجھے کوئی درد نہیں ہوگا۔ اور نہ اب کوئی تجھے دہن  
بنائے گا۔ اپنی ماں کو معاف کر دینا۔ تجھے ظالموں  
سے بچانے کے لیے مجھے واحد یہی جگہ نظر آئی تھی۔“  
سکسپاں آپس بلند ہونے لگیں۔

”مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا جتنا میری ماں میں  
تھا۔“ آنسو اب تھمنے والے نہیں تھے۔

”میں تیری قبر سے لپٹ کر رو سکتی ہوں۔ مگر  
تجھے رخصت کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔“

□□.....❁.....□□

# غلط فہمی

~~~~~

یشاء افگن کی سردمہری سے خائف

تھی، مگر یہ بات مرد ذرا کم ہی سمجھتے ہیں.....

~~~~~

کو مگر آج اس کی تضحیک نے اس کے احساسات پر  
کیسا پتھر پھینچ مارا تھا۔ دل کا تمام لہو گویا آنکھوں  
میں سمٹ آیا تھا۔

’ظرف عام غراہٹ نما آواز زیر لب نکلی تھی۔ جو  
کچھ وہ یشاء کے ساتھ طیش کے عالم میں کر آیا تھا۔  
دل کے اندر کہیں بہت اندر ندامت کا احساس بھی  
اجاگر ہو رہا تھا۔ یشاء کی اس کی قوت کے سامنے  
بے بسی، ہراساں چہرہ آنکھوں کی بے یقینی نے  
اسے اندر تک شرمسار کیا تھا وہ خود سے بھی نظریں  
نہیں ملا پار ہا تھا۔ دوہرے احساسات کا شکار وہ  
کمرے میں اضطرابی انداز میں ٹہل ٹہل کر اپنے  
اندر کے اشتعال کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
کچھ بھی تھا مجھے یشاء کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا  
چاہیے تھا۔ وہ مجھ سے اب اور بھی بدظن ہو جائے  
گی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی دل میں درد کی لہر اٹھی  
تھی۔ کتنا چاہتا ہوں میں تمہیں کچھ اندازہ نہیں  
تمہیں.....

تب ہی شامین ناک کر کے روم میں داخل

اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ جسم کے روم  
روم سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا آنکھیں  
سرخ انگارہ شدید غصے کی غماز تھیں اور وہ اپنے  
ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھامے اپنے اندر  
کے اشتعال کو کم کرنے کے لیے ادھر سے ادھر ٹہل  
رہا تھا کمرے کا پنکھا اپنی پوری رفتار سے چل رہا  
تھا۔ مگر اس کا وہی حال تھا کچھ بن نہ پڑا تو اس نے  
ہاتھ میں تھامی ٹھنڈے پانی کی بوتل کو ہاتھ اٹھا  
کر سر پر انڈیل لیا۔ چہرہ جسم سب تر ہو گئے تھے  
خالی بوتل ایک طرف پھینکی اور نزدیک پڑی کرسی  
پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

’دیکھ لوں گا یشاء تمہیں..... تم کو اپنے الفاظ  
کی سنگینی کا ذرا احساس نہیں۔‘ دماغ میں ابھی بھی  
لاوا پھوٹ رہا تھا ہر چیز تہس نہس کرنے کا دل  
کر رہا تھا۔ اس سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس  
کی تمام مثبت سوچیں، صلاحیتیں جیسے سب ختم  
ہو چکی ہیں۔ کتنی چاہت تھی اس کے دل میں یشاء  
کے لیے خود سے وابستہ کتنا انمول وجود لگتا تھا اس

ہوئی تھی۔ بھائی آپ کو امی جان بلا رہی ہیں۔  
اپنی دھن میں بیچ کنوے کرتے بھائی کے چہرے  
پر نظر پڑی تھی ٹھنک کر نزدیک آئی۔  
”کیا ہوا آپ کو.....“ فکر مندی سے

استفسار کیا۔

”کچھ نہیں..... طبیعت ٹھیک نہیں ہے  
میری..... ضروری کام ہے تو امی جان کو یہیں بھیج  
دو.....“ بہن کی فکر مندی نظر انداز کرتا وہ بیڈ کی  
طرف بڑھ گیا تھا۔

”جی بہتر.....“ شامین سر ہلاتی تیزی سے  
واپس پلٹ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شامین اپنی امی  
جان صوفیہ بیگم کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں داخل  
ہوئی تھی۔ اس بار ناک کرنے کی نوبت نہیں آئی  
تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اگلن بیڈ پر بے سدھ  
پڑا تھا۔ صوفیہ نے نزدیک آ کر اس کے ماتھے پر  
ہاتھ رکھا۔ بری طرح جل رہا تھا۔

”ارے اسے تو بہت تیز بخار ہے۔“ وہ اس

کے نزدیک ہی بیٹھ گئیں تھیں۔  
”شامین ڈاکٹر کو فون کرو بیٹا.....“ بیٹی کو  
ہدایت کر کے وہ اگلن کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔  
”اگلن..... اگلن..... آنکھیں کھولو بیٹا.....“

کئی آوازیں دیں مگر وہ بے سدھ پڑا رہا تھا۔  
شامین نے ابو جی کو بھائی کی کیفیت سے آگاہ  
کرتے ہوئے ایمرولینس کال کر لی تھی۔ اسے فوراً  
ہاسپٹل منتقل کر دیا گیا تھا۔ معظم صاحب اکلوتے  
بیٹے کی زندگی کے لیے ڈاکٹر کی طرف پُر امید  
نظروں سے دیکھ رہے تھے صوفیہ کو تو جیسے سکتے ہو گیا  
تھا۔ راحیلہ بہن کو دلاسہ دے رہی تھیں۔

”آخر اسے ہو کیا گیا ہے“ صبح تک تو ٹھیک  
تھا۔“ وہ ہراساں بہن کو کہہ رہی تھیں۔

”لوگوں ہے اسے گرمی دیکھ رہی ہیں آپ کیسی  
برس رہی ہے آسان سے“ سن اسٹروک جھپتی ہیں نا  
آپ۔“ مگر وہ سن کہاں رہی تھیں آنسو بے آواز  
آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ راحیلہ ان کا ہاتھ



تھام کر نزدیک ہی بیٹھ گئیں تھیں۔

شدید گرمی میں آگن بایک دوڑاتا یونیورسٹی سے گھر پہنچا تھا۔ دھوپ کی تپش سے برا حال تھا۔ بایک شیڈ کے نیچے کھڑی کرتے وہ گھر میں اندر کی سمت دوڑا تھا۔ شدید پیاس لگی تھی۔ شامین، نیلم پانی کے لیے بہنوں کو پکارا تھا۔ آواز سن کر شبو کچن سے برآمد ہوئی تھی۔

”سب کہاں ہیں..... گھر میں سناٹا محسوس کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ساتھ ہی فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل بھی نکال لی تھی۔ گلاس اٹھانے کی زحمت گوارا کیے بغیر بوتل منہ سے لگا کر گھونٹ گھونٹ ٹھنڈے پانی سے خود کو تسکین دی تھی سوالیہ نظریں شبو پر مرکوز تھیں۔

”وہ جی بڑی بی بی کے ہمراہ شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔“

”اتنی گرمی میں.....“ زرب لب کہتے اس نے خالی بوتل قریب ہی ڈانگنگ ٹیبل پر دھری، شبو اپنے کام کے لیے واپس کچن کی سمت مڑی تھی۔

”سنو.....“ اس نے آواز دی تھی۔

”جی آگن بھیا.....“ وہ واپس پلٹی تھی۔

”یشاء..... یشاء کہاں ہے؟“

”وہ جی کالج سے آ کر اپنے کمرے میں ہیں۔“

”اچھا.....“ جواب سن کر چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔ آنکھیں محبت کی روشنی سے جگمگانے لگیں تھیں۔ شبو جواب دے کر واپس کچن میں کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اسے یشاء نے کالج سے واپسی کے ساتھ ہی اپنے منہ کے لیے میکرونی قیمہ آرڈر کیا تھا۔ وہ وہی بنانے میں مصروف تھی۔ آگن دبے قدموں یشاء کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے بیڈ روم کا دروازہ

تھوڑا سا وا تھا۔ اندر اسے سی چل رہا تھا۔ یہ یقیناً شبو کی جلد بازی کی وجہ سے کھلا رہ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا، یشاء بیڈ پر آڑھی ترچھی پڑی فون پر کسی سے محو گفتگو تھی۔ دوپٹہ سائیڈ پر دھرا تھا۔

ابھی وہ اندر کی صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ شرارت بھری مسکراہٹ چہرے پر رقصاں تھی کہ استہزائیہ انداز میں یشاء کے منہ سے نکلا اپنا نام سن کر چونکا تھا۔ یشاء اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا اور کان لگا کر سننے لگا۔ یشاء خود ترسی کے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”آگن میں آپ جیسی بات کہاں نظرغام.....“

وہ میری خالہ کا بیٹا ہے بچپن ہی سے ان سے بات طے ہے مگر وہ مجھے گھر کی مرغی دال برابر سمجھتا ہے کبھی جو اس نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہو۔

ادھر سے نظرغام نے نامعلوم کیا کہا تھا۔

یشاء نے اٹھلا کر رخ پلٹا تھا اور آگن سنائے میں رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ انار کی مانند دہک رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں اور آنکھیں آف خدا یا..... کیسی مخمور ہو رہی تھیں اس سے زیادہ دیکھنے کی اس میں تاب کہاں تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایک چھلانگ میں اس نے یشاء کے ہاتھ سے فون چھینا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر حصار کی طرح بنا کر یشاء کو اپنے نزدیک کر لیا تھا۔

”کون ہے یہ نظرغام.....“ انداز بے اندازہ غصیلا اور آتشیں تھا اس اچانک افتاد پر یشاء بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ..... تم بغیر ناک کیے میرے کمرے میں داخل کیسے ہوئے؟“ اس نے کہا ساتھ ہی وہ اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے حصار سے نکلنے کے لیے

”اپنا ہی کام کر رہا ہوں میرے لیے تم سے بڑھ کر آج تک کوئی کام نہیں رہا“ اور ورنہ سے کیا مراد ہے تمہاری کیا کر لوگی تم میرا.....“ تلخ انداز میں کہتے ہوئے اسے گھورا جو کچھ پوچھ رہا ہوں سیدھی طرح اس کا جواب دو کون ہے یہ ظرغام..... اس نے سوال دہرایا تھا یثیاء نے بے چارگی سے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ سرخ آنکھوں سے اُسے گھور رہا تھا۔ اب بتائے بغیر جان نہیں چھپے گی اس نے سوچا۔ شبو پر بھی بے تحاشہ غصہ آیا تھا جو جاتے ہوئے دروازہ ٹھیک سے بند کر کے نہیں گئی تھی۔

”بولو جلدی.....“ اسے خاموش دیکھ کر پھر غرایا۔

”افشائ کا بڑا بھائی ہے۔“ بالآخر اس نے کہہ دیا تھا۔

”ہوں.....“ بہت معنی خیز انداز میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟“

”آپ کون ہیں یہ پوچھنے والے.....“ وہ تڑخ کر بولی تھی۔

”تم بھول رہی ہو میں ہی سب کچھ ہوں پوچھنے والا بہت سالوں قبل ہی تمہارے سارے حقوق میرے نام ہو چکے ہیں۔“

”میں نہیں مانتی..... ان پرانی باتوں کو.....“ وہ نزو ٹھے انداز میں ناک چڑھا کر بولی تھی۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں تمہارے تو اچھے بھی مانیں گے ان پرانی باتوں کو..... سیدھی طرح بتاؤ ورنہ میں اپنی چھوٹی خالہ جان کو کال کرنے لگا ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں

تھامافون آن کرنے کے لیے سامنے کیا تھا۔

”اوہ ماما جان.....“ یثیاء نے سرعت سے

زور لگا رہی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا جو اب آف ہو چکا تھا۔ انگن نے فون بیڈ پر اچھال دیا اور یثیاء کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ہاتھ کے حصار سے وہ وحشت زدہ سی ہو گئی تھی۔ انگن کی سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر خوف بھی آرہا تھا۔

”بیٹھو ادھر.....“ انگن نے اسے زور سے بیڈ پر پٹخ دیا تھا۔

”کون ہے یہ ظرغام.....“

”آپ سے مطلب..... اپنے کام سے کام نہ لیں۔“ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی ارادہ تھا کہ

انگن کے سائیڈ سے نکل کر کمرے سے باہر چلی جائے۔ مگر انگن نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ پٹخ دیا تھا۔

”بیٹھو ادھر اور جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

”آپ بار بار بدتمیزی کر رہے ہیں میرے ساتھ میں خالہ جان کو بتا دوں گی۔ آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔“

”چلو اٹھو..... چلو خالہ جان کے سامنے..... ان کے سامنے ہی پوچھ لوں گا تم سے.....“ انگن نے جارحانہ انداز میں بازو پکڑ کر اسے کھڑا کیا تھا۔

”کیا جنگلی پن ہے.....“ اس کی گرفت کی سختی سے تمللا کر اس نے اپنا بازو سہلایا تھا خالہ جان کے سامنے جا کر پوچھنے پر وہ سراسیمہ ہو گئی تھی۔

انگن کی گہری نظروں نے اس کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ تاڑ گیا تھا تب ہی پھر شیر ہو کر بولا۔

”چل رہی ہو یا پھر امی جان کو یہاں لے آؤں؟“

”آپ اپنے کام سے کام نہ لیں.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

”وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔“

فون اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔  
 ”اب کیا ہوا.....“ سوالیہ نظریں اس پر مرکوز تھیں۔

یشاء نے لمحہ بھر کو سوچ کر کہا اگر آپ انہیں نہ بتانے کا وعدہ کریں تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔“

”کیوں..... شادی کے لیے ان سے بات نہیں کرو گی کیا؟“ انداز بے حد جارحانہ تھا۔  
 ”وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب تک کوئی ترکیب سوچ لوں گی۔“

”تمہاری ترکیب کی تو ایسی کی تھی.....“  
 اگلن نے زیر لب کہا پھر بولا۔

”جلدی پھوٹو.....“ یشاء نے اضطراری اندازی میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیں اور گویا ہوئیں۔

”افشاں کو تو آپ جانتے ہیں نا؟“  
 ”بہت اچھی طرح.....“ اگلن نے دانت چبا کر کہا۔

”میں“ عمارہ آیت ہم سب کو اس نے اپنی برتھ ڈے پارٹی میں انوائٹ کیا تھا۔“  
 ”کس نے..... ظرغام نے؟“ اگلن نے

حیرانگی کے تاثرات کے ساتھ کہا۔ کیونکہ جہاں تک اسے علم تھا یشاء آج تک کبھی گھر سے تنہا نہیں نکلی تھی۔ کہیں بھی آنے جانے کے لیے گھر میں گاڑی موجود تھی اور ہمیشہ گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔ یشاء کے کہیں بھی آنے جانے کی ذمہ داری زیادہ تر اگلن کو اٹھانا پڑتی تھی۔ سو اس کی حیرانگی بے جا نہ تھی۔

”ظرغام نے نہیں..... افشاں نے اپنی برتھ ڈے پر سب کو انوائٹ کیا تھا۔ وہیں ظرغام سے تعارف ہوا تھا۔“ بالآخر اس نے بتا دیا تھا۔

”پھر.....“  
 ”پھر کیا؟ انہوں نے مجھے دوستی کی آفر کی تھی جو میں نے قبول کر لی۔“  
 ”اور کچھ.....“ اگلن نے خشکی سے اسے گھورا۔

”کیا مطلب.....“ اس نے خائف ہوئے بنا ہی اس کی سمت دیکھا۔ اُف خدایا کیا تھا ان نظروں میں وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکی تھی۔

”مطلب یہ کہ صرف ٹیلیفونک دوستی ہے یا پھر باہر ملنا ملنا بھی ہے اس سفید ریچھ سے.....“  
 اگلن نے نفرت سے پوچھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے.....“ اس کے انداز پر وہ چیخ اٹھی۔

”ابھی خود ہی تو داستان دوستی سنا رہی تھیں پھر میرا انداز برا کیوں لگا.....“ ویسے دوستی کی آفر تو میں بھی کرتا ہوں تمہیں پھر میں کیوں نہ پسند آیا تمہیں.....“ اگلن اس کے نزدیک ہوتے ہوئے بولا۔ انداز بے ہودہ تھا۔

”دور نہیں..... مجھ سے مجھے معلوم تھا کہ سب کچھ جان کر جلیسی سے آپ کا بھی حال ہونا ہے۔“ یشاء تڑخ کر بولی تھی۔

”اس سفید ریچھ میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں.....“ اس کے وارن کرنے کے انداز کو نظر انداز کرتا اس کی سمت بڑھا۔

”پیچھے نہیں..... ورنہ.....“ یشاء اس کے انداز دیوانگی پر سر اسیمہ ہوئی تھی۔

”ورنہ کیا کر لو گی تم میرا..... ہاں..... کیا لگاڑ سکتی ہو..... میرا تلخ انداز میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے یشاء کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا تھا وہ سنہلے، سنہلے بھی اس کی گرفت میں آگئی تھی۔ پھر وہ کچھ ہوا جو یشاء کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس کا سر



کی سائیڈ ٹیبل پر بیٹھ دی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا پھر بددی سے الماری سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم کا رخ کیا تھا۔ ہاتھ لیتے ہوئے اسے کمرے کے دروازے پر ناک کی آواز آئی تھی کچھ دیر دروازہ بچتا رہا پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ اپنا حلیہ درست کر کے وہ کمرے سے باہر آئی تھی۔ ادھر ادھر نظریں دوڑاتی وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتی آگے بڑھی تھی تب ہی نیلم سے ٹکرائی۔

”کہاں تھی تم..... دروازہ ناک کرتے کرتے میرے ہاتھ تھک گئے۔ چہرہ انداز سب بے انتہا پریشانی کا غماز تھے۔

”کیوں؟ اس طرح کیوں پوچھ رہی ہو ہاتھ لے رہی تھی۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔  
 ”بھائی کو سن اسٹروک لگی ہے۔ ابھی ایسبولینس کال کر کے ماما پاپا انہیں ہاسپٹل لے گئے ہیں۔ میں بھی جا رہی ہوں عمار گاڑی لے کر آنے والے ہیں۔ میں نے انہیں بھی کال کر دی ہے خالہ جان کو فون کر دی ہے وہ آفس سے ہی ہاسپٹل پہنچ رہی ہیں تم میرے ساتھ چلو۔“ نیلم نے تفصیلات بتاتے بتاتے اسے آفر کی تھی۔

”نہیں تم جاؤ میں شبو کے ہمراہ گھر پر ہی ہوں گھر اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔“ اسی وقت حماد کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ نیلم تیزی سے گھر سے باہر نکلتی چلی گئی۔

”سمگلر نے مجھ پر کیسا ستم ڈھادیا اور اب بیمار خود پڑ گئے۔“ یثاء نے سوچا پھر مرے قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ تب ہی شبو کھانے کے برتن واپس لینے آئی تھی۔ ٹرے بھری ہوئی پونہی پڑی تھی اور یثاء ویران صورت لیے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

تیزی سے گھوما تھا وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچلی تھی۔ مگر انگن پر وحشت سوار ہو چکی تھی۔ اس کے اندر کا شیطان بیدار ہو چکا تھا۔ جس نے یثاء کی ذات کے پرینچے اڑا دیے تھے۔ وہ رو رہی تھی ہاتھ جوڑ رہی تھی مگر سب کچھ بے کار گیا تھا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے انتہائی زہر خند انداز میں اس نے کہا تھا اب اس سفید ریچھ کو فون کرو ذرا اور میری اس واردات کا بتاؤ پھر تمہیں اس کی دوستی کا مطلب پتہ چلے گا۔“ کہتے ہوئے دھڑ سے دروازہ وا کیا اور ادھر ادھر دیکھنے بنا اپنے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

یثاء پیچھے سسکتی رہ گئی تھی۔ نفرت کا ایک آلاؤ اسے انگن کے لیے دل میں محسوس ہوا تھا۔

”میری اتنی اچھی دوستی کو تم نے کس انداز میں لیا انگن میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ ”کبھی بھی نہیں.....“ اس نے دل ہی دل میں کہا اس وقت شبو کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر چونکی۔

”آپ کو کیا ہوا.....“ یثاء بی بی حیرانگی سے کہتے ہوئے اس کی اجڑی صورت اور ابتر حلیے کا جائزہ لیا تھا۔

”کچھ نہیں تم نے اتنی دیر کیوں کر دی میرے لہجے میں بھوک سے میرا برا حال ہے۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے ٹرے پھینکی۔

”وہ جی..... میں.....“ شبو جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ کھانے کی سمت متوجہ ہو چکی تھی شبو نے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ کن آنکھوں سے سے جائزہ لیتی یثاء اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی اپنے چکراتے سر اور بے جان ہوتے وجود کے ہمراہ اٹھی تھی۔ دروازہ لاک کیا لہجے کی ٹرے اٹھا کر بیڈ

پوچھ چکی ہیں کہ یشاء کیوں نہیں آئی۔“ ماما کا برہم انداز برقرار تھا۔

”پھر کیا کروں ماما جان.....“ وہ بے چارگی سے پوچھنے لگی۔

”تم لنچ وغیرہ سے فارغ ہو میں ایزو کو بھیجتی ہوں تمہیں لینے کے لیے۔“

”جی بہتر.....“ ماما جان کے کال آف کرنے پر اس نے فون پیڈ پر منہ دیا۔

”جہنم میں جاؤ تم اگلن.....“ اس نے فون کو گھورتے ہوئے کہا۔ جب ہی شبو چائے کا گمگ

لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرف متوجہ ہو گئی چائے پی کر وہ فارغ ہوئی تھی کہ شبو نے آ کر بتایا۔

”بی بی ایزو صاحب آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”اچھا.....“ وہ پرس اٹھا کر موبائل اس میں رکھتی شبو کے ہمراہ ہی کمرے سے نکل آئی۔

”تم گھر کا خیال رکھنا معلوم کہ ہمیں واپسی میں کتنی دیر ہو جائے۔“ اس نے شبو کو ہدایت کی

اور ایزو کے ہمراہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ راحیلہ اور صوفیہ دونوں بہنیں تھیں۔ راحیلہ بیوہ تھیں ان کی

ایک ہی بیٹی بھی یشاء جبکہ صوفیہ کے تین بچے تھے۔ اگلن، شامین، نیلم ان کے شوہر معظم گورمنٹ ملازم

تھے۔ شوہر کے انتقال کے جب راحیلہ کو ان کا بزنس سنبالنا پڑا تو یشاء کی کم سنی کی وجہ سے انہیں

بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ اپنے بہنوئی معظم سے

درخواست کر کے انہیں بچوں کے ہمراہ اپنے گھر کے سیکنڈ فلور پر رہائش کے لیے رضامند کر لیا۔

بہن کے گھر آ جانے سے انہیں بہت سہولت ہو گئی تھی اور یشاء کو بھی تنہائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا

”یشاء بی بی..... کھانا نہیں کھایا آپ نے.....“ اس نے ٹرے اٹھائی۔

”اتنی دیر لگا دی تھی تم نے بھوک ختم ہو گئی میری.....“ یشاء نے پر مڑ دگی سے کہا پھر کچھ سوچ کر اس سے پوچھنے لگی۔

”اگلن کو کیا ہوا ہے شبو.....“

”بہت تیز بخار چڑھا ہے جی انہیں ہوش ہی نہیں تھا آپ نے آوازیں نہیں سنیں تھیں۔ شبو

نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ اب وہ اُسے کیا بتانی کہ گزشتہ دو گھنٹے میں اس پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی

ہے۔ اگلن کے تو نام سے ہی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”نہیں میں نے کوئی آواز نہیں سنی میں باتھ روم میں تھی۔ تم ایسا کرو مجھے جائے بنا دو سر میں

بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے سنبھل کر کہا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سامنے اس کے منہ سے اگلن سے متعلق کچھ نکل جائے۔

”جی اچھا بی بی.....“ شبو اثبات میں سر ہلاتی ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ خالی

الذہنی سے سائیڈ میں بے موبائل کو گھورنے لگی۔ تب ہی موبائل کمرے کے سنائے میں سر بکھیرنے

لگا تھا۔ یشاء نے چیک کیا کال ماما جان کی طرف سے آرہی تھی۔ اس نے ریسیور کا بٹن پیش کر دیا۔

”کہاں ہو تم..... نیلم کے ہمراہ کیوں نہیں آئیں۔ کال ریسیو ہوتے ہی ماما جان کی برہم

آواز آئی تھی۔“ وہ ماما جان میں ابھی تو کالج سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ ابھی تو میں نے لنچ بھی نہیں کیا تھا پھر گھر

پر کون ہوتا؟ بس اسی وجہ سے.....“ وہ منمنائی تھی۔

”جانتی ہو اپنی ہونے والی ساس کو..... کئی بار

تھی۔

”محترمہ کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ ہاسپٹل آ گیا ہے۔“ ایزو نے اس کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔

”اوہ.....“ وہ چونکی اور گاڑی کا ڈور کھول کر باہر آ گئی پھر ایزو کی ہمراہی میں ہی وہ ہاسپٹل کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”کہاں رہ گئی تھیں؟ تمہیں اپنی خالہ جان کے ہمراہ ہونا چاہیے تھا۔“ ممانے اُسے دیکھتے ہی برہمی سے کہا۔ ان کی بات سن کر ایک سٹریٹ مسکراہٹ ان کے لبوں پر دوڑ گئی تھی۔ اگر ممانہ ان کی کو پیٹ لگ جائے کہ موصوف چند گھنٹوں قبل ان کی اکلوتی بیٹی پر کیا قیامت ڈھا چکے ہیں۔ تب ان کا بی ہویکیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ پھر جواب میں کچھ کہے بنا ان کے ہمراہ فیلڈ کے دیگر ممبران کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”ارے تمہیں کیا ہوا یثاء بیٹا..... ابھی ٹھیک ہو جائے گا اگلن اس قدر ٹینشن نہیں لیتے بھئی.....“ خالو جان کو نہ جانے اس کے چہرے پر کیا نظر آیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ مگر خالہ جان نے ان کی بات پر چونک کر یثاء کی سمت بغور دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے نزدیک بٹھالیا تھا۔

”یثاء تم یہاں بیٹھو میرے پاس.....“ انہوں نے کہا اور وہ خاموشی سے جا کر ان کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ چار گھنٹے کے طویل ترین انتظار کے بعد دو ڈاکٹر زباہر آئے تھے۔

”اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ مگر ابھی احتیاطاً وہ مزید کچھ وقت انڈر آ بزررویشن رہیں گے پھر انہیں وارڈ میں منتقل کیا جائے گا۔“ ڈاکٹر ز نے مرثہ جاں فراسنا یا تھا۔ خالو جان نے وہیں سجدہ شکر ادا کیا۔ خالہ جان کی بہتی آنکھوں

تھا۔ وہ ان کے تینوں بچوں سے چھوٹی تھی۔ ان کے بچوں کے ہمراہ ہی اسکول سے واپس آ کر وہ انہی کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ ڈرائیور پہلے یثاء کو اسکول سے پک کرتا پھر ان تینوں کو یوں سب ساتھ ہی آتے جاتے تھے۔ راحیلہ بزنس کی مصروفیات کے بعد تمام وقت یثاء کو ہی دیتیں تھیں۔

ایک ہی تو بیٹی تھی ان کی سونا زونم سے پرورش پار ہی تھی۔ صوفیہ مکمل ہاؤس وائف تھیں گھرداری اور بچوں کی پرورش ان کی ذمہ داری تھی۔ دونوں اپنی زندگی سے مطمئن تھیں۔ یثاء بچپن ہی سے اگلن سے منسوب تھی۔ جبکہ شامین کو دو سال قبل اس کی پھوپھی نے اپنے بیٹے ایزو کے لیے پسند کر لیا تھا۔ صوفیہ نے گھر میں ہی چھوٹی سی تقریب اریخ کر کے اس رشتے کو پکا کر لیا تھا۔ جبکہ نیلم کے لیے اس کے ماموں اپنے بیٹے عماد کے لیے امیدوار تھے اور ابھی صرف زبانی بات چیت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ کیونکہ یہ دنوں ابھی زیر تعلیم تھیں۔

اگلن دل میں یثاء کے لیے محبت سے بھرپور جذبات رکھتا تھا۔ مگر اب اظہار کے معاملے میں اس کے پاس لفظوں کا کالج تھا۔ جبکہ کالج جوائن کرنے کے بعد سے یثاء کے مزاج میں بہت تبدیلی آ گئی تھی، کالج میں اوٹ پٹانگ لڑکیوں کے فرضی فیانسس اور اور ان کی محبتوں کے جھوٹے قصے سن کر وہ اگلن سے بھی وہی امیدیں لگائے بیٹھی تھی۔ مگر اگلن کا مزاج دوسرا تھا۔ وہ زندگی سے بڑھ کر اسے چاہتا تھا مگر ابھی اس نے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ افشاں کی برتھ ڈے پر اس کے بھائی نے دوستی کا آغاز ہوا۔ اور وہ اپنے دل کی ہر بات ظرغام سے شیر کرنے لگی

مسکراہٹ بہت بھیجی بھیجی سی تھی۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ دورانق پر آگ برساتا سورج اب اپنے سفر کی آخری منزل طے کر رہا تھا۔

”جائے.....“ شامین کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور کچھ کہنے بنا کپ تھام لیا۔ حالانکہ سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ دوپہر کو شاپنگ کے دوران انہوں نے ایک اسٹال سے برگر کے ساتھ کوئلڈ ڈرنک لے لیں تھیں۔ مگر یثاء تو بالکل بھوکی تھی۔ شامین ایسا کرو بیٹا جائے پی کر تم نیلم کے ہمراہ گھر چلی جاؤ۔ شبو نے کھانا تیار کر رکھا ہے۔ میں نے اسے فون پر کہہ دیا تھا باجی کے ہمراہ کھانا لے کر واپس آ جانا۔“ خالہ جان نے کہا۔

”جی بہتر امی جان.....“ شامین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں بھی چلتی ہوں تمہارے ہمراہ.....“ یثاء جلدی سے بولی تھی۔

”ہوں یہ ٹھیک ہے۔ شامین کھانا لے کر بھائی جان کے ہمراہ اپس آ جائے گی اور تم دونوں گھر پر رک جانا۔“ ماما جان نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔ ابھی ایزو اور عماد کے پیرنٹس کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ بھی آرہے ہیں ممانے خالہ جان کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے کہا اور وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی پرس اور موبائل تھام کر دونوں بہنوں کے ہمراہ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ جہاں معظم صاحب ان کے منتظر تھے۔

☆.....☆.....☆

خالہ جان مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔ آفلن کو ہسپتال سے آئے ہوئے دو روز ہو گئے تھے۔ وہ ابھی بیڈریسٹ پر تھیں۔ تب ہی یثاء اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ آفلن

سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ شامین اور نیلم ایک دوسرے سے لپٹ کر خوشی سے رو پڑیں تھیں۔ خالہ جان نے پیار سے یثاء کو خود سے لپٹا لیا تھا اور ماما جان شامین اور نیلم کے آنسو صاف کرتے ہوئے خود بھی غم آنکھوں سے مسکرا پڑی تھیں۔ ایزو اور عماد نے آگے بڑھ کر سجدے میں پڑے معظم صاحب کو کاندھے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ پھر ان سے لپٹ گئے تھے۔

”خدا کا شکر ہے انکل۔“ ایزو نے دھیرے سے کہا اور معظم صاحب نے مسکراتے ہوئے آنکھوں سے غمی صاف کی تھی۔ ان سب کے لیے کتنا اہم تھا آفلن ایک صرف وہ تھی جو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی دل و دماغ ہر سوچ سے جیسے خالی ہو گیا تھا۔ اگر میں انہیں آفلن کی خود کے ساتھ کی جانے والی حرکت کے بارے میں بتا دوں تو کیا یہ سب یقین کر لیں گے..... اگر نہیں تو پھر میں اور میری تنہا ماما کیا کریں گی وہ تو اپنی بہن ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہیں۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس کی نظریں ماما جان پر ٹھہر گئیں تھیں۔ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا یا کچھ اور..... ماما جان جو شامین اور نیلم کے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ یکلخت بے چین ہو کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں کیا تھا وہ ہول کر اس کے نزدیک چلی آئیں۔

”کیا ہوا یثاء بیٹا..... ریلیکس اب تو آفلن ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اس کے برابر کھی چیئر پر بیٹھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ یثاء کے اندر کاسناٹا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہ بھی میری کیفیت کا سبب آفلن کا حال احوال سمجھ رہی ہیں۔ اس نے سوچا پر سر جھٹک کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ماما جان کی سمت دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ مگر یہ

آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اس کی آواز پر یکدم اس نے آنکھیں کھولیں تھیں۔

”ہاں کہو یثاء بیٹا میں سن رہی ہوں۔“ وہ وارڈ روب کھولے کپڑے ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔ مصروف انداز میں بولیں۔ آگن نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ عجب اجڑی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ مگنجا لباس، اگھے بال، زرد چہرہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں یہ یثاء ہے وہ چونکا تھا۔

”ابھی آپ مصروف ہیں میں پھر آ جاؤں گی۔“ یثاء کہنے کے ساتھ مڑی تھی۔

”ہاں بیٹا مصروف تو ہوں مگر کیا ضروری بات کرنا ہے۔“ انہوں نے اسی مصروف انداز میں پوچھا۔

”مجھے آپ سے آگن کی شکایت کرنا تھی۔“ وہ تلخ انداز میں بولی تھی۔

”اچھا..... وہ مسکرائیں کیا پھر لڑائی ہوئی ہے دونوں میں..... مگر آگن تو ہفتہ بھر سے بیمار پڑا ہے کہنے کے ساتھ ہی وہ یثاء کی سمت دیکھنے لگیں۔ آگن کی ساری حیات الارٹ ہو گئیں تھیں۔ اگر اس نے امی جان کو بتا دیا تو..... یہ خیال آنے کی دیر تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا شکایت کرنا ہے میری امی جان سے.....“ اس کی آنکھوں میں واضح سرزنش تھی خاموش رہنے کی..... یثاء نے دیکھا مگر نظر انداز کر دیا تھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں خالہ جان کو کیا بتانا چاہتی ہوں۔“ وہ بغیر متاثر ہوئے بولی تھی۔ آگن کی جان پر بن گئی تھی یثاء کے انداز میں کچھ تھا۔ وہ اپنی مصروفیت چھوڑ کر پوری طرح اس کی سمت متوجہ ہو چکی تھیں۔

”ہاں کہو بیٹا.....“

”وہ خالہ جان بات دراصل یہ ہے کہ.....“ اس نے اضطرابی انداز میں انگلیاں مروڑیں کچھ دیر سوچا گویا لفظ جمع کرنے لگی ہوں۔

”یثاء تم جاؤ اپنے کمرے میں، میں امی جان کو خود بتا دوں گا۔“ اس نے تنبیہ آمیز انداز میں کہا۔

”ایسی بھی کیا بات ہے صوفیہ نے دونوں کو حیرانگی سے دیکھا۔ لگتا ہے دونوں کے درمیان زبردست لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔“ انہوں نے اندازہ لگایا۔

”کوئی لڑائی نہیں ہوئی ہے امی جان..... یہ ایسے ہی خواہ مخواہ..... یثاء تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس نے پھر کہا۔

”میں خالہ جان کو بتائے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے بے چک انداز میں کہا۔

”اچھا پھر تم میرے کمرے میں چلو..... یہاں یہ بات نہیں کرنے دے گا۔“ انہوں نے آگن کو گھورا اور ساتھ ہی یثاء کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں آ گئیں پیچھے آگن سر تھام کر رہ گیا تھا۔

”اب کہو..... انہوں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ابھی یثاء کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ دروازہ پر کھٹکے کی آواز پر دونوں چونکیں تھیں۔ آگن دروازے میں کھڑا ملتیانہ انداز میں یثاء کو دیکھ رہا تھا۔

”پلیز یثاء اسٹاپ اٹ.....“

”ایسا کیا ہو گیا تم دونوں کے درمیان.....“ آگن کے انداز پر وہ ہنسی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں بہتر ہے کہ آپ اپنی حرکت کے متعلق

میں پریشانی کیوں محسوس ہو رہی ہے تمہیں؟“ وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی منہ پھٹ کر کہہ دیا۔  
 اگلن نے غصہ بھری نظروں سے اسے دیکھا نہ معلوم کہ برداشت کی کس حد سے گزر کر اس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا۔

”رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔“ کنٹرول کرتے کرتے بھی طنزیہ جملہ منہ سے پھسل گیا تھا۔  
 ”اور بل جائے گا بھی نہیں رسی کا یہی بل تمہارے گلے کا پھندا بن جائے گا اگلن، تم سے ڈرنے والی ہرگز نہیں ہوں۔“

”دخل سے میری بات سنو یشاء میں اپنی امی جان کو اس بات سے آگاہ کر کے انہیں دکھ نہیں دینا چاہتا نہ معلوم کہ کونسی منحوس گھڑی تھی جو میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور کنٹرول کھو بیٹھا اور ان کو بتانے کا فائدہ بھی نہیں ہے وہ فوراً تمہاری مجھ سے شادی پر بضد ہو جائیں گی جبکہ تم تو ظرغام.....“ ابھی وہ کچھ اور کہتا دروازے پر تک کی آواز سن کر دونوں چونکے تھے۔ اس کی توجہ خود پر سے ہٹنے پر موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یشاء نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ وا کر دیا تھا۔ خالہ جان کمرے میں داخل ہوئیں انہیں اگلن کو دیکھ کر چونکیں۔

”تم یہاں..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بہت چھبتا ہوا انداز تھا ان کا.....

”مجھے دھمکیاں دینے اور ڈرانے آئے ہیں۔“ یشاء ان کے پیچھے چھپتے ہوئے بولی۔

”بے وقوف لڑکی خاموش ہو جاؤ ورنہ.....“  
 ”ورنہ کیا کر لیں گے میرا اب.....“ خالہ جان کو سامنے پا کر وہ شیر ہو گئی تھی۔

”یشاء ادھر بیٹھو آرام سے مجھے ذرا اس سے بات کر لینے دو۔“ انہوں نے یشاء کو بیڈ پر بٹھایا

اپنی امی جان کو خود بتا دیں وہ پھر مجھے ماما جان کو بتانا پڑے گا اور میں نہیں چاہتی کہ خالہ جان میری ماما کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔“ اس کی بات پر صوفیہ دل دھک سے رہ گیا تھا۔

”اگلن تم اپنے کمرے میں جاؤ مجھے بات سننے دو اس کی..... آخر ایسی کیا بات ہے۔“ انہوں نے اگلن کو غصے سے گھورا تھا۔ یشاء اس اثناء میں کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ پورے گھر میں سناٹا تھا۔ راحیلہ حسب معمول اپنے آپ فس معظّم صاحب اپنی ڈیوٹی پر اور شامین، نیلم کالج گئی ہوئی تھیں۔ شبو بچن میں مصروف تھی اپنے کمرے میں آ کر وہ دھپ سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

خالہ جان کو بتانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی خالہ جان کی منتظر تھی تب ہی اگلن دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”تم بغیر ناک کیے میرے کمرے میں داخل کیسے ہوئے اور خالہ جان کہاں ہیں؟“ نفرت انگیز انداز میں ایک غراہٹ تھی جو یشاء کے منہ سے نکلی تھی۔

”تم پہلے مجھ سے تو بات کر لو بعد میں خالہ جان کو دیکھ لینا.....“ اگلن نے سخت غصے کے عالم میں بہت سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے بیڈ پر دھکیلا تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں اگلن اپنی حد میں رہو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ وہ چیخ پڑی تھی۔

”تم سے برا ابھی بھی کوئی نہیں ہے یشاء صاحبہ.....“ اگلن نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھ کر کہا۔

”اگر ایسی ہی بات ہے تو خالہ جان کو بتانے

اور اگلن کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اب بتاؤ تم کیا بات ہے..... کیا ہوا ہے تم دونوں کے درمیان..... یاد رکھو اگلن میں سچ سننا پسند کروں گی۔“

”ٹھیک ہے امی جان آپ اپنے کمرے میں چلیے میں آپ کو سب سچ بتاتا ہوں۔“ یثاء کو خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے وہ ماں کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”اچھا چلو.....“ وہ بے چارگی سے کہتے ہوئے اس کے ہمراہ یثاء کے کمرے سے باہر نکلیں تھیں۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ لفظوں کا کال پڑ گیا تھا ماں کے سامنے اپنے کردار سے پردہ اٹھانے سے.....

”میں منتظر ہوں اگلن.....“ امی جان کی آواز پر ان کی سمت دیکھا تھا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے امی جان.....“ ماں کے سامنے سر جھکا کر شرمندگی سے اعتراف کیا تھا۔

”امی جان وہ غلطی جاننا چاہتی ہیں بیٹا.....“ صوفیہ نے نرم آواز میں کہتے ہوئے لفظوں سے اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ تب دھیرے دھیرے ظرغام کا نام لیے بنا اس طرح کہ الزام کا سہرا خود کے سر پر ہاتھ کچھ جوڑ توڑ کر کے دھیرے دھیرے اگلن نے تمام ماجرا کہہ سنایا تھا۔

”میں صرف شرارت کر رہا تھا امی جان مگر یثاء کی زبان کی وجہ سے خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔“ صوفیہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی تھیں بات وہ بھی جو وہم و گمان میں بھی نہ تھی اپنی بات کہہ کر اگلن خاموش ہوا تھا۔ تب ہی صوفیہ کا ہاتھ اٹھا اور اگلن کے چہرے پر نشان بنا گیا تھا۔

”بدنیز یہ تربیت کی ہے میں نے تمہاری“

ساری اخلاقی، مذہبی، معاشرتی حدود پامال کر کے اب کس طرح میرے سامنے سر جھکائے بیٹھے ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ راحیلہ کے سامنے میری کیا عزت رہ جائے گی۔ کس طرح سراٹھا کر میں اس کے سامنے بات کر سکوں گی۔“ اگلن چہرے پر ہاتھ رکھے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

”معاف کر دیں امی جان..... پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ اسے اس طرح کہتے دیکھ کر صوفیہ کے دل میں مامتا نے سرا بھارا تھا مگر وہ ہنوز سختی سے بولیں۔

”میں معاف کر بھی دوں تمہیں تو یثاء؟ یثاء تو کبھی معاف نہیں کرے گی، غلطی اتنی بڑی کی ہے تم نے جس کا کوئی مداوا ممکن نہیں ہے پھر راحیلہ کو اگر یہ سب پتہ چلا تو پھر.....“ بہن کا خیال آنے پر وہ سرعت سے اٹھ کر یثاء کے کمرے کی سمت بڑھی تھیں۔ یثاء بیڈ پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی تھی آہٹ پر ہاتھ ہٹا کر دیکھا اور خالہ جان کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آنسو بے آواز رخساروں پر گر رہے تھے جنہیں وہ دوپٹے کے پلو سے رگڑ رہی تھی۔ صوفیہ شرمسار انداز میں اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”میں بہت شرمندہ ہوں یثاء گو کہ اگلن نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا اس کا مداوا تو ممکن نہیں ہے مگر بیٹا میری عزت اب تمہارے ہاتھ میں اگر تم نے یہ سب راحیلہ کو بھی بتا دیا تو میں بھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکوں گی۔ میری عزت رکھ لو یثاء..... امی ماما جان کو کچھ مت بتانا کچھ مت کہنا ان سے..... بس مجھ سے یہ وعدہ کر لو بیٹی میں آج ہی تمہارے خالو جان سے اس بابت بات کروں گی مگر بیٹا تم اپنی ماما جان سے کچھ مت کہنا۔“

”اگلن تمہارے ابو جی بلا رہے ہیں۔“  
کمرے میں پہنچ کر بیٹے کو اطلاع دی ابو جی کا سن  
کر اگلن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

”امی جان کیا آپ نے انہیں بھی بتا دیا  
ہے؟“ اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے پوچھا۔  
”بالکل بتا دیا ہے اور بتانا ضروری بھی تھا۔“  
انہوں نے کہا۔

”اب میں ان کا سامنا کیسے کروں۔“ اگلن  
کے انداز میں بے چارگی تھی۔

”ابو جی کا سامنا تو کرنا پڑے گا۔ چلو جلدی  
آؤ ورنہ وہ غصے میں تم سے بھی زیادہ آؤٹ آف  
کنٹرول ہیں۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔“  
کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلیں تھیں اگلن ان  
کے پیچھے تھا باپ کا سامنا کرنے سے وہ بہت  
ہراساں تھا۔

”یہ میں کیا سن رہا ہوں اگلن.....؟“ اس  
کے کمرے میں پہنچتے ہی ابو جی کی گرجدار آواز  
میں کہا۔ صوفیہ نے ان کی آواز سے گھبرا کر جلدی  
سے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ ان کے سامنے  
ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”ابو جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔“ بہت اٹک  
اٹک کر باپ کے سامنے اعتراف جرم کیا تھا۔  
”بدتمیز نا نجار، ہم جیسے شریف اور معزز لوگوں  
میں تو کہاں سے شامل ہو گیا۔“ انہوں نے اگلن کو  
مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ صوفیہ آڑے  
آگئیں۔

”کیا کرتے ہیں..... اپنی غلطی پر نادم تو ہے نا  
یہ.....“

”وہ غلطی..... بہت خوب صوفیہ بیگم بن باپ کی  
بچی ہے وہ..... یاد ہے اس کی تنہائی اور میری بے  
گھری کا احساس کرتے ہوئے راحیلہ ہمیں

انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔  
”پلیز خالہ جان آپ مجھے شرمندہ نہ  
کریں۔“ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے  
تھے۔

”اتنی بڑی افتاد ٹوٹ پڑی تم پر اور ہم سب  
بے خبر ہی رہے بس تم مجھ سے وعدہ کر لو ماما جان کو  
کچھ بھی نہ کہنے کا یثاء۔“ وہ سچی انداز میں کہہ رہی  
تھیں۔ یثاء کا دل کا نپا تھا اگلن کی ماں ہونے کے  
ناتے وہ احساس گناہ سے لرزیدہ تھیں۔

”جی خالہ جان میں آپ سے وعدہ کرتی  
ہوں ماما جان کو کچھ نہیں بتاؤں گی، مگر وہ  
اگلن.....“

”شکریہ بیٹا تم نے اپنی خالہ جان کا مان  
رکھا۔ اور اگلن کی فکر مت کرو میں اس کا سایہ بھی تم  
پر نہیں پڑنے دوں گی جب تک کہ راحیلہ کو جلد از  
جلد شادی کے لیے رضامند نہ کر لوں۔ ان کی  
بات پر جہاں یثاء خاموش ہو گئی تھی وہیں اس کے  
کمرے سے باہر کھڑے ان کی گفتگو سنتے اگلن  
نے اطمینان بھری سانس لی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈنر کے بعد جب معظم صاحب آرام کے  
لیے لیٹے تو صوفیہ نے دھیرے دھیرے انہیں  
سب کچھ بتا دیا۔

”دماغ درست ہے تمہارا وہ سنتے ہی سیخ پا  
ہو گئے تھے بلاؤ ذرا اسے.....“

”آرام سے معظم راحیلہ گھر پر ہی ہے  
آوازوں سے کہیں اس طرف متوجہ نہ ہو جائے  
آپ اپنا غصہ کنٹرول میں رکھیں۔“

”آپ کو مجھے ایڈوائس دینے کی ضرورت  
نہیں بلائیں اسے میرے سامنے.....“ ان کے حکم  
پر صوفیہ جیٹھی سے اٹھیں تھیں۔



خوشخبری ملی تھی مجھے آج مگر گھر آ کر سناری خوشی پر پانی پھر گیا۔“ ان کا مزاج ابھی تلخ بھی تھا۔

”اچھا واقعی.....“ صوفیہ نے شوہر کی دلجوئی کی خاطر نزدیک بیٹھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں کیونکہ یہ اس کا فاسل امیر ہے میں رزلٹ کے انتظار اور درخواستوں کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یہاں اس کی قابلیت کے مطابق جاب کی تلاش میں مزید وقت برباد ہوتا

اس لیے پہلے سے پلاننگ کی ہوئی تھی ہماری اپنی چھت نہیں ہے۔ پھر شامین اور نیلم نصیب کی اچھی

ہیں کتنے خوشحال گھرانوں سے رشتے جڑے ہیں دونوں کے اب ان کو بھی خالی ہاتھ تو رخصت نہیں

کر سکتا تھا۔ اگلن سال دو سال میں کچھ کمالے گا تو ہم دونوں بیٹیوں کو خوش اسلوبی سے وداع کرنے

کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ سوچ تھی میری میں مزید راحیلہ کے احسانوں کا بار نہیں اٹھانا چاہتا مگر

اب یہ نئی افتادہ.....“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آپ فکر نہ مند نہ ہوں میں خود راحیلہ سے بات کر لوں گی اس بارے میں۔“ صوفیہ نے

انہیں تسلی دی۔

”کیا بات کر لو گی تم.....“ انہوں نے پوچھا۔

”ہم اگلن کو بیرون ملک بھیجنے سے قبل یشاء سے اس کا نکاح کر دیں گے اور دونوں بیٹیوں کو رخصت کرنے کے بعد یا قاعدہ شادی.....“

”بات کرنے سے قبل سوچ لو بیگم کہیں یشاء اس بات پر رضامند نہ ہوگی تو پھر؟“

”یشاء کی فکر نہ کریں آپ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے اپنی مہمان کو کچھ بھی نہ بتا کر ہماری عزت رکھنے کا.....“ انہوں نے شوہر کو بتایا۔

”اوہ..... شکر ہے خدا کا..... ورنہ میں تو سوچ کر پریشان تھا کہ راحیلہ سے نظریں کیونکر ملا

پُر زور اصرار پر یہاں لائی تھی کہ اتنا بڑا گھر ہے اور ہم دو ماں بیٹی یہ صرف غلطی نہیں ہے پوری فیملی

پر اس نے کالک ل دی ہے۔ راحیلہ کے احسانوں کا یہ بدلہ دیا ہے ہم لوگوں نے..... اور پھر تم تو

بہن ہو اس کی اور پھر خود اس کی بھی تو دو دو بہنیں ہیں۔“ وہ بری طرح اگلن کو لتاڑ رہے تھے۔

ملا مت کر رہے تھے۔

”سوری ابو جی.....“ وہ وہیں بیڈ کے نزدیک کارپٹ پر ان کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”سوری کا بچہ..... دور ہو جاؤ میری نظروں سے..... ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا تمہارے ساتھ

میرے جیسے شریف خون میں تمہارا یہ شیطانی کردار کہاں سے شامل ہو گیا، یعنی حد ہوگی۔“ ان کا غصہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔

”بس کریں اب پانی پیئیں۔“ صوفیہ نے جلدی سے پانی کا گلاس ان کی سمت بڑھایا۔

”اگلن تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ صوفیہ نے بیٹے کو کہا۔

”اسے یہ بھی سمجھا دو کہ اب یشاء سے دور رہے۔“ پانی کا گلاس نظر انداز کرتے ہوئے

انہوں نے پھر اگلن کو گھورا اگلن نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ احساس ذلت

سے دل کا عجب حال تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بیڈ پر منہ اونڈھا کر پڑ گیا تھا۔

”میں نے ابھی کچھ عرصہ قبل ایک جاننے والے سے اگلن کو بیرون ملک ملازمت دلوانے

کے لیے کہا تھا۔ پانی کا خالی گلاس صوفیہ کی سمت واپس بڑھاتے ہوئے معظم صاحب گویا ہوئے

”آج اس نے فون پر بتایا تھا کہ دو تین ماہ تک اگلن کی ملازمت کی بات بن جائے گی۔ اتنی بڑی

سر ہلایا۔ یثاء کے جانے کے بعد شبو کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”تم ہم دونوں کے لیے چائے بنا لاؤ۔“  
 ”جی بیگم صاحبہ.....“ شبو نے ان کا آرڈر سن کر کچن کا رخ کیا صوفیہ ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”میں ابھی تم سے ضروری بات کرنے آئی تھی راحیلہ.....“ صوفیہ دھیرے سے بولیں۔  
 راحیلہ کو ان کے انداز میں غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا۔ وہ بغور بہن کی سمت دیکھنے لگیں۔  
 ”جی کہیے۔“

”تمہارے بھائی نے آج آفس سے آنے کے بعد مجھے بتایا ہے کہ وہ انگن کو بیرون ملک بھیج رہے ہیں۔“

”ہیں.....“ راحیلہ کو سن کر حیرانی ہوئی تھی۔  
 ”مگر کیوں..... یہاں انگن کے لیے کس چیز کی کمی ہے۔“

”کسی چیز کی کمی نہیں.....“ صوفیہ نے بہن کی بات کی تائید کی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے معظم صاحب کا کہا ہوا دہرایا۔

”وہ پہلے ہی تمہارے اس احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں کہ تم نے سالوں سے ہماری بے گھرنی کو پناہ دے رکھی ہے۔“  
 ”ہوں.....“ راحیلہ نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”پھر آپ کیا چاہتی ہیں.....“ سوالیہ نظریں بہن کی سمت اٹھیں تھیں۔

”میں چاہتی ہوں کہ انگن کی روائگی سے قبل ہم یثاء سے اس کا نکاح کر دیں۔ تم تو جانتی ہو آج کل حالات کیا ہیں۔ معاشرہ کس طرح زوال کا شکار ہے۔ اخلاقیات، سماجیات، رسم و رواج“

پاؤں گا۔ یہ تم نے اچھی بات بتائی۔“ انہوں نے صوفیہ کو سراہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر تم بات کر دو پھر آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ معظم صاحب نے انہیں راحیلہ سے بات کرنے کا گرین سگنل دے دیا تھا۔ صوفیہ مطمئن ہوئیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

آج انہوں نے راحیلہ سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ ڈنر کے بعد سب کاموں سے فراغت حاصل کر کے جب سب اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تو وہ راحیلہ سے بات کرنے کی غرض سے نیچے چلی آئیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی لاؤنچ میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ شبو بھی ان کے پاس بیٹھی تھی یثاء انہیں دیکھ کر ٹھٹکی تھی اور خلاف توقع آمد پر راحیلہ بھی چونکیں تھیں۔

”خیریت تو ہے نا صوفیہ باجی.....“ بے ساختہ غیر اختیاری طور پر راحیلہ کے منہ سے نکلا تھا وہ خود بھی اس بات پر اپنی بے اختیاری پر چونکیں تھیں۔

”ہاں بھی خیریت ہے سب اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی ٹی وی کی آواز سے پتہ چلا کہ تم جاگ رہی ہو سو تم سے گپ شپ کرنے چلی آئی۔“  
 انہوں نے خوشگوار انداز میں تفصیلاً کہا۔

”اچھا.....“ راحیلہ ہنسیں۔  
 ”بہت اچھا کیا آئیے بیٹھیے۔“ انہوں نے صوفیہ پر پھیلے پاؤں سمیٹ کر ان کے لیے جگہ بنائی۔

”مما میں سونے جا رہی ہوں۔“ یثاء نے کہا۔

”اچھا.....“ بیٹی کی بات سن کر اثبات میں

کرے۔ بے شک وہ بچپن سے آپ کی ہے اور اس رشتے سے واقف بھی ہے مگر.....“ وہ اپنی بات کہہ کر لمحہ بھر کو خاموش ہوئیں تھیں۔

”میں جانتی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں یہ بات ابھی اگلن کے جانے میں دو تین ماہ ہیں۔ تم میری خاطر اسے وہی طور پر تیار کر لو بس میں اگلن کی روانگی سے قبل یہ کام کرنا چاہتی ہوں اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں نکاح یثاء کی تعلیم پر اثر انداز نہیں ہوگا، وہ جتنا مرضی چاہیے پڑھ سکتی ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہماری طرف سے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے میں سوچتی ہوں کچھ آپ مجھے چند دن کی مہلت تو دیجیے یوں ہتھیلی پر سرسوں جمارہی ہیں۔“ راحیلہ نے ہلکے پھلکے اسٹائل میں کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے تم ہفتہ پندرہ دن کا ٹائم لے لو گھر کی بات ہے۔“ صوفیہ نے جلدی سے کہا اور راحیلہ ان کی بات سن کر ہنس دی تھیں۔

☆.....☆.....☆

آج ’قصر یثاء‘ کی شان ہی نرالی تھی ہر طرف رنگ و نور کی روشنیوں کی جیسے برسات ہو رہی تھی۔ رنگ برنگے، خوشبوؤں میں بسے لہراتے آنچل، خوبصورت چہرے، خوشیوں سے بھرپور قہقہے، ایک گہما گہمی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ آج ’قصر یثاء‘ کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی اگلن سے منسوب ہونے جارہی تھی۔ راحیلہ کافی مصروف تھیں اور ہر ایک سے مبارکباد وصول کرتی جارہی تھیں۔ یثاء اپنی کزنز اور فرینڈز کے ہمراہ پارلر گئی ہوئی تھی۔ گھر پر قریب کے رشتے دار جمع تھے۔ بہت

ثقافت سب اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہیں۔ نکاح سے اگلن ایک خوبصورت رشتے کی قید میں بندھ جائے گا۔ میں ٹھہری گھریلو عورت بیٹیوں کی شادی کے بعد اگلن میری زندگی کا واحد سہارا میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ جوان، خوبصورت ہر طرح کی برائی سے بچا ہوا۔ اگر جو وہ اخلاقی حدود سے عاری ہے راہ روی کے شکار معاشرے میں شادی کر کے کسی لڑکی کو لے آیا تو میں کیا کروں گی۔ بس انہی خدشات کے پیش نظر میں یہ قدم اٹھانا چاہتی ہوں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو کر بہن کو ہنسنے لگیں تھیں۔

”بی بی صاحبہ چائے.....“ شبو کی آواز پر دونوں چونکیں تھیں۔

”ہاں تم رکھ دو ٹیبل پر اور جا کر سو جاؤ۔“ ”جی بہتر.....“ صوفیہ کی بات پر شبو نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹرے ٹیبل پر رکھ کر وہ چلی گئی۔ صوفیہ نے ٹرے سے ایک کپ اٹھا کر بہن کی سمت بڑھایا اور دوسرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر بہن کی سمت متوجہ ہوئیں۔

”یقین کرو جب سے تمہارے بھائی نے مجھے آگاہ کیا ہے میرے دل کو پچھلے لگے ہوئے ہیں۔ خدشات کے باعث نیند آنکھوں سے اچاٹ ہو چکی ہے۔ بیٹیوں کو شان سے بیاہنے کے چکر میں، میں نے بیٹا کھو دیا تو پھر.....“

”آپ ماں ہیں نا، سو یہ حال تو ہونا ہے اکلوتے بیٹے کی دوری کا سن کر راحیلہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ مجھے اگلن سے یثاء کے نکاح پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ ابھی زیر تعلیم ہے اس اچانک فیصلے سے اس کا ذہن ڈسٹرب ہوگا کمسن بھی ہے میں چاہتی تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے سوچ سمجھ کر اگلن کو دل کی رضا سے قبول

اعلیٰ بینکوں ہال بک کروایا گیا تھا۔

اس اثنا میں اگلن بھی اپنے باپ اور کزنز وغیرہ کے ہمراہ برأت لے کر پہنچ جائے گا۔ صوفیہ نے نیچے آ کر بتایا۔

”جی بہتر..... راحیلہ آخری دروازہ لاک کرتے ہوئے بولیں پھر وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے ہمراہ گاڑی میں آ بیٹھیں تھیں۔

”پارلر چلو.....“ راحیلہ نے ڈرائیور کو کہا صوفیہ خوش تھیں ان کی عزت کا بھرم رہ گیا تھا۔ ہر کام خوش اسلوبی سے ہو گیا تھا۔ پارلر سے سب لڑکیوں کو لے کر وہ دونوں بینکوں پہنچیں تھیں۔

یشاء دلہن کے روپ میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ہر طرف رنگوں اور خوشبوؤں کی بہاریں رقصاں تھیں۔ اب صرف اگلن کا انتظار تھا کیمرہ مین مووی میکرا پنا کام کر رہے تھے۔

”صوفیہ باجی فون تو کریں بھائی صاحب کو کہاں رہ گئے۔ گھنٹہ بھر تو ہو گیا ہمیں آئے ہوئے۔“ راحیلہ نے ان سے کہا۔

”ہوں.....“ صوفیہ فون لے کر ایک تنہا گوشے کی سمت بڑھ گئیں کچھ دیر فون پر بات کی پھر مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف واپس آئیں۔

”کچھ دیر میں پہنچتے ہیں راستے میں ہیں۔“ بہن کو بتایا یشاء کی کزنز ان کی بات سن کر اگلن کے استقبال کے لیے دروازے کی سمت بڑھ گئیں۔

کچھ دیر بعد ہی اگلن کی بارات کا قافلہ پہنچ گیا تھا، ہنستے مسکراتے چہروں اور شوخ و شنگ جملوں کے نرنے میں اگلن نے بینکوں میں قدم رکھا تھا دولہا بن کر اس کی بھی شان نزالی تھی کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا کچھ دیر بعد نکاح کی رسم ادا ہوئی اور یشاء کو لاکر اگلن کے ہمراہ بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر فوٹو سیشن کا سلسلہ ڈنر شروع ہونے تک جاری

رہا۔ ”مما میں تیار ہو چکی ہوں۔“

”اوکے بیٹا میں تمہیں لینے آرہی ہوں۔“ بیٹی کو جواب دے کر کال آف کی اور دوسرا نمبر پیش کر دیا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے بہن کی کال وصول کی تھی۔

”لو اب مصروفیت کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ہوتے ہوئے فون پر بات ہو رہی ہے۔“

”جی.....“ راحیلہ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

”صوفیہ باجی یشاء تیار ہو چکی ہے آپ کو کتنی دیر لگے گی؟“

”ہم بھی بس تیار ہیں۔ اگلن کچھ سیلفیز بنوا رہے تم دروازے لاک کرو ہم آ رہے ہیں۔“

”جی بہتر..... راحیلہ نے فون آف کیا اور ڈرائنگ روم میں موجود مہمانوں کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔

”آپ لوگ چل کر باہر کھڑی گاڑیوں میں بیٹھیں ہم بھی آ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی سب مہمان یکے بعد دیگرے گھر سے باہر کی سمت لپکے تھے۔

راحیلہ نے شبو کے ہمراہ دروازے لاک کیے تھے اس اثنا میں صوفیہ بھی نیچے آ چکی تھیں۔

اگلن کو کچھ وقت لگے گا ابھی ہم دونوں لڑکیوں کو پارلر سے پک کر کے بینکوں پہنچے ہیں

اُگلن کی جھنجھلائی ہوئی آواز کانوں میں آئی تھی۔

رہا۔

”خیریت..... گھر پر ہی ہوں اپنے بیڈروم میں اس نے حیرانگی سے کہا اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لاک کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی دل دھک سے رہ گیا تھا۔ پوری فیملی دروازے پر جمع تھی۔ اس کی صورت پر نظر پڑتے ہی ممتیزی سے اندر آئیں تھیں فون آف ہو چکا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو یثاء.....“ انتہائی پریشانی کے عالم میں راحیلہ کے منہ سے نکلا تھا خالہ جان، شامین اور نیلم بھی ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھیں اسے ٹھیک دیکھ کر سب کے چہرے مطمئن ہو گئے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں ماما جان..... دیکھ لیں۔“ اس نے کہا۔

پھر اتنی دیر سے دروازہ ناک کر رہے ہیں ہم لوگ کیا کر رہی تھیں مغرب کی اذانیں کب کی ہو چکی ہیں۔“

”اوہ گاڈ.....“ اس نے کھڑکی سے باہر کی سمت نظریں دوڑائیں ہر سمت رات کی سیاہی چھا چکی تھی۔

”سوری ماما جانی..... میں گہری نیند سو رہی تھی جب ہی دروازہ ناک کرنے پر آنکھیں نہیں کھلیں۔“ اس نے سب کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

”سوئی تو تم ہمیشہ ہی ہو آج دروازہ لاک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ڈرا کر رکھ دیا سب کو.....“ ماما جان نے حلقی سے کہا۔

ان کی بات سن کر یثاء کی نظریں خالہ جان کی سمت اٹھیں تھیں ان نظروں میں کیا پوشیدہ تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں سونفٹریس چرا لگیں۔

”چلو چھوڑو راحیلہ بچہ ہے۔ بے دھیانی میں

راحیلہ نے پوری تقریب میں محسوس کیا تھا کہ یثاء کی خوشی یا مسکراہٹ مصنوعی ہے اور اُگلن کے روئے میں بھی انہیں کچھ بے اعتنائی سی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنا وہم سمجھ کر ٹال رہی تھیں۔ ڈنر کے دوران بھی یثاء کھوٹی کھوٹی سی تھی۔ رات گئے یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی تھی اور بہت دلکش و دلفریب یادوں کے ساتھ مہمانوں کو رخصت کر کے سب لوگ واپس آ گئے تھے۔ پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔

اُگلن کے جانے کے دن قریب آ گئے تھے۔ خالہ جان اُگلن کے سامان کی پیکنگ وغیرہ میں مصروف تھیں۔ یثاء ان کی ہیلپ کر رہی تھی۔

”سب سامان پیک ہو گیا خالہ جان.....“ کام پٹنا کر وہ ان سے گویا ہوئی تھی۔

”ہاں بیٹا سب ہو گیا۔“ صوفیہ نے مطمئن انداز میں کہا۔ اُگلن اپنے دوستوں سے الوداعی ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ آج کالج سے واپس آ کر وہ خالہ جان کی ہیلپ کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ سو تھکاؤ محسوس ہو رہی تھی۔ لہذا اس نے اے سی کی اسپید کم کی کمرے کا دروازہ لاک کیا اور پاؤں پسار کر آرام دہ بستر پر گر گئی تھی۔ جلد ہی نیند کی پری اس پر حاوی ہوئی اور وہ سو گئی نہ معلوم کہ کتنی دیر سوئی تھی۔ موبائل کے ایک تسلسل کے ساتھ سروں پر اس کی آنکھیں کھلیں تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر فون کان سے لگایا۔ کال اُگلن کی طرف سے آ رہی تھی اس دم اضطرابی انداز میں دروازہ بھی ناک ہوا تھا وہ کال ریسیو کرتی دروازے کی سمت بڑھی تھی دوپٹہ کہیں بیڈ پر ہی رہ گیا تھا۔

”کہاں ہو تم.....“ کال ریسیو ہوتے ہی

ایسا ہو گیا ہوگا۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر بہن کو کہا۔

”ٹھیک فرما رہی ہیں آپ بچی ہے ابھی ایک ماہ قبل نکاح شدہ ہو چکی ہے۔ اتنی سی دیر میں خدشات سے میرا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ وہ بہن کی سمت دیکھ کر طنز کر گئیں۔ جبکہ ان کے نکاح شدہ کہنے پر بیٹوں لڑکیوں کی ہنسی نکل گئی تھی۔

”ایم سوری ماما جان آئندہ احتیاط کروں گی۔“ وہ ان کے سامنے کان پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ راجیلہ کو بیٹی پر پیار آیا تھا۔ مگر اس کی ساس نندوں کی موجودگی محسوس کر کے انہوں نے اُسے ڈیٹا تھا۔

”آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ بھلا گھر کے اندر لاک لگا کر سونے کی کیا ضرورت ہے۔ اب جلدی سے فریش ہو کر آؤ میں شبو سے کہہ کر چائے لگوا رہی ہوں۔ وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے ہمراہ وہ تینوں بھی ان کے پیچھے ہی نکلیں تھیں۔ صوفیہ سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھیں یثاء سے وہ جانتی تھیں کہ وہ انگن کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ ان کا کچھ کہنا ماں، بیٹی کے درمیان مناسب نہیں تھا سو خاموشی سے بہو کو ماں کی ڈانٹ سنتے دیکھتی رہیں۔ خدا نے ان کی عزت رکھ لی تھی ان کے لیے یہی بہت تھا۔

ان لوگوں کے کمرے سے باہر جاتے ہی یثاء تیر کی طرح ہاتھ روم لپی تھی۔ فریش ہو کر ابھی وہ بال ہی سنوار رہی تھی کہ شبو چائے کے لیے بلانے آ گئی۔ اس نے برش واپس ڈرینک پر رکھا آئینے میں اپنی شکل پر نظر ڈالتی مسکراتی ہوئی شبو کے ہمراہ ہی کمرے سے باہر آ گئی۔ رات کو ڈنر کے بعد گپ شپ کر کے سب اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ آج دن میں اتنی دیر سونے کی وجہ سے نیند

نہیں آرہی تھی۔ اس نے ریک سے ایک بک اٹھائی دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ پر آ بیٹھی ارادہ تھا کہ کچھ دیر پروین شاکر کی شاعری سے لطف اندوز ہوگی۔ مگر یکدم ہی بیڈ روم کا دروازہ وا ہوا تھا اور انگن کمرے میں داخل ہوا تھا انگن کو دیکھ کر یثاء چونک کر اٹھ بیٹھی اور زہر خندانہ میں بولی۔ کسی کے بیڈ روم میں داخل ہوتے وقت دروازہ ناک کرنا اخلاقیات میں شمار ہوتا ہے اس کے انداز پر انگن نے مخطوط نظروں سے اس کا احاطہ اور بولا۔

”کسی کے نامیرے لیے تم کسی کب ہو؟ تم تو وائف ہو میری سو اخلاقیات بے ضرر چیز ہوئی میرے لیے یثاء اس کے جواب پر جربز ہوئی تھی مگر پھر بولی۔

”اس وقت میرے بیڈ روم میں آنے کا مقصد؟“

”تمہارے حسن کی تعریف میں شاعری کرنے نہیں آیا بلکہ یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آج ایسا کیا ہوا تھا جو اتنی دیر بے خبر سوئی رہیں وہ بھی دروازے کو لاک کر کے..... خیریت تھی؟“

”آپ جیسے اُن میزڈ اور غیر رومانٹک بندے سے مجھے امید بھی نہیں اپنی بیوی سے رومانس جھاڑنے کی اور سونے کے لیے بھی کیا مجھے آپ سے پوچھ کر ٹائم ٹیبل سیٹ کرنا ہوگا۔“ اس کی بات سن کر وہ بھی اسی انداز میں بولی تھی۔

”اچھا یعنی کوئی وجہ نہیں تھی۔“ معنی خیز انداز میں کہا۔

”وجہ..... اچھنبے سے اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”سونے کے لیے بھی وجہ ہوتی ہے یہ مجھے ابھی پتہ چلا ہے۔“

”ہاں تو اور کیا میں سمجھا تھا کہ.....“ اتنا کہہ کر

وہ خاموش ہوا تھا۔ شادی بہت اچھی طرح کر سکتے ہیں آپ، میری

وجہ سے آپ کو تو سب کچھ مفت مل رہا ہے وہ چبا چبا کر بولی تھی۔ اگلن بھنا کر اٹھ گیا۔

”میرے پینٹس تمہاری ماما کے مزید احسانات کا بار نہیں اٹھانا چاہتے اس لیے جاؤں گا تو میں ضرور لیکن تم میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میرے جانے کے بعد تم کہیں تنہا نہیں جاؤ گی ہمیشہ گھر کے فرد میں سے کوئی نہ کوئی تمہارے ہمراہ ہو۔ اور آج کے بعد اس سفید

ریچھ سے دوستی ختم..... اس ضمن میں اگر مجھے پتہ چلا کہ تمہارا اس سے کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ ہوا ہے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ پیپرز کے بعد کچھ گھر داری کے امور سیکھو سمجھیں.....“ اگلن نے ہاتھ اٹھا کر اسے وارن کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آپ سے برا تو اب بھی کوئی نہیں ہے اگلن.....“ اس کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر ڈھسے

گئی تھی کتنا غلط سمجھتے ہیں آپ مجھے..... آپ کو میں اتنی بدکردار اور بد نیز نظر آتی ہوں۔ اتنی بدگمانی ہے آپ کے دل میں تو میرے لیے اتنے خوبصورت بندھن میں بندھ جانے کے باوجود کوئی پیار بھرا جملہ کوئی خوشبو بھری بات کوئی دل دھڑکا دینے والی شوخی کچھ بھی تو نہیں ملا آپ کی طرف سے بدگمانی کا کیسا دکھ آپ نے میرے اندر اتار دیا ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی آپ کی غلط فہمی کو دور نہیں کر پا رہی۔ ظرغام میرے لیے کیا ہے آپ کبھی نہیں جان سکتے بھی بھی نہیں..... انجانے میں اپنا آپ عیاں کر کے اپنی سوچوں کی غلاظت کو مجھ پر انڈیل کر آپ نے خود بہت غلط کر لیا ہے اپنے ساتھ میری محبت تو آپ کے لیے بھرپور چاہت کے ساتھ پاکیزہ ہے جس میں آپ غصے میں ہی سہی اپنی مہر ثبت کر چکے ہیں اب میری انا آپ کی غلط

”کیا سمجھا تھا.....“ یثاء اس کے انداز پر چونکی۔ اس نے گہری نظروں سے یثاء کا جائزہ لیا تھا۔ پھر بولا میں سمجھا کہ دروازہ لاک کر کے ظرغام سے روئیں بگھار رہی ہوگی فون پر.....“ اس اچانک افتاد پر یثاء بوکھلا گئی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے.....“ بے ساختہ منہ سے پھسلا تھا۔

”اب اس بات کا مطلب بھی میں تمہیں سمجھاؤں۔“ وہ پھر طنزیہ انداز میں بولا۔

”میرے جانے میں دو دن ہیں یثاء اس کے بعد تمہیں اس سفید ریچھ سے بات کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ میری بد نصیبی دیکھو کہ ماں کی وجہ سے میں انہیں تمہاری اس حرکت کے بارے میں بتا بھی نہیں سکا ہوں کہ ظرغام کی دوستی کا سن کر میں غصے میں حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں تو ماں کی عزت بچانے کے چکر میں زد میں آ گیا۔ ورنہ تمہارے نزدیک میری ذات آج بھی صفر ہے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ میرے جانے کے بعد تم میری سیدھی سادی ماں کو خوب بے وقوف بنا لو گی عزت کے نام پر..... حالانکہ مجھ سے نکاح کے بعد بھی ظرغام سے تمہارا تعلق ثابت کرتا ہے کہ تم باعزت لڑکی نہیں ہو۔“ وہ چر کے پر چر کے لگا رہا تھا۔

”اسٹاپ اٹ..... بہت سن لیا میں نے اب آپ نے اپنے دماغ سے اندازے لگا رکھے ہیں تو میں کیا کروں اتنی بدگمانی ہے مجھ سے تو مت جائیں بیٹھے رہیں میرے چوکیدار بن کر یثاء بھی بد دماغی میں اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔ ماما کا اتنا بڑا بزنس ہے ایسی شاندار لڑکی سے آپ کا نکاح ہوا ہے کس چیز کی کمی ہے۔ شامین اور نیم آپی کی

نصیب ہو۔“ کہتے کہتے ان کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

”جی ماما.....“ وہ بھی اداسی سے سر جھکا کر بولی۔

”تم جلدی سے فریش ہو کر آؤ آج سب مل کر ناشتہ کریں گے میں نے صوفیہ باجی کو کہلوادیا ہے شبو سے..... ہری اب.....“ کہتے ہوئے وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ یثیاء ان کی بات کے جواب میں تیزی سے اٹھی تھی۔ ہاتھ لے کر کپڑے تبدیل کیے لائٹ سامیک اپ کر کے ڈریسنگ مرمر میں اپنا جائزہ لیا اور کمرے سے باہر گئی۔

”مگڈ گرل.....“ ماما سے دیکھ کر مسکرائیں تھیں وہ خالہ جان کو سلام کر کے اپنی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے سامنے والی چیئر پر اگلن براہمان تھا اور ناشتے کے دوران آج کئی بار ان کی نظروں کا تصادم ہوا تھا۔ یثیاء کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر رہی تھی اور اگلن خود کو لا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں بار بار یثیاء کے چہرے پر پھٹک رہی تھیں اور یہ چوری یثیاء نے کئی بار نوٹ کی تھی۔ پھر سارا دن یثیاء نے ماما کے ہمراہ خالہ جان کی فیملی کے ساتھ گزارا تھا۔ صوفیہ بار بار اگلن کو اپنے کام سے کام رکھنے اور ادھر ادھر کے چکروں میں نہ پڑنے کی نصیحتیں کر رہی تھیں۔

”امی جان اتنی بڑی زنجیر ڈال تو دی آپ نے یثیاء کی صورت میں، پھر مجھے کہاں ادھر ادھر بھٹکانا ہے۔“ وہ خالہ جان کو دلا سہ دے رہا تھا۔ یثیاء نے سن کر اس کی سمت دیکھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ شامین کے ہمراہ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ روائگی والے روز ایذا وار

نہی کو کہاں ختم کرنے دے گی بہت عرصہ جلیں گے آپ خود اپنی لگا ئی ہوئی اس آگ میں..... میرے دل سے آپ کی لفظوں سے کی گئی تذلیل کبھی مٹ نہیں سکتی اگلن..... میں تو محبت کے دیوتا کی طرح آپ کی پوجا کرتی تھی۔“

”مگر اس دیوتا کو آپ نے خود میرے دل سے نکال کر مسمار کر دیا ہے۔ ماما کی خاطر صرف اور صرف ماما جان کی خاطر آپ سے نکاح کا یہ زہر بھی میں نے امرت سمجھ کر پی لیا ہے ورنہ تو شاید..... اگلن کی باتوں نے اس کے دل کو پھر درد سے بھر دیا تھا اور اس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی وہ بیڈ پر بیٹھی بے آواز آنسو بہانی سوچے جا رہی تھی۔

”اے کاش آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ یہ جاننے کی کوشش کی ہوتی کہ ظرغام سے میری دوستی کا محرک کیا ہے۔ اب آپ کو یہ محرک پتہ چلا تو میرے سامنے احساس ذلت سے تذلیل سے آپ کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے اگلن..... محبت کیا شے ہے آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔“ یونہی سوچوں میں وہ نہ معلوم کب نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ دوسرے دن صبح ماما جان کی آواز پر اس کی آنکھیں کھلیں تھیں۔

”اٹھ جاؤ یثیاء.....“ انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا، حیرانگی سے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

”ارے ماما جان آپ..... آج آفس نہیں آئیں گی؟“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”نہیں..... میں نے اگلن کی وجہ سے دو دن کی چھٹی لی ہے کل رات کو اگلن کی فلائٹ ہے اس لیے آج اور کل کا دن ہم سب ساتھ گزاریں گے۔ نہ معلوم کہ پھر اسے کب فیملی کے ہمراہ بیٹھنا



اس نے ظرغام کا نام لیے بنا ہی پوچھا تھا مگر وہ سمجھ گئی تھی۔ چہرے پر چھائی مسکراہٹ معدوم ہوئی تھی۔

”دوست بھی سب ٹھیک ہیں میرے آپ آجی کہیں۔“ وہ اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”میرے دن رات تو بس کام..... کام..... اور کام کی نظر ہو رہے ہیں۔“

”آپ بیٹھیں نا کھڑے کیوں ہیں۔“ یثاء نے بیڈ کے نزدیک پڑی چیئر کی طرف اشارہ کیا تھا وہ بیٹھ گیا۔

”اور تم ایجوکیشن میں کہاں تک پہنچیں؟“

”اب تھرڈ ایئر میں ہوں۔“ یثاء نے چور

نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا پہلے سے بہت کھڑ گیا تھا۔ صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ گندی رنگت بھی کھڑ گئی تھی بالوں کا اسٹائل، جینز، ٹی شرٹ میں بہت اسماٹ پر سنائی لگ رہا تھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے

چوری پکڑ لی تھی۔

”ہاں..... کچھ نہیں۔“ یثاء گڑبگڑ گئی تھی۔

”ابھی آپ کتنا عرصہ وہاں کام کریں

گے؟“ اس نے سنبھل کر پوچھا۔

”کیوں تمہیں کوئی پریشانی ہے؟“ معنی خیز

انداز میں پوچھا۔

”نہ..... نہیں تو“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔“

”شامین اور نیلم کی تیاری تو مجھ کو مکمل ہے

میں ابھی مزید تین چار سال کام کا ارادہ رکھتا ہوں

میں اپنے لیے بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”بھائی کوئی ملنے آیا ہے آپ سے.....“

شامین کی آواز پر وہ دونوں چونکے تھے۔

”اوکے پھر بات کروں گا تم سے.....“ کہہ کر وہ

عماد بھی آگئے تھے۔ خالو جان نے بھی چھٹی کر لی تھی یوں پورے گھر میں کھانا بھی ہو گئی تھی۔ مگر انگن کے جانے کے باعث سب کے دل اداس تھے۔ خالہ جان تو چپکے چپکے آنکھوں میں آنی نمی دوپٹے میں جذب کر رہی تھیں۔

پھر رات کو ایک بجے وہ سب مل کر اسے ایئر پورٹ سی آف کرنے آئے تھے۔ جاتے ہوئے سب سے مل کر انگن لمحہ بھر کے لیے یثاء کے نزدیک آیا تھا۔

”اوکے یثاء اپنا خیال رکھنا اور ساتھ امی

جان کا بھی“ میرے جانے سے وہ بہت اداس

ہوں گی انہیں اداس مت ہونے دینا۔“ یثاء نے

نم آنکھوں سے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ

اس بات میں سر ہلا دیا تھا۔ اسے سی آف کر کے

سب گھروں کو لوٹ چکے تھے مگر کئی دن تک اداسی

نے ان سب کا احاطہ کر رکھا۔ پھر دھیرے

دھیرے زندگی معمول پر آگئی تھی اور سب اپنی

اپنی مصروفیات میں گم ہو گئے تھے۔ انگن کی طرف

سے پیچھے آنے شروع ہوئے تو صوفیہ نے بیٹیوں

کے جینز کی تیاری شروع کر دی تھی پھر دیکھتے ہی

دیکھتے دو سال پر لگا کر اڑ گئے۔ اس عرصے میں

انگن پہلی بار دس دن کی چھٹیوں میں والدین سے

ملنے آیا تھا۔ مگر یثاء کے ساتھ اس کے رویے میں

کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک دن ذرا ملنے جلنے

والوں کا زور ذرا کم ہوا تو وہ اس کے کمرے میں

چلا آیا۔ یثاء اسے دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیسی گزر رہی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اے..... ون۔“ مختصر ا کہتے ہوئے یثاء

اس کی سمت دیکھ کر مسکرائی۔

”ہوں.....“ وہ بھی مسکرایا تھا۔

”اور تمہارے دوستوں کا کیا حال ہے؟“

اٹھ گیا تھا اسے آئے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے جب کہیں وہ بیس منٹ کی ملاقات کر پایا تھا بیٹا سے اگلن کے جانے کے بعد بیٹا نے حساب لگایا اور دل مسوس کر رہ گئی تھی پھر مصروفیت کے اس عالم میں اس کی چھٹیاں تمام ہو گئیں تھیں اور واپس جانے کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ رات ڈنکا اہتمام راحیلہ نے کیا تھا۔ سب مدعو تھے۔ شامین اور نیلم کے سسرال والے بھی آئے ہوئے تھے۔ صبح چار بجے کی فلائٹ تھی۔ ایئر پورٹ پر جانے سے قبل لمحہ بھر کے لیے اس کے نزدیک رک کر اس نے پھر دل جلانے والی بات کہی تھی۔

”بیٹا تم ایسا کرو کہ ظرغام سے بات کر لو اگر وہ تم سے شادی پر راضی ہو تو میں عزت کے نام پر بندھے اس نام نہاد بندھن سے آزاد کر سکتا ہوں۔“ اس کی بات نے بیٹا کو سرتاپا سگسا کر رکھ دیا تھا تاہم پھر بھی وہ محل سے بولی تھی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے آپ ظرغام اور میرے مابین کچھ نہیں جانتے اگلن اب قدرت نے ایک بندھن بنا ہی دیا ہے ہمارے درمیان تو اسے قائم رہنے دیں ورنہ بڑوں کے درمیان بھی فاصلے پیدا ہو جائیں گے اور جاتے ہوئے ایسی باتوں سے احتراز کریں۔“ اس نے اپنے عین سامنے کھڑے اگلن کے کالر سے فرضی گرد جھاڑی تھی۔

”اچھا.....“ وہ حیرانگی سے بولا۔

”پھر میرا انتظار کرو۔“

”اوکے کروں گی۔“ بیٹا شامین کے نزدیک آنے پر مسکرائی تھی۔ مگر یہ مسکراہٹ بہت زخم خوردہ تھی۔ پھر وہ چلا گیا اور وہ سب کے ہمراہ گھر واپس لوٹ آئی تھی رات آنسوؤں کے ہمراہ گئی تھی پھر زندگی اپنی رفتار پر آ گئی تھی۔ مگر اس دکھ سے دوچار تھی

کہ وہ جسے دل و جان سے اپنا جانتی تھی وہ اسے کیسا بدکردار سمجھتا تھا۔ اس سے پرگمان تھا وہ کیونکر ظرغام کے حوالے سے پیدا ہوئی اگلن کے دل کی غلط فہمی کو اس کے دل سے نکال سکے گی یا ختم کر سکے گی۔ یہ سوچ اب اسے بہت پریشان رکھتی تھی کیا کرے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

شامین اور نیلم کو گرہ بچویشن مکمل کیے چار سال ہو چکے تھے۔ ان کے سسرال والے اب ان کی شادی کی جلدی کر رہے تھے خالہ بھان بھی بیٹیوں کی تمام تر تیاریاں کر چکی تھیں۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اگلن کو چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ اس نے نون پروا خ کر دیا تھا کہ ایک سال سے بل اب اس کا آنا مشکل ہے۔

”پھر بیٹا..... وہ لوگ مزید وقت کے لیے راضی نہیں ہیں اور تم اکلوتے بھائی ہو ان کے تمہاری موجودگی بہت ضروری ہے، خود عدا اور ایزو کی بھی خواہش ہے۔“ خالہ جان کے اگلن کو بتایا تھا۔

”اچھا..... آپ ڈیسٹر تو فکس کریں ہو سکتا ہے ہفتہ بھر کی چھٹی مل جائے۔“ اگلن نے انہیں دلاستہ دیا تھا۔

”سوچ لو بیٹا..... کہیں عین وقت پر ہمارے ارمان دھرے نہ رہ جائیں۔“ انہوں نے کہا۔

”اوہ امی جان اللہ پر بھروسہ رکھیں میں اپنی طرف سے چھٹی کے لیے پوری کوشش کروں گا۔“ پھر دونوں کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی مگر اگلن کی غیر موجودگی سے دونوں بہت اداس تھیں۔ بھائی کی غیر موجودگی میں انہیں کوئی خوش بھی نہیں لگ رہی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی شادی کے لیے راضی نہیں تھی۔

اس دن کالج سے واپس آ کر بیٹا نے شبکو کو اپنا لچ آڈر کیا اور خود ہاتھ لے کر کمرے میں بیٹھی شبکو کا انتظار کر رہی تھی جب ہی فون کی بیل ہوئی تھی۔ اس

قبل ہی آیت نے دی ہے اور میرا دل مچلنے لگا تم سے یہ نیوز شیئر کرنے کے لیے میری چار سال کی محنت رنگ لے آئی افشاں کا تو تمہیں علم ہے جب سے اسے آیت کے متعلق پتہ چلا ہے کیسا نند پنا دکھاتی ہے وہ آیت کو..... وہ نان اسٹاپ بول رہا تھا ایشاء کی ہنسی چھٹ گئی۔

”اور کچھ.....“ اس کی ہنسی پر وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔

”نہیں..... اور کچھ نہیں بات بس ابھی یہیں چک پہنچی ہے۔“ ظرغام نے مزے سے کہا۔

”شکریہ تمہارا تم نے میری بہت مدد کی آیت کو منانے کے لیے ورنہ تم خود ابھی طرح جانتی ہو کہ وہ لڑکوں سے دو گز دور بھاگتی ہے ظرغام نے زندگی سے بھرپور قہقہے کے ساتھ کہا۔ اب اس کی ماما والا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے میں کتنا خوش ہوں تمہیں اندازہ نہیں.....“ ظرغام نے کہا۔

”مجھے اندازہ ہے ظرغام بھیا آپ کی چہکتی آواز نے بتا دیا ہے کہ آپ کتنا خوش ہیں۔“ وہ خوشدلی سے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے اب تم ذرا اپنی ادھوری بات مکمل کرو بلکہ کے بعد.....“ ظرغام نے کہا۔

”چھوڑیں پھر کبھی سہی.....“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”کیوں..... ابھی کیوں نہیں.....“

”بات بہت طویل بھی ہے ظرغام اور سیریس بھی، مجھے آپ سے مکمل رازداری کا وعدہ بھی لینا ہے پھر میں آپ سے شیئر کروں گی۔“

”اچھا کیا بہت خاص بات ہے۔“ ظرغام نے مکمل سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی..... یوں سمجھ لیں کہ اس بات پر میری زندگی کا میرے فیوچر کا دار و مدار ہے۔“

”تم اس وقت کیا کر رہی تھیں۔“ ظرغام نے

نے فون اٹھا کر دیکھا۔ کال ظرغام کی طرف سے آرہی تھی۔ ریسیو کرے نہ کرے، آگن کی وارننگ کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسی وقت شبو اس کا لپچ لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ایشاء کو دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی۔ جوفن کو گھورے جا رہی تھی۔

”بی بی فون بج رہا ہے آپ اٹھاتی کیوں نہیں.....“ ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے شبو بولی تھی۔

”ہوں.....“ اس کی آواز پر وہ چونکی تھی اور سرعت سے فون اٹھا کر کال ریسیو کر لی تھی۔ دوسری طرف ظرغام ہی تھا۔

”کیسی ہوسسٹر.....“ اس کی ہیلو کے جواب میں پوچھا تھا۔

”فائن آپ کیسے ہیں؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں اتنے عرصے سے تم نے فون نہیں کیا کہاں غائب ہو لگتا ہے آگن کی منکوحہ بننے کے بعد بھائی کو بالکل بھلا دیا ہے۔“ ظرغام نے شکوہ کیا تھا۔

”نہیں ظرغام بھیا یہ بات نہیں ہے بلکہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

”آپ یہ بتائیں کہ فون کیسے کیا۔ ابھی کچھ دیر قبل آپ افشاں کو لینے آئے تھے کالج تب رسی سی ملاقات تو ہوئی تھی آپ سے میری.....“

”ارے ہاں یار..... ایک زبردست سی نیوز سنانے کے لیے تمہیں فون کیا تھا۔ لیکن تم پہلے بلکہ کے بعد والی بات پوری کرو۔“

”بعد میں بتاؤں گی ظرغام پہلے تم اپنی نیوز شیئر کرو۔“

”اچھا تو سنو..... آیت کی ماما مجھ سے آیت کی شادی پر رضامند ہو گئیں ہیں۔ تمہاری دی ہوئی ٹپس نے میری بہت مدد کی ہے اور یہ خبر مجھے ابھی کچھ دیر

کی وجہ یہ تھی۔

”جی میں یہ باتیں کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی خالہ جان کے علاوہ..... جس کا زلٹ نکاح کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے مگر اب جب سے انگن جاتے ہوئے یہ سب کہہ گئے ہیں تب سے میں بہت پریشان ہوں کہ یہ غلط فہمی کیونکر ختم ہوگی۔ میں نے اشتعال میں کہہ تو دیا تھا مگر بعد میں شرمندہ بھی ہوئی تھی خود سے..... میں تو انہیں خود کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ٹپس لیتی تھی تم سے جس طرح تم مجھ سے پوچھتے تھے کہ کیسے پتہ لگے ان کے دل میں میرے لیے کتنی چاہت ہے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی تھی۔

”ہاں تو..... چاہت کا پتہ لگ تو گیا نا کہ کیسے فنا فٹ انہوں نے تمہاری ذات پر اپنے نام کا ٹیگ لگا لیا ‘یشاء اگلن’ ظرغام نے اسے ریلیکس کرنے کے لیے شرارتی انداز میں کہا۔

”تو پھر اب وہ تمہارے نام سے مجھے ڈھنی نار چر کیوں کرتے ہیں۔ یہ لڑکوں کی کیا نفسیات ہے ظرغام؟“ یشاء ڈپریشن میں بھی فوراً بول اٹھی۔

”اس سلسلے میں تم پریشان مت ہو میں کرتا ہوں کچھ اس غلط فہمی کو ختم کرنے کے لیے.....“

”پلیز ظرغام اگر تم نے میری یہ پریشانی ختم کر دی نا تو یہ بہت بڑا احسان ہوگا مجھ پر.....“

”نہیں یشاء اس طرح نہیں کہتے دوست ہی مشکل میں کام آتے ہیں تم تو دوست پلس بہن ہو میری بس یہی بات سمجھاؤں گا انگن کو میں ان کی تو..... ابھی وہ آگے کچھ کہتا کہ.....“

”ظرغام تمیز سے.....“ کی آواز پر زبردست قہقہہ لگا بیٹھا۔

”ابھی تو میں نے موصوف کو کچھ کہا ہی نہیں اور تم نے وارننگ جاری کر دی۔ اس کی بات پر یشاء

پوچھا۔

”میں لُچ کرنے جا رہی تھی کہ تمہارا فون آ گیا۔ زندگی کا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے مجھے اب آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”اوکے..... تم لُچ کرو میں تم سے آج لیٹ ٹائٹ بات کرتا ہوں“ میرے فون کا انتظار کرنا بائے۔“ کہہ کر ظرغام نے فون آف کر دیا تھا۔ ظرغام سے بات کر کے نہ معلوم کیوں دل کو تسلی ہوئی تھی اور وہ لُچ کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔ رات کو گیارہ بجے تک وہ ظرغام کی کال کا انتظار کرتی رہی تھی۔ مگر اسے لگا کہ شاید ظرغام بھول گیا ہے۔ تب ہی وہ چینج کر کے لیٹنے والی تھی کہ کمرے کے سناٹے کو فون کی تیز بیل نے توڑا تھا۔ اس نے فون اٹھا لیا۔ دروازے کے نزدیک آ کر ادھر ادھر دیکھا ہر سمت سناٹے کا راج تھا اور تار بکی چھائی ہوئی تھی وہ دروازہ بند کر کے اپنے بیڈ پر آ گئی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

”ہیلو.....“

”سوری یشاء میں ذرا بڑی تھا اس لیے کال کرنے میں لیٹ ہو گیا ہوں۔“

”جی میں بھی انتظار کرتے کرتے اب سونے لگی تھی۔ یشاء بیڈ کراؤن سے تکیہ لگا کر آرام دہ حالت میں بیٹھ گئی تھی۔

”ہاں..... اب بے دھڑک کہو جو بھی بات ہے۔“

”راز داری کا پکا وعدہ.....“ اس نے پوچھا۔

”آف کورس..... یہی تو ہماری دوستی کی بنیاد ہے۔“ ظرغام نے خلوص دل سے کہا۔ تب یشاء نے خود پر گزری ہر بات دھیرے دھیرے اسے بتادی تھی۔

”اوہ گاڈ..... اس دن اچانک فون بند ہو جانے

جھینپ گئی تھی بے اختیاری پر.....

”وہ بس یونہی.....“ منہ سے نکل گیا۔

”یہی محبت ہے ڈیر سسٹر..... ابھی کیسے میرے سامنے دکھڑے کہہ رہی تھیں۔ ظرغام نے اسے جھپٹا۔

”اچھا اب رات بہت ہو چکی ہے سو جاؤ۔“

”سویشافون بند کرنے سے قبل ایک بات.....“

ظرغام اور یثاء کے رشتے کی حقیقت جان کر انگن کبھی خود سے بھی نظریں نہیں ملایا۔

”ہوں..... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی کہ انگن

اپنی نظروں میں خود گر جائیں۔ اپنی چیپ سوچ پر خود

سے بھی شرمندہ ہوں اور مجھ سے بھی سراٹھا کر بات

نہ کر سکیں۔ ابھی شامین اور نیلم کی شادی پر آمد متوقع

ہے چھٹی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ یثاء نے یہ

اطلاع بھی دے دی ظرغام کو.....

”او کے بے فکر رہو..... میں اس بات کا مسئلہ

اسی طرح حل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”سی یواگین.....“ کہہ کر ظرغام نے فون آف

کر دیا تھا۔ یثاء ظرغام سے مسئلہ شیئر کر کے کچھ اچھا

محسوس کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شامین اور نیلم کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔

یثاء پر بات بھلا کر خالہ جان کے ہمراہ شادیوں کی

تیار یوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ انگن کی غیر موجودگی

میں مایوں کی رسم بھی ہو گئی تھی۔ ایزد اور عماد خوشی کے

ساتھ ساتھ اداسی کے نرغے میں بھی تھے۔

ابھی تک انگن کی آمد کی کال تک نہیں آئی تھی۔

رسم کی ادائیگی کے بعد وہ شامین اور نیلم کو ان کے

کمرے میں پہنچا کر اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ارادہ

تھا کہ چنچ کر کے پھر دوسرے کام نمٹائے گی۔ ابھی

کچھ مہمان موجود تھے۔ راحیلہ اور صوفیہ ان سے

بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔

ابھی اسے لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک

مہمان لڑکی نے آکر میسج دیا کہ اس کی ماما جان بلا

رہی ہیں۔ بیڈ سے اٹھتے ہوئے اس کی نظر ڈرینگ

ٹیبیل کے آئینے میں پڑی تھی۔

پیلے جوڑے میں روپ خوب دمک رہا تھا۔ اس

نے نظریں واپس پلٹیں۔ یہ سمجھ کر ماما جان کو مجھ سے

پھر کوئی کام یاد آ گیا ہوگا۔ وہ کسلندی سے کمرے

سے باہر آئی تھی۔ خوشی سے بھرپور آوازوں سے

چوکی تھی ابھی تو رسم نمٹی ہے پھر یہ آوازیں کیسی ہیں۔

سوچتے ہوئے وہ کچھ اور آگے بڑھی اور پھر شامین اور

نیلم کو انگن سے لپٹا آنسو بہاتا دیکھ کر حیرانگی سے

آگے بڑھی تھی۔ انگن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور

آنکھوں نے اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکار

کر دیا تھا۔ یثاء انگن کی نظروں کی تپش سے بچنے کے

لیے ماما جان کے پیچھے جا چھپی تھی۔

او کے اس طرح نہیں روتے بیٹا..... بھائی آ تو

گیا نا پھر.....“ خالہ جان نے دونوں کو سمجھا کر پیار

سے انگن سے جدا کیا۔ سب وہیں لاؤنج میں ہی

دھرنا مار کر بیٹھ گئے تھے انگن بھی دونوں بہنوں کو

دامیں بائیں شانے سے لگائے بیٹھ گیا تھا۔

”انگن یوں اچانک..... کال کر دینی تھی کوئی بھی

پک کرنے آ جاتا تھا۔“ ماما جان نے کہا۔

”بس خالہ جان جیسے ہی چھٹی منظور ہوئی۔ میں

نے فوراً سے پیشہ ہی فلائٹ پکڑی اور اب آپ کے

سامنے ہوں۔“ انگن مسکرایا تھا۔

”چلو شکر ہے..... ہماری خوشیاں ادھوری نہیں

رہیں خالو جان بھی خوشدلی سے کہہ کر مسکرائے تھے

بہنوں کی دعا قبول ہو گئی۔ ورنہ دونوں رورو کر ہلکان

تھیں کہ بھائی کی غیر موجودگی میں ہمیں شادی نہیں

کرنی۔“ خالہ جان نے انگن کو بتایا وہ رات آنکھوں

میں کئی تھی صبح سے کچھ قبل انگن کی تھکن کے خیال سے صوفیہ نے ڈانٹ کر سب کو سونے کے لیے بھیج دیا۔ ”سب جاگتے رہو گے تو صبح کے کام کون دیکھے گا۔“

دوسرے دن افشال آیت اور دیگر فرینڈز بھی صبح سے ہی آگئیں تھیں وہ سب ڈھولکی لے کر اوپر چھت پر مہندی کے فنکشن کے لیے پریکٹس کر رہی تھیں انگن اور یثاء بھی وہاں موجود تھے۔

یثاء ایسا کرو فون کر کے مہندی کے فنکشن کے لیے ظرعام کو بھی بلوالو۔ اس سانگ پردہ اور آیت مل کر بہت اچھا ڈانس کر سکتے ہیں۔ دونوں بہت ماہر ہیں ہم ہر حال میں لڑکوں والوں سے مقابلہ جیت کر آئیں گے۔ اس کی ایک دوست نے کہا۔

”ظرعام کا نام سن کر انگن کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ اسی دم زخم خوردہ انداز میں یثاء کی نظریں انگن کی سمت اٹھیں تھیں نگاہوں کے تصادم میں ایک کی آنکھوں تنفر تھا تو دوسرے کی آنکھوں میں نمی.....

یثاء نے سر جھٹک کر نمی کو اپنے اندر اتارا اور بولی افشال کو کہتی ہوں اس نے دھیرے سے دوست کو جواب دیا تھا اور اس کے نزدیک سے اٹھ گئی تھی اس دم انگن اس کے نزدیک آیا اپنے ہاتھ میں تھاما موبائل اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تھمایا۔

”بلاؤ اس کو اس بہانے سے..... اب جانے سے قبل اس سے بھی نمٹ لوں گا۔“

”سوچ لیں انگن ایسا نہ ہو کہ آپ کو شرمندگی اٹھانا پڑے۔“ یثاء نے دھیرے سے کہا۔

”تم کال کرو اسے.....“ انگن نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

یثاء نے ہاتھ بڑھا کر ظرعام کا نمبر ڈائل کیا اور پیش کر دیا چند لمحوں میں کال ریسیو ہو گئی تھی۔

”ہیلو ظرعام.....“

”یثاء تم.....“ ظرعام کی حیران آواز آئی تھی۔

”یہ نمبر تو تمہارا نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں یہ نمبر انگن کا ہے میں انہی کے فون سے بات کر رہی ہوں۔“

”اچھا..... موصوف کو چھٹی مل گئی۔ سب خیریت تو ہے نا۔“ ظرعام نے اندازہ لگانے کے ساتھ ہی پوچھا۔

”میں نے تمہیں سب فرینڈز کی فرمائش پر کل مہندی کے فنکشن میں انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ ہم سب میں تم اور آیت ہر طرح کے ڈانس میں ماہر ہو اور ہم ہر طرح سے یہ مہندی کا مقابلہ جیتنا چاہتے ہیں، کل کی تمام مصروفیات ترک کر کے آ جاؤ۔“ وہ بالکل مطمئن انداز میں کہہ رہی تھی۔ انگن نزدیک ہی کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا آیت اور افشال کے ہمراہ کل کی ڈیوٹی میری ہے انہیں تمہارے ہاں پک ایبٹ ڈراپ کرنے کی۔“ ظرعام نے کہا۔ بات کرنے کے بعد اس نے فون آف کر کے انگن کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”کل آئے گا ظرعام.....“ اس کے انداز پر انگن ششدر رہ گیا تھا یعنی اسے اپنے فرینڈز کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ اسے کچھ کہنے کے لیے اس کی سمت لپکا تھا۔ جو سب فرینڈز کو ظرعام کی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔

”انگن سنو.....“ صوفیہ نے آواز دی تھی اور یثاء کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ بیٹا ٹرک آنے والے ہیں۔ بہنوں کے جہیز کا یہ تمام سامان واپس پیک کر دالو مووی تو بن چکی ہے۔ لڑکوں سے ٹرک پر لوڈ کروا کر تمہیں بہنوں کا جہیز ایڈ واور عماد کے گھر پہنچانا ہے۔“

کھل کے مسکرایا تھا۔

”میں کل شام کو آ رہا ہوں۔“ انگن نے اس کا انٹیشن قبول کر لیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا افشال اور آیت کی سمت بڑھ گیا تھا۔ وقت مقررہ پر وہ ظرغام کے گھر پہنچا تھا۔ ظرغام نے اس کا پڑتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ رسی باتوں اور پرتکلف چائے کے بعد وہ اصل بات کی طرف آیا تھا۔

”میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ بغیر کسی تمہید کے انگن نے کہا۔

”جی پوچھیے.....“ ظرغام اس کا مقصد سمجھ چکا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج انگن کی مکمل برین واشنگ کر دے گا۔

”یشاء سے تمہاری یہ برادرانہ دوستی کب سے ہے؟“

”یہ دوستی اس وقت شروع ہوئی جب وہ افشال کی برتھ ڈے پارٹی میں آئی تھی۔ افشال کہنے کو تو میری چھوٹی بہن ہے مگر اس میں جیسی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ مجھے آیت کو دوستی کی آفر کرنے کے لیے ایک پُر خلوص بہن نما دوست کی ضرورت تھی۔ سو میں نے افشال کی برتھ ڈے پر اس کو یہ آفر کی تھی اور اس نے بہت خوشی سے میری دوستی کو قبول کیا تھا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ مجھے آیت کو پٹانے کے لیے اس کی مدد درکار ہے۔ جس پر اس نے مجھے گھور کر دیکھا جب مجھے اندازہ ہوا کہ شاید لفظوں کے استعمال میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔

اور میں نے ’سوری‘ کہہ کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے یشاء کہ تمہارے اس بھائی کو آیت بہت اچھی لگتی ہے میں نے کئی بار اسے اشاروں میں یہ بات اس پر عیاں کی ہے مگر وہ نہ معلوم کس قسم کی لڑکی ہے یا تو جان کر انجان بنتی ہے مجھے ستانے کے لیے..... یا پھر اس کی زندگی میں کوئی

”جی بہتر امی جان.....“ ان کا حکم سن کر انگن نے چند کرنز کو آوازیں دیں اور ہر بات بھلا کر اس کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

مہندی کا فنکشن ان کی توقع سے زیادہ کامیاب رہا تھا۔ ان لوگوں نے لڑکے والوں کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ ظرغام کو حقیقتاً ڈاننگ میں کمال حاصل تھا۔ اس نے لڑکیوں کی طرف سے گانے والے ہر گانے پر پرفارمنس دے کر محفل لوٹ لی تھی۔ آیت نے ظفر بغام کے پر زور اصرار پر گلنار چہرے کے ساتھ اس کا ساتھ دیا تھا۔ جس پر لڑکوں نے خوب سیٹیاں بجائیں تھیں اور یہ دیکھ کر کہ ظرغام کی نظروں کا محور آیت ہے یشاء نہیں ایک تاسف نے انگن کے دل کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ پھر بھی اس نے دل سے ہر تردد کو نکلانے کے لیے فنکشن کے اختتام پر ظرغام کے نزدیک پہنچ کر کہا تھا۔

”ویل ڈن ظرغام..... تم نے آج کا فنکشن لوٹ لیا مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے کیا کل تم مجھے وقت دے سکو گے؟“ اسے سراہنے کے ساتھ ہی انگن نے مدعا بیان کیا۔

”وائے ناٹ انگن..... آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔“ ظرغام نے بغیر کسی حیل حجت کے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر کل میری کال کا انتظار کرنا ہم کہیں باہر ملیں گے۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے انگن..... کل آپ میرے گھر چائے پر انوائٹنڈ ہیں جو بھی بات کرنا ہو آپ وہاں مجھ سے کھل کر کر سکتے ہیں۔ یہ میرے پاپا کا وزیٹنگ کارڈ اس پرائیڈریس درج ہے۔ میں آپ کا منتظر ہوں گا۔“ ظفر بغام نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

”اوکے.....“ اس کے پُر خلوص انداز پر انگن

جس کی بنا پر وہ آپ کی طرف سے بے اعتباری اور بے اعتمادی کی زد میں آگئی۔  
”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ انگن اس کی بات پر چونکا تھا۔

”خود یثاء نے.....“ انگن میرے بھائی لڑکیاں بہت نازک مزاج ہوتی ہیں جیون ساٹھی کے حوالے سے ان کے خواب بہت خوبصورت اور رنگین ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی کے ان خوابوں کی تعبیر کے لیے ہمیشہ متحرک رہتی ہیں اگر آپ اپنے رویے سے اس پر ظاہر کرتے رہتے کہ وہ آپ کے لیے بہت خاص الخاص ہے اور کوئی دوسری اُس جیسی نہیں تو شاید اس کو اپنی فرینڈز کے رومانوی قصے سن کر آپ کے بارے میں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مگر مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے اس کی برتھ ڈے تو کیا یاد رکھی تھی کبھی کسی مذہبی تہوار پر بھی اسے کوئی پھول تک نہیں دیا ہوگا ایسے غیر رومانٹک بندے کو جو کہ بچپن سے اس سے منسوب بھی ہو موجودہ دور کی لڑکی کب اچھا سمجھ سکتی ہے کیسے جان سکتی ہے کوئی بھی ٹین ایجر لڑکی کہ وہ سامنے والے شخص کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔“

”پیار کا مطلب صرف وہ نہیں جو آپ یثاء کے ساتھ کر چکے ہیں۔ پیار کا مطلب ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھنا اور دوسرے فریق کی امیدوں پر پورا اترنا بھی ہے۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یثاء نے مجھ سے شیئر کر کے آپ کی انسلٹ کی ہے۔ نہیں انگن نہیں۔ وہ لڑکی جو بچپن سے دل میں آپ کو بسا بیٹھی ہو۔ اس کا ہر خواب آپ سے شروع آپ پر ختم ہو پھر یہ کہ وہ عمر یا نوخیز بھی ہو تو ایسی ٹین ایجر لڑکی مجھ جیسے دوست سے بھی اپنا درد شیئر نہیں کرے گی تو کس سے کرے گی۔ اپنی فرسٹریشن کس طرح دور کرے گی۔ اب اس سے

اور ہے جو مجھ سے زیادہ اہم ہے۔“  
”یہ بات میں نے یثاء سے شیئر کی تھی اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ آیت کے دل کی بات معلوم کر کے مجھے آگاہ کرے گی۔ اس طرح ہم دونوں کی دوستی کی شروعات ہوئی تھی۔ مجھے شروع سے آپ کے بارے میں علم تھا کہ وہ آپ سے منسوب ہے وہ بھی آپ کو لانا تک کرتی تھی۔ مگر آپ کا ریزرو رویہ اسے آپ کے دل کی خبر نہیں ہونے دیتا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا کہ انگن سے میرا رشتہ گھر کے بڑوں کی وجہ سے بنا ہے میں قدرتی طور پر انگن کے لیے دل میں اٹریکشن محسوس کرتی ہوں مگر انگن یا مجھ میں تمہاری آیت جیسی بات نہیں ہے مجھے ان کے دل کے حال کی خبر نہیں ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنا حال دل مجھ سے شیئر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں انگن کے احساسات اپنے حوالے سے جاننا چاہتی ہوں۔ مگر میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے انگن کی بہنیں نند کے رشتے سے منسلک ہیں سو ان سے تو ایسی کسی بے تکلفی کا سوال ہی نہیں ہے اب خدا نے مجھے منہ بولا بھائی دیا ہے تمہارے روپ میں..... تم اگر مجھ کچھ ایسی ٹپس دو کہ انگن کے دل کا حال مجھ پر عیاں ہو جائے پلیز..... ہیلپ می.....“

”ایسے بوائے چپ گھنے ہوتے ہیں یثاء تمہیں بہت احتیاط سے یہ کام کرنا پڑے گا۔ اگر کسی طرح وہ تمہاری طرف سے اس شک میں مبتلا ہو جائیں کہ تم کہیں اور انٹرنیٹ لے رہی ہو تو وہ کھل کھلا کر سامنے آ جائیں گے۔“ دل کی محبتیں رویوں سے ظاہر ہوتی ہیں اب جب وہ بندہ اتنا ریزروڈ ہے تو اس کے لیے یہی کرنا پڑے گا اور پھر وہی ہوا میری ذات کے شک میں مبتلا ہو کر آپ نے جارحانہ انداز میں سب کچھ تمہیں نہیں کر دیا یثاء کی ذات کے پرچے اڑا دیے



زیادہ میں کیا کہوں افکن خود تم بہت سمجھدار ہو۔ افکن اپنے اندر کی تمام حیات بیدار کیے اسے سن رہا تھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی کسی بھی خاص موقع پر بیشاء کو کوئی گفٹ نہیں دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے گھر کی مرغی دال برابر سبجہ کر ٹریٹ کرتا تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے ہمیشہ میرے شانے سے بندھے رہنا ہے۔ مجھے ہی اس کا بوجھ اٹھانا ہے۔ حتیٰ کہ نکاح کے اہم موقع پر بھی اس کا وہی رویہ تھا۔

نکاح ہو جانے کے بعد بھی اس نے بیشاء کو کوئی گفٹ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ گویا نکاح کر کے اس پر احسان کیا ہو۔ اور پھر جب ہی سے ظر غام کا نام لے لے کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچاتا آیا تھا۔ افکن کے دل کو ایک اداسی اور تاسف نے گھیر لیا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کا کتنا خوبصورت وقت اپنے غلط رویے، غلط سوچ اور غصے کی نظر کر دیا تھا وہ شرمندگی اور بے دلی سے ظر غام کو خدا حافظ کہہ کر نکل آیا تھا۔ اس کے نکلنے ہی ظر غام نے فون پر بیشاء کو تمام روداد بتا دی تھی۔

”اف یہ کیا کیا تم نے..... اب اگر وہ مزید خفا ہو گئے تو پھر.....“ بیشاء نے ظر غام کی بات پر سر پکڑ لیا تھا۔

”بات سنو بیشاء افکن اگر اب بھی نہ سمجھا اور تمہارے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی نہ آئی تو سمجھ لینا کہ یہ شخص کبھی تمہارا نہیں تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہاری بہتری کے لیے جو مناسب سمجھا وہ کیا..... میں سمجھتا ہوں کہ آج میں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔“ اور بیشاء اس کی بات پر خاموش ہو گئی تھی۔ ”خدا کرے ظر غام کی باتوں سے افکن کو عقل آگئی ہو۔“ اس نے دلی میں کہا اور افکن کی گھر واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ افکن دیر تک سڑکوں کی خاک

چھانتا رہا دل کو کسی پل قرار نہیں تھا یہ میں نے کیا کر لیا خود کے ساتھ اب بیشاء کا سامنا کس طرح کروں گا۔ کیسی بے دردی سے اس کا دل توڑ کر لفظوں کے تازیانے لگائے تھے۔ سنگدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ نازک کالج جیسی لڑکی اس کا کتنا ستم اپنی ذات پر سہہ گئی تھی۔ دل بے قرار کو قرار نہ تھا۔ موبائل کی بپ پر سوچیں منتشر ہوئی تھیں۔ دوسری طرف امی جان تھیں۔

”کہاں رہ گئے ہو افکن..... کئی ملنے والے آئے ہوئے ہیں کل بہنوں کی بارات ہے۔ اتنے کام ہیں اور تم غائب..... اوہ میں آرہا ہوں امی جان گھر پر راستے میں ہوں۔“ کہہ کر بایک کا رخ گھر کی طرف کر دیا تھا۔ پھر بہنوں کا ولیہ ہونے تک وہ بیشاء کی نظروں سے چھپتا رہا۔ بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی اتنی اچھی لڑکی کے لیے اس نے کیا کچھ برا سوچ ڈالا تھا۔ بہنیں رخصت ہو گئیں تھیں اور چھٹیاں ختم.....

ویسے کے دوسرے دن افکن کی روانگی تھی کچھ سوچ کر وہ بازار چلا آیا تھا۔ تھوڑی سی شاپنگ کی پھر بہت سوچ سمجھ کر جیولر سے بیشاء کے لیے ایک خوبصورت گفٹ بھی خرید لیا۔ ساتھ ہی ’سوری‘ کا کارڈ بھی تھا۔

ویسے کے بعد خالہ جان بیشاء کے ہمراہ جاکر دونوں بیٹیوں کو لے آئیں تھیں کہ اب افکن کے جانے کے بعد یہ واپس آ جائیں گی۔ اس وقت سب ایئر پورٹ پر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے افکن کا سامان بھی گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا مگر افکن غائب تھا۔ بیشاء اپنا پرس لیے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی۔ تب ہی اس نے افکن کو اپنے بیڈروم سے نکلنے دیکھا۔ وہ چونکی۔

”یہ میرے روم میں کیا کرنے گئے تھے۔“ تب

ہی انگن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ نظروں میں شرمندگی کا تاثر لیے وہ اس کی طرف بڑھتا تھا۔ یثاء اس کے قریب آنے پر خوف کے باعث مسمرائز ہو گئی تھی۔ مگر انگن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے خود سے نزدیک کیا اور پیشانی پر اپنی 'محبت' ثبت کی تھی یثاء کے ارد گرد کا سارا ماحول معطر ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی کہا۔

”اپنا بہت خیال رکھنا یثاء صرف میرے لیے۔“

”یہ..... یہ..... انگن ہیں؟“ یثاء نے حیرانگی سے پیشانی پر اس جگہ ہاتھ رکھا تھا۔ نظریں انگن کی سمت انھیں تھیں۔ انگن جیسے دل کی بات سمجھ گیا تھا۔ اثبات میں سر ہلادیا۔ یثاء کو محسوس ہوا کہ فضا میں گنگنا رہی ہیں اور وہ مسکراتا ہوا امی جان کے آواز دینے پر ان کی سمت بڑھ گیا تھا۔

”یثاء اب تم کہاں رہ گئیں بھی.....“ ماما جان کی آواز پر خوشی کے بے پناہ احساس کے ساتھ یثاء تیزی سے اپنا پرس لینے بھاگی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں ایئر پورٹ کی راہ پر گامزن تھے۔ انگن چلا گیا وہ بہت اداس دل لیے واپس آ گئے تھے دوسرے دن تنھن کے باعث کالج نہیں گئی تھی۔ اس نے کسی کام سے اپنی وارڈ روم کھولی تھی تب ہی ایک شارپ پھسل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

”یہ کیا ہے..... ہیں میں نے تو نہیں رکھا۔“ زیر لب کہتے اس نے شارپ اٹھالیا اور بیڈ پر آ بیٹھی چھوٹا سا پیکٹ تھا شارپ کھول کر پیکٹ نکال لیا۔

”سوری“ کارڈ پر درج تھا۔

”اپنی طرف سے کی گئی ہر غلطی اور زیادتی پر بہت نادم ہوں، صرف تمہارا انگن۔“ یثاء کے دل کی کلی کھل گئی تھی۔ اس نے جلدی سے پیکٹ کھولا گولڈ کا

ڈائمنڈ جڑائیس برسلیٹ جگہ گارہا تھا۔ اس نے نکال کر فوراً ہاتھ میں پہن لیا۔ اس گفٹ کو پا کر اس کی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔ کچھ دن بعد انگن نے فون کیا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”گفٹ پسند آیا۔“ رسی ایک سلیک کے بعد پوچھا۔

”ہوں بہت زیادہ..... میں نے پہن بھی لیا ہے۔ آپ نے خود کیوں نہیں دیا، خاموشی سے رکھ کر چلے گئے۔“ یثاء نے خوشی سے سرشار لہجے میں شکوہ کیا۔

”تھینک یو یثاء تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ انگن نے کہا۔

”آپ کب واپس آئیں گے انگن؟“ بے قراری سے یثاء نے پوچھ لیا۔

”جب تم بلا لو گی فوراً واپس کا سفر شروع کر دوں گا۔“

”تو آ جائیں واپس..... اب تو بہنوں کا فرض بھی ادا ہو گیا ہے یہاں سب کچھ تو ہے..... پھر.....“ یثاء نے کہا۔

”میں خود یثاء کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں، اپنی یثاء کے لیے..... جانتا ہوں وہاں سب کچھ ہے مگر وہ سب کچھ تمہارا ہے۔“

”مگر پھر بھی..... تمہیں ابھی کچھ انتظار کرنا پڑے گا یثاء.....“ انگن نے دھیرے سے کہا۔

”اوکے انگن میں زندگی کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ یثاء نے بھرپور انداز میں کہا۔

”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اور انگن کے ارد گرد گھنٹیاں سی بج گئیں تھیں۔ فضا میں گنگنا انھیں تھیں محبت بھرپور انداز سے دونوں پر سایہ فگن ہو گئی تھی غلط فہمیاں ختم ہو گئیں تھیں۔



پاکستان میں ٹین ایچ جی کے لئے ڈائجسٹ

چوتھی ہزار ہمارے شمارے سطر سطر دلچسپ کہانیاں

نوعمر انسٹا پوائٹ نیو کہانی اعزاز شیلڈ نقد انعامات سال کا بہترین ناول سال کی بہترین کہانی

- ہر ماہ ایک مکمل ناول ○ ہر ماہ ایک خاص کہانی
- ہنسنا ہنسا کے لوٹ پوٹ کر دینے والی مزاحیہ کہانی
- 2 قسط وار مزے دار ناول - دلچسپی خوف اور تجسس سے بھر پور
- مہمان مدیر - ہر ماہ ایک سینئر لکھاری کی دلچسپ باتیں ○

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں وہ کہانیاں جو آپ کو کہیں اور نہیں ملیں گی۔

آپ کے پسندیدہ مشہور معروف قلم کاروں کی کہانیاں محلہ محلہ چلنے لگھاری ساتھ ساتھ

مستقل سلسلے

پیغام - اپنے پسندیدہ فرد کے نام آپ کا پیغام رزگار رنگ - شعر، اقتباس، اقوال زریں کتابوں پر تبصرے - ہر ماہ بچوں کی کتابوں پر تبصرہ میرا شہر میرا گاؤں - آپ کے شہر اور گاؤں کا تعارف آدھی ملاقات - آپ کے خطوط - اعتراض - تبصرے - شکایتیں اور محبتیں - میں بہت ہنسا - کوئی اچانک واقعہ، بات، حرکت، جس نے آپ کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا ہو۔

اپنی کاپی آج ہی محفوظ کروا لیجئے

صفحات 160 قیمت 100 روپے

اپنی کہانیاں ان پیج میں ای میل کیجئے۔

monthlynauumerdigest@gmail.com

# بادِ سموم

قسط 23

~~~~~

چولستان کے صحرا سے شروع ہونے والی ٹھنڈی اور میٹھی محبت اور لمحہ لمحہ

بدلتی داستانِ حیات جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی!

~~~~~

جنگل کی سرد خشک اور کھردری زمین پر جب گاڑی کے ٹائر چر چرائے تھے اور ایک شدید جھٹکے نے اس کو پہلو کو بے کراں درد سے ہمکنار کیا تھا اسی لمحے کسی کا کھر درا اور سخت ہاتھ اور لمبی سا کیت انگلیاں اس کے ہونٹوں سے لپیٹ گئیں دل کی آواز جو کراہ کی صورت نکلی تھی وہ بند بوں پر آ کر رک گئی تھی اور اب تک ایک سسکی اس کے من کے بیچ بھنور کی صورت سرگرداں تھی۔ اسی لمحے یہ آہنی ہاتھ دلاور کے لمس سے کس قدر مشابہہ محسوس ہوا تھا کہ پل بھر کو اسے لگا تھا جیسے وہ لوٹ آیا ہے کبھی نہ جانے کے لیے جب تک مٹی کی ٹھیکریوں سے جیپ کے پہرے نکراتے رہے اور ناہموار راستے کی بے قراری دھول اڑاتی رہی، اس کی سانس دل میں اترتے خون کے قطروں کے بیچ گم ہوتی رہی اس ہاتھ کا ناگوار لمس اور تیسری انگشت کا چھلا اب بھی اس کے احساسات میں زندہ تھا اور اب چند لمحات پیشتر شہزادی نے جو کچھ کہا تھا وہ لفظ، وہ حروف ان خشک پتوں کی طرح محسوس ہوئے تھے جنہیں خزاں کی باد یہاں وہاں اڑاتی چیکے سے روپوش ہو جاتی ہے۔ اس نے ماہی کے نازک رخسار پر دھرے سے ہاتھ دھر دیے اور آنسوؤں کی ٹپٹم چہرے پر آ بیگینے کی مانند جھکنے لگی۔

کیسا سفر ہے یہ زندگی کا جس میں سکھ کا پڑاؤ نظر آتا ہے نہ امن و اماں نہ یہاں ٹھکانہ باندھ سکتی ہوں نہ پیچھے کی جانب پلٹ سکتی ہوں۔

”شہزادی ادی..... مجھے حویلی کے بیچ کام دلوا دے..... لالین اور پالی کی طرح۔“ شام کو خالی چنگیر پلٹاتے ہوئے موہل نے کہا۔ بے تاثر آنکھیں ہمیشہ کی طرح اس پر مرکوز تھیں۔

”اور جو میں نے کہا صبح..... کیا وہ تجھے قبول نہیں چو کری۔“ موہل نے جواب دیے بنا نظریں

جھکا لیں۔



آہنی ہاتھ کا دباؤ دل پر محسوس ہو رہا تھا۔ تلسکی کا احساس اس کے خاموش چہرے پر پنہاں نہیں تھا شہزادی اس کے سستے ہوئے نقوش کی چپ کوں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی نگہ کش کی وجہ کیا ہے اگلے ہوئے سوالات کا سراشاہد کہیں نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اس سے بات کیے بنانا نہ سکی۔

”دیکھ بالڑی تو جوان چو کری ہے اس اتنے بڑے بیلے میں اکیلی اس سوئے سوئے کھ کے ساتھ کہاں چھپے گی کیسے کر پائے گی اپنا بچاؤ کراہوں سے، اگر تجھے دھی بنا کر اپنے پاس رکھ بھی لوں پھر بھی دیواروں کے بیچ کب تک چھپاؤں گی تجھے..... یہ زمین بے رحم مٹی کے خمیر میں گندھی ہوئی ہے عورت صرف ایک جنس ہے، تماشا ہے ٹھیلنے کے لیے کھلونہ ہے اور بس..... زمین پر جب بارش کے بعد چند گھنٹاں اگتی ہیں ناتو ہر چرند پرند کی نگاہ ان پر ہوتی ہے۔ بلبل کی کوک جب بن میں پھیلتی ہے ناتو مسافراس کی گونج میں چھپے در کو نہیں جان پاتے نہ ہی ان کے دل میں ہوک اٹھتی ہے وہ تو بس راہ بھٹک کر آواز کی سمت چل دیتے ہیں۔ بے تابانہ..... جانتی ہے کیوں..... شہزادی نے رک کر اسے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھپی بنائی۔

جھپٹنے کو، ہاتھوں میں بند کرنے کو، اس کے پروں کو چھونے کی خاطر اس کی آواز کی تاحیات اپنے آنکھوں ہمیشہ قید کرنے کے لیے..... صرف دل لگی کے لیے..... سب جانتے ہیں چھوڑی کہ تیرا کوئی نہیں..... نہ ٹھکانہ..... نہ آس..... ایسے میں تو صرف ایک پنکھیر دے اور باقی سب بھٹک (بھیڑے) کب تک اپنے پنکھ بند کر کے اندھیروں میں چھپی رہے گی حیات کا سلسلہ بہت لمبا ہے بالڑی..... ابھی بکھری ڈور کی طرح سرا ڈھونڈے گی تو مل نہ پائے گا۔“ مول کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ ہاتھ میں تھے پیالے سے پانی چھلکنے لگا تھا۔

اب شام کے سستے ہوئے سایوں کے درمیاں موسیٰ خان کی آواز نہیں ابھرتی تھی۔ اس کے قدموں سے راستوں کی خاک نہیں لپٹی تھی وہ بادل کہاں تھا جواب آسمان پر سایہ کرنے کو نہیں تھا۔

”کیا خبر وہ لوٹ آئے اور بسرا کر لے سسی کے ساتھ گوٹھ میں وہ بادل گوسی کے آنچل کا حصہ بن گبر تھا لیکن سایہ کرنے کو ایک پل بھی بہت ہوتا ہے۔“

”کس سوچ میں ہے چو کرو..... کیا اب بھی تیرے پاس کوئی جواب نہیں۔“ مول نے چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ یہاں نہیں، کہیں اور تھی۔

”دن گزرتے جائیں گے لیکن حالات نہیں بدلیں گے۔ اگر آسان ہوتا تو بوچھن (اورٹھنی) میں کچھ پیسے گانٹھ کر تجھے یہاں سے رخصت کر دیتی، کسی بھی سفر پر جہاں تو چاہتی۔ لیکن میرے ہاتھ بند ہیں مجبوریوں میں، ہم چا کر کرتے ہیں یہاں ان دیہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے..... آہ اب موسیٰ خان نہیں ہے۔

اس چار دیواری کے بیچ اور غوث بھا..... وہ خود تجھ سے بیاہ کا خواہش مند ہے کیسے جانے دے گا وہ تجھے یہاں سے.....“ مول کے چہرے پر عرصے کے بعد پھر سے زردی چھانے لگی تھی اس کی نگاہوں کے سامنے بھی دلاور خان کا چہرہ ابھرتا تھا اور بھی غوث بخش کا دھندلا عکس..... دل پر مغلوم آہنی ہتھ کے شکنجے کا دباؤ محسوس ہوتا تھا۔ باہر ابھی دن ڈھلا نہیں تھا لیکن اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے تاریکی آج وقت سے

پہلے ہی اتر آئی ہے۔ شاید کبھی نہ جانے کے لیے.....  
 حویلی میں پولیس کی آمد و رفت بڑھ رہی تھی۔ بند کمروں کی آوازیں کبھی بلند ہوتی تھیں اور کبھی سرگوشیوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ سرگوشیاں بھی وہ جو بھی کبھی خاموشی کے طویل لمحوں میں ڈھل جاتی تھیں۔ جب بھی ملاقات کے بعد دروازوں کے چاک کھلتے، علی حسن اپنی مخصوص نشست پر یوں نظر آتا جیسے کسی گہرے کرب سے گزر رہا ہو۔

ہر شب وہ خود سے عہد کرتا کہ اگلے دن کسی سے ملاقات کرے گا نہ بات چیت اور پھر خاموشی سے بہتے سے اُسے خود میں اُلجھا کر بہا لے جاتے۔ ڈھلتی بہار کی ایک طویل نشست کے بعد جب سرکاری جیپ نے گوٹھ کی مٹی کو کھنور بنا کر خاک اڑائی اور جاتی سنہ پہر کا رنگ مٹا لاکر ڈالا تو علی حسن کے قدم اندر جانے کے بجائے بکھے ہوئے دیووں سے بھری مندر کی جانب اٹھنے لگے۔ کچھ پرندے پانی کے حوض میں چونچیں ڈالے بیٹھے تھے۔

علی حسن کے قدموں کی چاپ سن کر ان کے پر پھڑپھڑائے اور ہوا کی لہروں میں ارتعاش اترنے لگا۔ لالہ کچھ دیر پہلے ہی مکئی اور گندموں کے دانوں کو پرات میں ڈال کر لے گئی تھی۔ بیری کے درخت کے قدموں میں جو بوسیدہ پتھروں کی تہہ تھی ان ہی کے پہلو میں اس کے خوابوں کو دفن ہونا تھا۔ کچی مٹی کے کنارے خشک تھے۔ اس پر کھڑے سوکھے پتے اس کے قدموں سے لپٹ رہے تھے جیسے اس کا استقبال کر رہے ہوں۔ شاید بہت عرصے کے بعد وہ اس خاموش بے آباد حصے میں آیا تھا۔ جہاں اب صرف پرندوں کا بسیرا تھا۔

درخت کے سائے میں گزرتی پرانے پانیوں سے کشید زدہ پگڈنڈی کے سرے نم تھے۔ چاہے کبھی علی حسن اپنے قدم آگے کی جانب نہ بڑھا سکا۔ جیسے کسی حصار کی قید میں ہو۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے مکئی کے بیاباں کی بھر بھری مٹی ہواؤں میں شامل ہو کر اس کے گھر کی دہلیز پر بکھر گئی ہے۔ سندھ کی قدیم کہانیوں کے کسی پہرے میں ایسا ہوتا تھا جب ہوائیں خاک بکھیر دیتی تھیں اور ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر ان کی تہوں میں جذب ہو جاتی تھیں۔ ایک نیارنگ بھرے کو ایک خاک کو دوسری خاک میں پیوست کرنے کو تب بارش کی پہلی بوند سے جو کئی پھوٹی تھی۔ اس میں کئی زمانوں کا رنگ جھلکتا تھا گئے وقتوں کی خوشبو اترتی تھی۔

امر ہوتے ہوئے لمحے جب کونپلوں کا روپ دھارتے ہیں۔ علی حسن نے آہستگی سے سر پر جمی پگڑی کے بل ایک ایک کر کے کھولے اور اسے خاک کی تہہ میں بچھا دیا۔ سرمئی پگڑی کا رنگ بھی گہری ہوتی ہوئی شام جیسا تھا اور اس کی آنکھوں میں اترنے والے ملال کا رنگ بھی.....

ایسے ہی بکھرے ہوئے چاند سے دھلی ہوئی رات اترنے والی تھی جب موسیٰ خان بہاؤ پور کے سفر کے لیے روانہ ہوا تھا اور پھر لوٹ آیا تھا تہی دامانی کا سندیسہ دینے لالہ اپنی چنگیر میں الماس کے خشک پتے بھرنے آئی تو کیری مٹی اور کنکروں کی ڈھیری کے پاس اسے سائیں کا پتھر سا وجود نظر آیا آج پہلی مرتبہ اس نے علی حسن کو پگڑی کے بنا برہنہ سرد دیکھا تھا۔ لالہ کے آگے بڑھتے قدم وہیں پانی کی خشک نالی کے قریب رک گئے۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے شام کی ملگجی روشنی میں بیٹھا یہ شخص کوئی اور ہے کوئی مست حال اجنبی یا پھر گرفتار فقر گدا..... آج صبح ہی تو اس نے ریشمی بستر سے اس کی آرام گاہ کو سجایا تھا اور لا جوتی کے پھول شاخوں سے توڑ کر پیالوں میں ڈالے تھے اور پھر یہ پیالے جن کا رنگ سنہرا تھا۔ شیشے کی میز پر سجادیے تھے۔

فرش کی چمک ایسی تھی کہ اس میں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ اب تو کمرے کی سجاوٹ کو کئی گھنٹے گزر گئے تھے اور یہ وقت علی حسن کے آرام کا وقت تھا وہ یا تو اس گھڑی شہزادی کے گھر دار و اسمعیل کو بلا کر بانسری کی دھن سنتا یا پھر گول گول گھومتے، سر بکھرتے پرانے ریکارڈ..... اور اس سے اُسے یوں برہنہ سر کندھے جھکائے حویلی کے اس سنسان حصے میں دیکھا جہاں اس کا گزر شاید برسوں کے بعد ہوا تھا۔ آنکھوں میں سوالوں کے کئی رنگ چھوڑ گیا۔ مہر علی، چاند محمد اور غوث بخش اس وقت کچھ ہی دور حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ لالین کو آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔

”ادا..... وہ سائیں.....“ لالین نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں املا تاس کے پتوں سے بھری چنگیر ہنوز دھری تھی۔

”اماں سوال نہ پچھ..... اندر رسوئی میں جا دی شہزادی تیرا رستہ دیکھ رہی ہے۔ جب تو کھانا پروس لے تو آواز لگا دینا۔“ مہر علی نے اپنی کلائی میں بندھی پرانی گھڑی پر ایک نگاہ کی جیسے وقت کا تعین کرنا چاہتا ہو۔

”بھا..... ابھی تو اندھیرا اترا ہے فضا میں اب بھی پرندوں کا شور ہے، سناٹا ترنے میں کئی گھنٹیاں باقی ہیں جب رسوئی کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی اور زنائیاں کام ختم کر کے اپنے ٹھکانوں پر جائیں گی تب ہی.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اور کیا..... تب تک سائیں وہیں رہے گا..... کچی زمین کے برابر.....“ غوث بخش نے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ جواب اس کے پاس بھی نہ تھا۔ آج جانے کیوں موسیٰ خان کی بہت یاد آ رہی ہے۔ کتنا سوہنا سنگ تھا ہمارا..... جانے کب لوٹے گا وہ اب.....“

”لوٹنے کو کہاں من ہوگا اس کا..... لاڑی کو چھوڑ کر وہ جلد نہ آئے گا۔ آج سائیں بھی اسے یاد کر رہا تھا۔ شاید وہ بھی اس کی کمی کو محسوس کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا سندیسہ بھجواؤ موسیٰ کو..... کہو جلد لوٹے وہ گوٹھ.....“ غوث بخش نے آسمان پر ابھرتے چند ستاروں پر نگاہ کی۔

کہتے ہیں جب سنائے کی آواز شور سے بڑھ جائے تو دل کے تاروں سے اُلجھنے لگتی ہے اور پھر یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ صدا اندر کی ہے یا باہر کی.....

”غوث بھاتی رہی باتیں مشکل ہوتی جا رہی ہیں کچھ سمجھ میں آتی ہیں کچھ نہیں..... خیر تو ہے، کہیں جوگی بن کر جنگل بیلے پھرنے کا ارادہ تو نہیں۔“ غوث بخش نے پچھلے حصے کی جانب دیکھا۔

یہاں سے اڑی اڑی رنگت والے دروازے کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ ٹھکے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں کبھی کبھی ہوا سے لرز کر اس پر جھولنے لگتی تھیں اور کبھی کوئی مدھم سی نازک آواز ذرا دیر کے لیے بلند ہو کر خاموش ہو جاتی تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے سر جھکا لیا۔



”بھرجائی تو ٹھیک ہے نا..... کتنے عرصے سے تُو حیدر آباد بھی تو نہیں گیا تب ہی اداس ہو رہا ہے  
بھا.....“

”نہ مہر علی..... جتنی میرے من کی لگن وہاں ہے اتنی ہی یہاں بھی ہے پھر اُدا سی کیسی..... بس جانے  
کیوں آج وہ دن یاد آ رہا ہے جب ہم نے دلاور خان کے ڈیرے پر وار کیا تھا حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا نہ  
سائیں کا عشق اور نہ جواہر..... بس صرف..... صرف.....“ اس کی آواز بکھر رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے  
اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بالی نے چند ہی لمحوں میں ان کے سامنے دسترخوان بچھا دیا تھا۔  
اس کی آنکھوں میں بھی ان کہا سوال تھا شاید وہ علی حسن کے کمرے پر دستک دے کر مایوس لوٹی تھی اور اب  
کچھ کہنا چاہتی تھی۔

”اماں..... اب آرام کرو..... دسترخوان مہر علی سمیٹ لے گا۔“ غوث بخش نے اس کا چہرہ پڑھ لیا  
تھا۔

”پر بھا..... سائیں.....؟“

”چنی رو رہی ہے میزبان کی..... اسے ضرورت ہے شاید تیری.....“ غوث بخش نے انگشت سے  
دروازے کی جانب اشارہ کیا اور یوں سر جھکا لیا جیسے کچھ اور کہنا اور سننا نہ چاہتا ہو۔  
چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر یوں اوجھل ہو گیا تھا جیسے وہ کبھی اتر ہی نہ تھا۔ تیرگی شب بھی کبھی  
کبھی درماں ہوتی ہے چہرے کے نقوش کو اوجھل جو کر دیتی ہے۔

آنکھوں سے جو تبخیم پھلکتی ہے اسے خاموشی سے اپنے اندر اتار لیتی ہے بھرم رکھتی ہے احساسات کا  
پندار کا لغزش دل کا شب کے آئینے جو بجھے اور مرغزار کی بنیاں گل ہوئیں تو گوٹھ کے کچے راستے پر ایک  
سرکاری گاڑی آئی سیاہ در آھن دھیرے دھیرے کھل رہا تھا اس کے کنارے جھکے ہوئے درد مانوس کا  
بلب ذرا سی دیوکر لڑ کر سناکت ہو گیا تھا دروازہ کھل کر بند ہو گیا اور اندرونی روش پرستی روی سے چلتی  
گاڑی اپنے نقوش چھوڑنے لگی۔ اس کے عقب سے جو دھوئیں کا مٹا مٹا بادل اڑ رہا تھا وہ روش پر بکھرتی  
برق کو دھندلا رہا تھا۔ گاڑی رُکی تو علی حسن نے درخت کا کنارہ تھا مے اس کے پچھلے حصے کو کھلتے دیکھا مہر  
علی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا تھا۔ خاموشی سے انہوں نے گاڑی کی نشست سے کچھ نکالا تو  
کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن دل کی دھڑکن بتا رہی تھی کہ اس لمبوترے چوٹی کس میں کیا ہے۔

خاموشی سے آدمیوں نے اسے لاکر علی حسن کے پہلو میں رکھ دیا۔

”کیا اس میں تم ہی ہو بیلا.....“ ہوا گرم تھی لیکن انگلیاں سرد تھیں ان کی لرزش کو پہلو میں چھپاتے  
ہوئے اس نے دھیرے سے تابوت کو چھوا ہاتھ سرکتا ہوا نقل پر آیا اور رک گیا۔

”اسے نہ ہی کھولیں تو بہتر ہوگا جناب.....“ تابوت لانے والے اس کی وحشت سے آگاہ لگتا تھا۔  
”کبھی کبھی بند حصاروں کا نہ ہی کھلنا بہتر ہوتا ہے۔“ علی حسن کا ہاتھ ہوا میں ساکت رہ گیا۔

”شاید آپ یہ براشت نہ کر پائیں گے جناب.....“ پشت سے ایک سرگوشی بلند ہوئی تھی۔ سچے لفظوں  
کی اذیت میں لپٹی ہوئی سرگوشی..... علی حسن نے ایک ایک کر کے سب کے چہرے پر کھے اور پھر دو قدم  
پیچھے ہٹ گیا۔ تابوت سامنے پڑا تھا مہر علی کچھ دعائیں پڑھ رہا تھا۔ نماز کی نیت کر لی گئی تھی۔ ایک خواب کی

سی کیفیت میں سب کچھ ہوتا رہا اور پھر بیلا کو درخت کے پہلو میں اس کی چھاؤں تلے دفن کر کے اس کی یاد کو امر کر دیا گیا۔ اس شب کی صبح بہت بوجھل تھی۔ جب آخری ستارہ پلک چھپ کر غائب ہوا تو علی حسن کو یوں لگا جیسے شب بیت تو گئی ہے لیکن اس کی تار کی تار اس کے دل کے بیچ بند ہو گئی ہے۔

کچھ ذرے مٹی کے جو اس پاس بکھر گئے تھے۔ اس کے دامن میں بھی آ گئے تھے۔ وہ انہیں بھی سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ گلاب کا ایک ننھا سا پودا جس پر ایک کٹی چمک رہی تھی اس نے مٹی میں گاڑ کر بکھری ہوئی مٹی کو چھوا اور اس کے شفاف قطرے چپکے چپکے برسیں گے تو بیلا کی قبر کے گرد پھولوں کا ایک گنج آباد ہو جائے گا، اُسے پھول بہت پسند تھے جب بھی علی حسن ملاقات کے لیے جاتا کچھ پھول اس کے بالوں میں سجا دیتا اور کچھ اس کی کلاسیوں میں پہناتا، بیلا کو ان کی خوشبو سے ان کے رنگوں سے نزاکت سے محبت تھی۔ شاید اس لیے اس کا نام بھی مثل غنچہ تھا۔

گلاب کی پتیاں جب مٹی میں پرو کر وہ کمرے میں لوٹا تو اپنے عکس اور دیوار کی پشت پر مٹی کی تصویر سے نظریں جراتے ہوئے اس نے خود کو شست پر گر ادیا۔ دل بھی تھک رہا تھا اور جسم بھی یوں لگتا تھا جیسے تمام توانائیاں کہیں کھو گئی ہوں یا پھر خاک کے ذروں نے اوڑھ لی ہوں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس تھامنا چاہا لیکن لرزش نے اس کے ذرے ذرے کر دیے۔ چھنا کوں کی آواز، درتچے سے زینے اور زینے سے آخری سیڑھی تک بلند ہوئی تھی۔ آنکھیں سب دیکھ رہی تھیں لیکن لب خاموش تھے۔ نہ اشارہ نہ سوال نہ استفہام، چہروں سے کچھ بھی تو واضح نہ تھا جیسے بنا گل کے پھول دان پڑے تھے۔ جسے سگریٹ دان میں بچے کچھے ٹکڑے یا آتش دان کی دھول اڑاتی خاک کا سکوت تھا ویسے ہی ایک دوسرے سے لگا ہیں گریز کرتے وہ سب یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان چیزوں کی طرح وہ بھی بے جان ہوں بیلا کی نرم مٹی سے کشید کی گئی آرام گاہ اب کسی سے مخفی نہ تھی۔ دو پہر سے کچھ پہلے شہزادی مول کے کمرے کی جانب آئی تو گھڑی بھر کر رک کر اس نے وہیں نگاہیں موڑ لیں جہاں گزشتہ شام اس نے سائیں کو بیٹھ دیکھا تھا۔ حویلی کی مٹی تو خاص الخاص لوگوں کے لیے ہی وقف تھی۔ یہاں پر خاص حوض کا پانی سیراب کرنے آتا تھا اس کی اماں کہتی تھی کہ مٹی کو جب من پسند جسد مل جائے تو وہ دھرتی پر رنگ بکھردیتی ہے۔ گلوں کی صورت، ہری ٹہنیوں اور گلابی پتیوں کی شکل میں اور اگر ان جاہا جسم چھو جائے تو پھر وہ خشک اور بیابان بن کر سیم اگھتی ہے۔ بنجر ہو جاتی ہے مٹی کا مٹی سے یہ رشتہ بھی کتنا گہرا ہوتا ہے۔

مول آج بچی کے ساتھ ہی سو گئی تھی کھانا جوں کا توں دھرا تھا۔ سر سے سرکتی اوڑھنی میں کچھ سوراخ بن گئے تھے۔ جن کی بوسیدگی سے اس کی غربت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بس چند لمحات ہی وہاں کھڑی رہ سکی کہ پاورچی خانے کے عقبی دروازے سے شاید لالہ نے اسے پکارا تھا۔ ابھی تو وہ روٹیوں کی چھابی بھر کر آئی تھی اور دھاتی گلاسوں میں چھانچہ بنا کر اس نے بالی کو چاند محمد کے ساتھ بالائی کمرے میں بھیجا تھا دن کا دوسرا پہر شروع ہو رہا تھا لیکن علی حسن کا کمرہ اب تک بند تھا۔ اندر کوئی آواز، کوئی سرسراہٹ نہ تھی۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہی دن چڑھا تھا جب موسیٰ خان نے علی حسن کو بے ہوش پایا تھا اور اب تو وہ مجسم یاد کی صورت درخت کے کنارے آسائی تھی۔ وہ کون تھی کہاں سے آئی تھی کسی کو علم نہ تھا۔ بس اتنا علم تھا کہ اس قدیم درگاہ سے متصل مٹی وجود خاص کے لیے ہی وقف تھی۔

اس سے پہلے علی حسن کی رفیق زندگی اور جند بانو کو درگاہ کے اندر اپنے بابا کے ساتھ ہی سپرد خاک کیا گیا تھا۔ اور اب پھولوں کے گنج کو بیلا کے لیے وقف کر دیا گیا تھا اندر لائن کپڑے سے ڈھکی ٹشتری لیے کھڑی تھی۔ ایک قدم پہلی سیڑھی پر تھا اور دوسرا زمین پر.....  
 ”کیا ہوا لائن خیر تو ہے..... میں تو کام ختم کر کے نکلی تھی۔“

”ادی شہزادی..... وہ اوپر سائیں کا دروازہ اب تک بند ہے۔ صبح سے شام ہونے کو آگئی ہے اور۔“  
 ”سائیں تمام رات سو نہیں سکا ہے لائن..... اور وجہ شاید ہم سبھی کو علم ہے۔ تو برتن واپس لے آ..... گھڑی بر میں جب چاند بھا آئے گا تو دوبارہ بھیج دینا۔“  
 ”کیا یہ وہی ہے جس کی صورت اندر لگی ہے سائیں کے کمرے میں.....“ لائن نے سرگوشی کی۔

”گمان تو یہ ہی ہے لائن لیکن اپنی آواز کو دل میں دبا دے جو سوال تیرے دل میں ہے اس کا جواب دکھ دینے والا ہوگا اور یہ دیواریں اسی دکھ کو چھپانا چاہتی ہیں۔“  
 لائن کی آنکھوں کا ابہام اور بھی گہرا ہو گیا لیکن وہ خاموشی سے رسوئی کی جانب پلٹ گئی شہزادی نے اوپری منزل کی جانب دیکھا۔ سوالوں کی ڈور کا آخری سرا شاید مول کے کمزور وجود کے ساتھ بندھا تھا، لا حاصل جواب کی طلب تک شاید اسے خانہ بند میں ہی رہنا تھا اور شاید اس کے بعد بھی..... کہ کچھ جواب زہر جو کارڈ پارلہو ہوتے ہیں آج اسے اس بات کا تعین ہو چلا تھا کہ غوث بخش ہی ہے جو اس کے لیے راہ نجات ہے وہ کچھ سوچ کر پلٹی مول کے کمرے کی طرف چال دیھی تھی اور فیصلہ کن بھی.....  
 ”سن بالڑی مجھے لگ رہا ہے جیسے وقت کم ہے تو شاید جانتی نہیں کہ باہر کوئی خاک میں آسویا ہے۔“  
 مول کے چہرے پر تذبذب اتر آیا۔

”کیا جانتی ہے تو اسے..... کوئی رقا صہ تھی شاید سائیں کی محبوبہ..... تیرے گھر وارو نے ہی اس کا قتل کیا تھا شاید زیادتی کے بعد.....“

ایک آندھی سی چلی تھی اور مول کو اڑا لے گئی۔ شب و روز کی جانب ایک ہی لمحے میں بیلا کا چہرہ اور اس کی دلاویز مسکراہٹ نگاہوں کے سامنے یوں سرسرا نے لگی تھی جیسے وہ سامنے ہی ہو اس کے بالقابل اس کے ہاتھ کا لمس مول کو اپنی سرد انگلیوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ وعدہ یقین، امید کے لفظ اب بھی گونج کی صورت سماعتوں کے بیچ مدفن تھے۔ وہ تو دلاور خان کے در پر وقت آخر تک اس کے سندیے کی منتظر رہی تھی امید کا جو چراغ وہ اپنے پیچھے جلتا چھوڑ آئی تھی وہ تو اسی دن بھگ گیا تھا جب بیلا نے اسے الوداع کہا تھا۔ مول کے ٹھنڈے ہوئے ہاتھوں نے شہزادی کو تھام لیا۔

”وہ آگ اب تک بجھی نہیں..... نہ ہی طوفان کا زور تھا ہے۔ تیرے گھر وارو کے جانے کے بعد بھی آسمان میں وحشت اور تندگی کا رنگ باقی ہے۔ جانے کیوں مجھے سائیں کی خاموشی سے خوف محسوس ہو رہا ہے کبھی کبھی اس قدر چپ دل کو واہموں سے دھلا دیتی ہے۔ غوث بخش سے نکاح کر لے بالڑی..... وہ تجھے یہاں سے لے جائے گا۔ چار دیواری کی امان میں.....“

”شہزادی کی سرگوشیاں گزرے لمحوں کی چاپ بیلا کی مدھم آواز اور دلاور کی ضرب سب مل کر ایک بھنور کی صورت مول کے گرد رقصاں ہو گیا تھا۔ بھی وہ شہزادی کو نکلتی، کبھی چچی کو اور کبھی چار گز کے روزن

سے چھلکتا آسمان کا رنگ.....

”تو کیا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔“ بندھنوں مشکل سے وا ہوئے۔ شہزادی کی آنکھیں آبدیدہ تھیں۔ موٹل کی بوسیدہ اڑھنی کا کنارہ لرزے لگتا تھا اس کی آنکھیں اس ستارے کی مانند دکھ رہی تھیں جو ڈوبنے سے پہلے لھر لھر صبح کی اوس میں بھیگ جاتا ہے۔ شہزادی نے اس کے بعد کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ اچھا نہ برا۔ بس اپنے مکان کی جانب جاتے ہوئے اس نے اسمعیل کے ذریعے غوث بخش کو بلا بھیجا۔

آنکھن میں رکھی گٹھولی پر ایک بوسیدہ بکس کھلا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی اجرک میں لپٹا سرخ جوڑا اور گولٹا گادوپٹہ، کروشیے کے دھاگوں سے بنا سنہرا پراندہ اور یہ جوڑا پچھلے ہفتے ہی وہ لائی تھی گوٹھ کی عروسی دکان سے، غوث بخش بھی اس کے ہمراہ تھا۔ چوڑیاں لینے کے لیے وہ جب انگلی دکان پر کی تھی تو اسی نے ہری چوڑیوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”بھانجھے یہ چوڑیاں پسند ہیں تو خرید لے۔“

”نہ جانے اُسے کیسی لگیں گی۔“

”سوئی لگے گی بالائی انہیں پہن کر..... لے لے بھانجھے۔“

”کیا قبول کر لے گی میزان یہ سب.....“ غوث بخش جھک رہا تھا۔ تب شہزادی کی آنکھوں میں یقین سا اتر آیا تھا۔

”وہ مان جائے گی بھانجھے.....“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”یہ جوڑا اور چوڑیاں میرے پاس تیری امانت بن کر رہیں گی کہتے ہیں جب کوئی عروسی جوڑا اور گہنے پورے دل کے ساتھ خرید کر کسی کے پاس امانت رکھوادے تو بنری کے دل میں رنگوں کی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ جیسے قوس و قزح پھوٹی ہے۔“

بینہ برسنے کے بعد اسی طرح اس کے آنسوؤں کے پار جب تیری سوچ کی کرن اترے گی تو دھنک سے اس کی من کی دھرتی سجنے لگے گی۔ غوث بخش اس کے مکان کی چوکھٹ پر آ کر رک گیا تھا۔ ہاتھوں میں بند باریک کاغذ سے سنہرا گلو بند جھانک رہا تھا۔

”اندر آ جاؤ بھانجھے..... باہر کیوں کھڑا ہے؟“

”تیری دہلیز پر جھک کر شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں ادی.....“ شہزادی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”میں کسی کی ماں نہیں بھانجھے..... نہ ہی گوٹھ کے کسی بچے کو اپنے پلو سے باندھ کر رکھ سکتی ہوں اور اب حویلی کے اس ٹوٹے پھوٹے کمرے کے بیچ جو بالائی ہے اس کے دکھ نے میری سانسوں کو ہلا دیا ہے۔ نہ جانے یہ ایک ماں کا دکھ ہے یا دردمندی کا احساس کہ اسے ٹھکانہ ملنے پر میرے دل کو قراٹل جائے گا۔“

”آج رات ہی ہوگا نکاح ادی..... پھر میں اسے حیدر آباد لے جاؤں گا سویرا ہونے سے پہلے ہی.....“

”تیرا بھلا ہوا دادا..... کیسا نیکی کا کام کیا ہے تُو نے..... ایک بے سہارا بالائی کے سر پر حفاظت کا ہاتھ رکھ کر پناہ دی ہے۔ کیا تیرے بلی جانتے ہیں یہ سب.....“

”آج ہی بتایا ہے اُن کو.....“ غوث بخش کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیسا سوہنا جوڑا ہے یہ..... اور پرانہ لالی، سرمہ سب میرے پاس ہے، لالں بالوں میں یوں پرانہ پروتی ہے جیسے بال نہ ہوں سیاہ گلاب کی کلیاں ہوں..... تو دیکھنا بھ..... لالی سے اس کے زرد گالوں پر گلال پھیل جائے گا۔ بس خوش رکھنا بالڑی کو..... اپنے وعدے کی لاج رکھنا۔“ شہزادی نے چولہے سے راکھ جھاڑ کے آگ جلائی اور بوندی بنا کر گڑ کے شیرے میں ڈال دی۔ اس کا گلابی رنگ آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔ چھاپھ کے پیالوں میں بوندی ٹپکا کر اس نے گول طشتری کو سجا دیا۔ کل ٹی شپ کتنی تاریک اور اُداس تھی اور آج چاند اتر رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ٹھنڈک اور مسرت تھی جانے ایسا واقعی تھا یا نہیں لیکن غوث بخش کو یہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ آسمان کا رنگ بھی اور تھا اور زمین کا رنگ بھی اور..... سفید جوڑے پر نیلگوں اجرک لپیٹے ہوئے اس کی آنکھیں ذرا سی دیر کو مسکرائیں شاید مدت بعد اس کو شادمانی کا احساس ملا تھا۔

”آج وہ اپنی بوسیدہ بوچھن اتار کر لال دوپٹہ اوڑھے گی اور آنکھوں کو سیاہ حاشیوں میں پروئے گی۔ اس کے زرد گالوں پر جب لالی بکھرے گی اور سنگھار کے چمکدار ذروں سے کرن پھوٹے گی تو اس کے دل میں صحرائی اونٹ کی طرح سر جھکائے، خاموش جذبوں کی گھنٹی دھیرے بج اٹھے گی اور ایک نئے سفر کا اعلان اس کے تھکے ہوئے لہو کو پھر سے رواں کر دے گا۔“

شہزادی نے مول کے سامان کی پٹاری کھول کر تپائی پر رکھی اور سندھی سہاگ گیت گانے لگی۔ اس کی آواز مدھم تھی۔ ایسا ہی گیت کبھی سانولی اور رومانے مل کر اس کے لیے گایا تھا اور آج بول بھی وہی تھے اور لے بھی وہی لیکن مزاج کا آئینہ کسی کو مشکل میں ڈھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لالں نے آ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور سیاہ مہندی کے چھلے بنانے لگی دونوں عورتیں ہنس رہی تھیں اور شوخ جملوں سے مول کے چہرے پر رنگ بکھیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”کچھ دن تیری مانی کو اپنے پاس رکھوں گی.....“ شہزادی نے گز بھر کے زرد ریشمی کپڑے میں سوئی ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی ماہر انگلیاں تیزی کے ساتھ گھوم رہی تھیں ذرا سی دیر میں باریک گوٹے والا کرتا تیار ہو گیا۔ زرد رنگ پر سنہرا گونڈھ خوب پھب رہا تھا۔ مانی کو کرتا پہنا کر اس کے گالوں پر بھی لال لگاؤں کی شہزادی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مجھے جوڑا تو پسند آیا ہے نامول، سچ کہتی ہوں غوث بھانے بہت چاہ کے ساتھ لیا تھا اور یہ جوڑیاں بھی..... اللہ تیرا سہاگ سلامت رکھے۔“

”سچ کہتی ہوں ادی..... اب چو کری کی نئی زندگی شروع ہوگی۔ سفر کیسا بھی ہو آخری موڑ اچھا ہو تو راہ کی دھول مٹی پاؤں کے چھالے سب بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ تو دیکھنا مول بس کچھ ہی دنوں میں تو اپنا دکھ اور یہاں گزرے ہوئے دن بھول جائے گی۔ رب نے انسان کے دل کو بہت سی تہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تہہ پر ضرب لگے تو دوسری تہہ اسے اپنے اندر سولیتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے اس ضرب کا درد ختم ہو جاتا ہے۔“

”واہ لالں آج تو بڑی سیانی باتیں کر رہی ہے۔“ شہزادی نے سوئی میں نیا دھاگا ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تو لاڑی سے پوچھ کیوں چو کرو سچ کہا نا میں نے..... گزرا وقت اگر دہلیز میں نہ ڈوبے تو تھرے

میرے جیسا کمزور انسان تو پچھلے وقتوں کا گریہ کرتے کرتے جان سے ہی گزر جائے۔ مہول نے بنا کچھ کہے سر جھکا لیا۔ شاید لالٹھیک کہہ رہی تھی۔

فلک شیر لوٹ آیا تھا۔ شہباز کے گھر کے باہر جو گلی ندی کی جانب جاتی تھی اسی کے کنار یوں پر اس کی لاری آڑ کی تھی۔ جانے کب سے پیاسے دھن اور تھکے ہوئے قدموں نے چند گز کا فاصلہ عبور کیا۔ گرد آلود بالوں اور بکھرے لباس کے ساتھ وہ جب دہلیز کے پاس آیا تو چھت کے کھلے روشن دان سے شہر بانو نے اُسے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر گرد کی اس قدر تھیں تھیں کہ اصل نقوش کہیں گم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ شہر بانو نے اپنا لبادہ سنبھالا اور زینے کی جانب جاتے ہوئے اس نے فrazanہ کو پکارا۔

”لور..... فرزاندہ دیکھ تو روزن کے باہر، فلک شیر آ گیا ہے۔“

”فلک آ گیا ہے۔“ فرزاندہ سے ماں ماں سے صاحبان اور شہباز سب کے لبوں پر اس کا نام آڑ کا تھا۔ شہباز نے دروا کیا تو فلک شیر اس کے پہلو سے آگیا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے لہو بہہ رہا تھا اور گردن پر زخم کے نشانات تھے آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں۔ شہر بانو کی مسکراہٹ ایک ہی لمحے میں ختم ہو گئی۔

اس نے بے چینی سے فلک شیر کے ہاتھ تھام لیے۔

”زوئے کیا ہوا..... تو ٹھیک تو ہے؟ تیرے چہرے پر خون اور جسم پر زخم..... کیا ماجرا ہوا؟“ فلک شیر شہباز کے سہارے بمشکل چند قدم چلا اور پلنگ کا کنار اچھوتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بمشکل شہباز نے پانی کے چند گھونٹ اس کے حلق میں پکائے۔ وہ یوں خاموش اور خستہ حال لگ رہا تھا جیسے کسی گردبار تند طوفان سے نبرد آزما ہو کر آیا ہو۔

”تو چپ ہے زوئے..... لیکن میرا من جانتا ہے سب کہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا۔ تجھے روزن قید سے آزاد ہونا ہی تھا۔ تجھے یاد ہے جب تو نے مجھے اور فرزاندہ کو لب دریا الوداع کہا تھا اس وقت مجھے یقین نہ تھا کہ تجھے پھر سے دیکھ پاؤں گی۔ حالات کا زور تیرے حق میں نہ ہوگا جانتی تھی میں..... جب فرزاندہ لور شام کو آس کا دیا جلا کر چوکھٹ برکتی تھی تو میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہتی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے دیا جلتے جلتے تھک جائے گا لیکن تو نہیں آئے گا۔ اور اب تجھے اچانک یوں سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سنگین خان کے ڈیرے سے نکلنا ناممکن حالات میں ہی ہوا ہوگا..... فلک شیر نے سرخ ہوتی، تھکاوٹ زدہ آنکھیں کھول کر شہر بانو کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”خانم آپ نے سچ کہا ہے۔“

”بھاگا ہے ڈیرے سے؟“ چند لمحات تاہل کے بعد شہر بانو نے پوچھا۔

فلک شیر کے خشک لبوں نے جنبش کرنے کی کوشش کی جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا فرزاندہ خاموشی سے نیم کا مرہم اور گرم پانی لے آئی تھی۔ شہر بانو اور صاحبان نے صاف کپڑے کی پٹیاں مرہم میں بھگو کر فلک شیر کے زخموں پر رکھ دیں یوں لگتا تھا جیسے جنگل کے بکھرے ہوئے خارزاروں نے اس کے بدن کو چھید دیا ہو۔

(جاری ہے)



# **E- LEARNING with SCLD**

**An Activity Based learning Program & therapies designed for  
children with Special needs.**

**Duration: 50 days**

**KEY FEATURES: ACTIVITY BASED LEARNING WITH SPECIAL EDUCATORS,  
PROPER GUIDANCE FOR PARENTS, TELE-SESSIONS WITH  
THERAPIST**

**COURSE CHARGES: 10,000/- INCLUDING TELE-SESSIONS OF  
THERAPIES**

**★ CONTACT US: 03343117002 , 03202632430**

## تجدید محبت

~~~~~

اور پھر گھر سے دو جنازے نکلے، ایک
محبت کرنے والے کا اور دوسرا.....

~~~~~

”اماں..... کنوا دو اس درخت کو بیج کہہ رہی  
ہوں کم از کم میری زندگی میں سکون آ جائے گا۔“  
عاشی نے تمام زرد پتے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں  
ڈالے اور پائپ سے فرش پر پانی ڈالتے ہوئے بولی  
اور اماں صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

آج انوشہ کی انیسویں سالگرہ تھی اور مہمان  
اماں بابا اور عدیل تھے انوشہ بڑے اہتمام سے تیار  
ہوئی تھی اماں بابا تو گھر میں ہی تھے ایک مہمان ابھی  
تک غائب تھا تو بھلا کیک کیسے کئے انوشہ کو شدت  
سے عدیل کا انتظار تھا۔

”اتنی دیر.....؟“ عدیل کے گھر میں داخل  
ہوتے ہی انوشہ کا بے تاب انتظار شکوہ بن کر لبوں پر  
آ گیا۔

”سوری سوری ایک کام میں پھنس گیا تھا۔“  
عدیل کے ہاتھ میں گفٹ کا ڈبہ بھی تھا۔

”ارے بھئی اب کیک کاٹ بھی لو اب تو بھوک  
لگنے لگی ہے۔“ بابا نے بات بڑھنے کے ڈر سے اس

چلو پھر آج ہم تجدید محبت کرتے ہیں  
چلو پھر بیج بوتے ہیں

محبت کے

تیرے دل میں

میرے دل میں

چلو پھر سینچتے ہیں ہم وفا کی آبیاری سے

چلو پھر آج تجدید محبت کرتے ہیں

آج پھر دو پہر میں آندھی چلی تو بڑے سے صحن  
میں لگے جامن کے درخت نے گویا اس سے فائدہ  
اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو زرد پتوں اور پکی ہوئی  
موٹی موٹی جامنوں کے بوجھ سے آزاد کر لیا اور نوخیز  
پتوں اور کچی جامنوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

”کیا ضرورت ہے اس جامن کے درخت کی  
بلا وجہ سر پر کھڑا ہے اب دیکھو صحن میں جا بجا جامنی  
نشان پڑ گئے ہیں اپ رگڑتے رہو اسے۔“ عاشی  
با آواز بلند بڑبڑا رہی تھی تاکہ اماں تک آواز پہنچ سکے  
اور اماں خاموشی سے کچن میں کام کرتے ہوئے  
کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔



”انوشے سب سمیٹو سونے کی تیاری کرو۔“  
اماں نے جھگڑا بڑھتے دیکھا تو اسے دوسری طرف  
مصروف کر دیا اور بابا اور وہ سونے کے لیے اپنے  
کمرے کی طرف چل دیے۔

”ناراض ہو۔“ عدیل نے شرارت سے پوچھا۔  
”آؤ ہم مل کے یہ پودا لگائیں۔“ عدیل نے  
اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کچے صحن میں لے آیا۔

انوشے کے والد نے کبھی یہ پلاٹ خرید لیا تھا اور  
ضرورت کے دو کمرے ڈال کر یہاں ان بے  
حالات نے مزید اجازت نہ دی کہ اپنے گھر کو مزید  
تعمیر کر سکتے لہذا کافی جگہ اب صحن کی شکل میں تھی جو  
کہیں سے پکا کہیں سے کچا تھا انوشہ اکلوتی اولاد تھی  
جگہ کی کوئی تنگی نہ تھی جبکہ عدیل انوشے کی خالہ اکلوتا  
بیٹا جو کچھ عرصہ پہلے ہی ماں باپ کے انتقال کے  
سبب تنہا ہو گیا تھا گھر قریب ہونے کی وجہ سے اب  
کھانا پینا ان لوگوں کے ساتھ ہی تھا البتہ رات ہوتے  
ہی اسے یہاں رکنے کی اجازت نہیں تھی عدیل کو اپنی

کی توجہ ایک پر کروائی جو فریق میں پڑا کٹنے کا منتظر  
تھا۔ کھانے کے بعد تحائف کھولنے کی باری آئی  
جانے کب اماں بابا نے اس کے لیے گفٹ خرید لیے  
تھے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس نے گفٹ  
کھولنے شروع کیے۔ بابا نے چھوٹا سا سونے کا  
لاکٹ جبکہ اماں نے ایک سوٹ دیا اصل بے چینی  
اسے عدیل کے گفٹ دیکھنے کی تھی۔

”یہ کیا.....؟“ ڈبے میں سے چند بچ اور ایک  
پودا نکلا۔ وہ حیرت سے عدیل کو دیکھنے لگی۔ اتنا تو  
اسے معلوم تھا کہ آج کل شجر کاری مہم چل رہی ہے  
لیکن کوئی تحفے میں یہ بھی دے سکتا ہے اس کی اسے  
توقع نہیں تھی۔

”پسند نہیں آیا؟“ عدیل نے سوالیہ نظروں سے  
دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”یہ بھی کوئی دیتا ہے کیا؟“ عدیل نے صرف اس  
کا خالہ زاد تھا بلکہ منگیتر بھی تھا اور منگیتریوں سے  
لڑکیوں کو بڑے رومانوی تحائف کی توقع ہوتی ہے۔



تھی۔

آج اسے عاشی کے منہ سے یہ بات سن کر اچھا نہیں لگا چند دن بعد ہی صارم اور عاشی کی شادی ہو جانی تھی اسی کی تیاریاں آج کل زور و شور سے جاری تھیں۔

اچانک اس کے سر سے سایہ کھینچ لیا گیا عدیل کا ایکسٹنٹ صرف عدیل کی جان نہیں انوشے کی زندگی سکون نیندیں بھی لے گیا۔ شادیوں کو مقررہ وقت پر ہی منعقد کیا گیا۔ جامن کے زرد پتے ادھر ادھر آج بھی بکھرے تھے جنہیں بڑی محبت سے وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے سمیٹا کرتی تھی۔ بہو کے اٹھنے سے پہلے پہلے وہ آنگن کی صفائی کر دیا کرتی تھی۔ اس نے بہو کے چہرے پر ناگواری کے آثار جو دیکھ لیے تھے۔

”اماں یہ درخت کنوارا ہوں یہاں ایک کمرہ بنوانا ہے ویسے بھی یہ درخت بھی بوڑھا ہو گیا ہے۔“ صارم کے یہ الفاظ اس کی سماعت پر گویا بجلی بن کر گرے تھے۔

”لیکن صارم بیٹا یہ تمہارے بابا کی نشانی ہے۔“ آواز میں دم نہیں تھا التجا تھی۔

”فیصلہ ہو چکا تھا پرانی چیزوں کو گھر سے نکالنے کا دوسرے دن ہی سے درخت کی کٹائی کا کام شروع ہوا ہر ضرب پر انوشہ پیٹھتی چلی گئی درخت کی لاش کیا گری انوشے اور عدیل کی محبت کی کہانی ختم ہو گئی سانس کی ڈور تو جیسے عدیل کے ہاتھوں سے لگائے درخت کے ساتھ بندھی تھی شاید اب عدیل اور انوشے کی روحوں کے ملن کا وقت آ گیا تھا اس لیے گھر سے دو جنازے نکلے ایک محبت کرنے والے کا اور ایک محبت کو ہرا بھرا رکھنے والے درخت کا جسے عدیل نے Tree Love کا نام دیا تھا۔

□□.....□□

یہ کزن بہت پسند تھی۔ جاب ملتے ہی اماں نے اس کزن کو اس کے نام کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔

”دیکھنا انو جیسے جیسے ہماری محبت بڑھے گی ویسے ویسے ہمارا یہ پودا بڑھے گا اور جب ہمارے بچے ہوں گے تو ہم انہیں بتائیں گے کہ یہ ہرا بھرا درخت ہماری محبت کی نشانی ہے۔“ پودا زمین میں دبا کر وہ انوشے کے ہاتھ تھا جسے تجدید محبت کر رہا تھا انوشے بری طرح شرملا گئی۔

☆.....☆.....☆

وقت نے ایک قدم آگے بڑھایا اب انوشہ عدیل ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی اسی گھر میں شفٹ ہو چکا تھا ننھا سا جامن کا درخت بڑی شان سے ان کے آنگن میں کھڑا تھا اس میں پہلا پھل بھی آچکا تھا۔ اور ان کے چوں میں بھی خوشی کے ثمرات صارم اور عرشہ جسے سب عاشی کہتے تھے کہ شکل میں آچکے تھے۔

ان کا چھوٹا سا گھر محبت کے بادلوں ڈھکا ہوا تھا محبت کی برکھ غیر محسوس انداز میں ان کے جذبوں کو سرشار رکھتی کوئی برا وقت ان کی محبت کی طاقت کے سامنے نہ ٹھہر سکا زندگی تو جیسے ہلکے ہلکے سروں میں کوئی محبت کا نغمہ گنگنائی گزر رہی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ گھر کے نقشہ میں تبدیلیاں ضرور آئیں تھیں لیکن جامن کا درخت اسی طمطراق سے کھڑا تھا۔ اسی درخت کی چھاؤں میں اماں بابا کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ اور اسی درخت کی شاخوں سے رسی باندھ کر جھولا ڈالا گیا تھا جس پر سارا سارا دن عاشی جھولا کرتی تھی اور اپنی سکھیوں کے سنگ پکی پکی جانوں پر خوب نمک مریچ ڈال کر کھایا کرتی تھی۔ اسی درخت کی اونچی اونچی شاخوں پر بہت سے آشیانے گھنسلوں کی شکل میں تھے چڑیوں کی چوں چوں تو گویا ان کی صبح کا لازمی حصہ بن گئی

## دوشیزہ ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

▶ ..... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے جس کا گزشتہ چالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

▶ ..... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

▶ ..... اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

▶ ..... پوری دنیا میں پھیلے اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

▶ ..... اس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

▶ ..... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

▶ ..... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔

▶ ..... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔

▶ ..... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں

اضافہ کرتی ہے۔  
شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

**II C-88** فرسٹ فلور، خیابان جامی کرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبر: 34930470 - 021-34934369

# لوٹ آ جانے والے

~~~~~

مرد آخرا تانسفاک کیوں ہے شوہر کے
روپ میں بھی اور بیٹے کے روپ میں بھی.....

~~~~~

کرار گرد درختوں سے آن کی آن میں ان گنت  
رنگ برنگے مقامی و غیر مقامی پرندے وہاں اکٹھے  
ہو گئے۔ یہ رجمہ کا روز کا معمول تھا۔ وہ روزانہ دو  
وقت پرندوں کو دانہ ڈالتی تھی۔ ان میں کچھ پردیسی  
پرندے تھے جو کسی دوسرے علاقے سے خوراک کی  
تلاش میں عارضی طور پر ہجرت کر کے وہاں آئے  
تھے لیکن رجمہ کی محبت اور شفقت نے انہیں ایسا  
باندھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو کر رہ گئے  
تھے۔

پرندوں کا شور و غل سن کر کالی اور سفید دو بلیاں  
پودوں میں سے نمودار ہوئیں اور خرماں خرماں چلتی  
ہوئی رجمہ کے قدموں میں آ کر لوٹ پوٹ ہونے  
لگیں۔ کالی بلی جوان اور تین بچوں کی ماں تھی جبکہ  
سفید بلی بوڑھی اور بیوہ تھی۔ اس کا شوہر کچھ سال قبل  
کسی منچلے کی گاڑی تلے آ کر کچلا گیا تھا اور اس کے  
چار بچوں میں سے دو بچے سردی سے مر گئے تھے اور  
باقی دو جوان ہوتے ہی اسے چھوڑ کر کہیں چلے گئے  
تھے۔

گھر کے وسیع دالان میں جھولتی کرسی پر بیٹھی وہ  
اپنے چاندی اترے بالوں کو جو کہ اب برائے نام ہی  
رہ گئے تھے، اپنے پتلے پتلے سلوٹ زدہ ہاتھوں  
سیاہ چھوٹے سے گول ربڑ کی مدد سے سمیٹنے میں  
مصرف تھی۔ اس کے بالوں میں ایک بھی سیاہ بال  
باقی نہیں بچا تھا۔ وہ زندگی کی لگ بھگ اسی بہاریں  
دیکھ چکی تھی پھر بھی ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی۔  
اگرچہ اس کے گھٹنے اب جواب دینے لگے تھے۔ وہ  
اپنے بالشت بھر بالوں کو سمیٹ کر ہاتھوں کی مدد سے  
گھٹنوں کو سہارا دے کر اٹھی اور کرسی کے پاس بڑا  
ایک پلاسٹک کا ڈبہ اٹھا کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی  
دالان سے باہر ایک بڑے سے باغ نما باغیچے میں  
بے لکڑی کے بیج بر آ کر بیٹھ گئی۔

اس نے آہستگی سے پلاسٹک کا ڈبہ کھولا اور اس  
میں موجود باجرے اور بجلی ہوئی سوکھی روٹیوں کے  
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے ٹکڑے بھر بھر کے لان میں  
بکھیرنے لگی۔ اس دوران وہ منہ سے ایک خاص قسم  
کی آواز بھی نکالتی جاتی تھی۔ اس کی مخصوص آواز سن

سے عزت کی روٹی میسر آ رہی ہو تو دوسرے در پر  
نظریں نہیں جماتے۔“ وہ بانو کی کمر سہلاتے ہوئے  
شکایتی کم ملتبیانہ انداز میں بولی۔

بانو سے رحیمہ کو خاص قسم کا انس تھا۔ شاید بانو  
میں اسے اپنی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

کئی سال پہلے رحیمہ کا شوہر بھی اسے داغ  
مفارقت دے گیا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا حصول تعلیم  
کے سلسلے میں امریکہ گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

پرندے دانہ دھکا چکنے کے بعد اپنے اپنے گھروں  
کو لوٹ چکے تھے۔ شبو کے بچے جب ٹھیل کود کر تھک  
گئے تو دودھ پینے اپنی ماں کے پاس دوڑے چلے  
آئے۔ شبو نے منہ لٹکاتے ہوئے رحیمہ کی جانب  
سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے گھر کے ملازم اکبر  
کو آواز لگائی۔

”ارے اکو میاں! اب آ بھی چکو، بھیا۔ دیکھو  
تو یہ ننھے فرشتے کیسے بھوک سے بلبلانے لگے ہیں۔“  
رحیمہ نے بچوں میں سے ایک کو پکڑنے کے

”اے شبو، گھوڑ ماری! یوں دیدے پھاڑے ان  
معصوموں کو کیوں گھورے جاوے ہے تو؟“ رحیمہ  
نے، اپنی کالی بلی کو جسے پیار سے وہ ’شبو‘ کہہ کر بلاتی  
تھی، لان میں دانہ چگتے پرندوں کو لالچائی نظروں سے  
گھورتے ہوئے دیکھا تو ڈانٹ کر بولی۔

”بتائی دے رہی ہوں میں تجھے، اگر ان کی  
طرف میلی آنکھ سے دیکھا بھی تو مجھ سے برا کوئی نہ  
ہو دیگا۔“

شبو اپنی مالکن کی ڈانٹ سن کر ایک دم سے دبک  
کر بیٹھ گئی۔

سفید بلی جسے رحیمہ پیارے سے ’بانو‘ کہہ کر  
بلاتی تھی، اپنی دم لہرائی ہوئی اس کی ٹانگوں سے اپنا  
جسم مس کرتے ہوئے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار  
کرنے لگی۔ رحیمہ نے پیار سے دونوں ہاتھوں سے  
اسے اٹھایا اور اپنی گود میں بٹھالیا۔

”اری بانو! اس کبخت ماری کو تو ہی کچھ سمجھا کہ  
انتانیدہ پن ٹھیک نہ ہووے ہے۔ جب ایک در



الدین مینشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ رحیمہ کی دیکھ بھال کے لیے اکبر سارا دن علیم الدین مینشن میں رہتا تھا اور رات گئے اپنے کرائے کے گھر جاتا تھا۔

”اے ہے دیکھو تو ذرا اس چھوڑے کو، اپنی جورو کے سامنے کیسے بچھا جاوے ہے۔ اے بھیا! اپنی اس ناہنجار بیوی کو سمجھاؤ کہ میاں اور بیوی ایک گاڑی کے دو پیپے ہووے ہیں۔ دونوں میں سے اگر ایک بھی دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرے تو زندگی کی یہ گاڑی ڈانوا ڈول ہو جاوے ہے۔“

”ہاں، اماں! تو ٹھیک کہتی ہے لیکن اسے کون سمجھائے۔“ ڈبے میں سے باجرے کے بچے اٹھانے چن کر منہ میں ڈالتے ہوئے وہ مایوسی و پجاریگی سے بولا۔

”اے ہے، دیکھو تو، کبختی مارا، کیسے کبوتر کی مانند ’نک نک‘ باجرہ کھائے جاوے ہے۔“ رحیمہ اس کے کندھے پر چرت لگاتے ہوئے ڈانٹ کر بولی۔

”سوری، اماں۔“

”ہائیں‘ تو پھر سے انگریجی (انگریزی) بولا؟ تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے، اکو میاں کہ ہمرے ساتھ یہ انگریجی و انگریجی میں بات مت کیا کر..... موئی زہر لگتی ہے یہ نہیں۔“

حسب عادت بے ساختہ اکبر کے منہ سے انگریزی کے اکا کا الفاظ نکل جانے پر وہ برہم ہوئی۔

”تمری لاج شرم کہیں پانی بھرنے چلی گئی ہے کیا کہ اپنی زبان چھوڑ کر تو یہ موئی فرنگیوں کی زبان بولے ہے؟“

”اماں! پہلے تو یہ ہمری، تمری بولنا تو بند کر۔ اس زبان کی آج کل کوئی عزت نہیں کرتا۔ سب ہنستے ہیں اس پر۔“ حسب معمول اکبر نے اس کی بہاری زبان کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ازراہ مزاح کہا تو وہ تمل گئی۔

لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بھاگ کر اپنی ماں کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی بہت چھوٹے تھے اس لیے رحیمہ سے زیادہ مانوس نہیں تھے۔

”اوئی اللہ! یہ تو پاس آ کر نہیں دے رہے، گلوڑ مارے کہیں کے۔“ اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے انہیں کو سا۔

اتنے میں اکبر دو بڑے پیالوں میں نیم گرم دودھ میں تازہ روٹیوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ڈال کر لے آیا۔

اکبر اس گھر کے جدی پشتی ملازم شمس الدین کا بیٹا تھا۔ وہ اسی گھر میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا تھا۔ بچپن میں ماں فوت ہو گئی اور لڑکپن میں قدم رکھا تو شمس الدین چل بسا۔ اس لیے رحیمہ اسے اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتی تھی اور وہ اس کے بیٹے ہاشم کی طرح اسے ’ماں‘ کہہ کر ہی بلاتا تھا۔

”ارے بھیا! کہاں رہ گئے تھے تم؟ آج اتنی دیر کیوں لگا دی آنے میں؟“

”اماں..... وہ..... میری بیوی ہے ناں، بشری، قسم سے بڑی ہی سست اور سفاک عورت ہے۔ گھر کے ساتھ ساتھ اپنے سارے کام بھی مجھ سے کرواتی ہے اور احسان بھی نہیں مانتی۔ کہتی ہے شادی کی ہے تو نبھاؤ۔ کوئی پوچھے اس سے کہ شادی کیا صرف میں نے کی ہے، اس نے نہیں کی؟“ اس نے اپنا دکھڑا سناتے ہوئے پجاریگی سے کہا۔

اکبر کی بیوی بشری بیٹا و سنگھار کی دلدادہ، ایک کاہل اور کام چور لڑکی تھی۔ اپنی ساس کی طرح حسب روایت وہ بھی بہاہ کر علیم الدین مینشن میں ہی آئی تھی لیکن اتنے بڑے گھر کا نظام و انصرام اور دیکھ بھال اس کے بس کا کام نہیں تھا۔ لہذا اس ذمہ داری سے جان چھڑانے کے لیے اس نے ضد کر کے الگ سے کرائے پر مکان لے لیا تھا۔ اگرچہ وہ مکان ’علیم

”ہائیں، کیسی باؤلی باتیں کر رہے تو، اکو  
میاں؟ عزت زبان کی نہیں لہجے کی ہو رہے۔“  
اکبر اس کی بات سے بہت متاثر ہوا اور اس کی  
تائید کرتے ہوئے ستائشی انداز میں بولا۔  
”ویسے یہ بات تو تو نے سولہ آنے سچ کہی ہے،  
اماں! قسم سے جب تو بولتی ہے تو یہ زبان بھی بڑی  
پیری لگنے لگتی ہے..... میٹھی میٹھی سی، بالکل میری  
اماں کے جیسی۔“ اکبر نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ  
کر اسے پچکارتے ہوئے کہا تو وہ اس کے سر پر ہلکی  
سی چپت لگاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”چل، موا، مکھن لگا دے ہے اپنی اماں کو؟“  
بلیاں دودھ اور روٹی سے بھرے پیالے چٹ  
کر چکی تھیں اور شبو کے بچے پیالوں کو چاروں طرف  
سے اپنی تھی نہی زبانوں سے چاٹ رہے تھے۔  
”نہید نے، بالکل اپنی اماں پر گئے ہیں، جنم  
کے بھکو۔“ رچیمہ انہیں برتن چاٹتے دیکھ کر پیار سے  
مسکرا کر بولی۔

”اکو میاں! یہ برتن اٹھاؤ اور دھو کر باورچی  
خانے میں رکھ دو۔ میں کچھ دیر ابھی یہاں بیٹھوں  
گی۔“  
”جی، اماں۔“ اکبر نے کہا اور خالی پیالے اٹھا  
کر گھر کے اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

آج سوموار کا دن تھا اور اس دن کارچیمہ بڑی  
بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھی کیونکہ اس دن اس  
کے بیٹے ہاشم کا فون آتا تھا۔ لیکن پچھلے ایک ماہ سے  
اس کا ایک بار بھی فون نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود وہ  
ہر سوموار اس امید پر ٹیلیفون کے پاس آ کر بیٹھ جاتی  
تھی کہ شاید اس سوموار اس کے بیٹے کا فون  
آجائے۔ وہ آج بھی وہاں بیٹھی اس کے فون کا  
انتظار کر رہی تھی۔

امریکہ میں اتوار چھٹی کا دن ہوتا ہے لیکن ہاشم  
اکثر اپنی ماں کو سوموار کے دن اپنے دفتر جا کر فون  
کرتا تھا کیونکہ چھٹی کے دن وہ گھر پر ہوتا تھا اور گھر  
سے فون کرنے پر رچیمہ اپنی بہو اور پوتوں سے بات  
کرنے کی ضد کرنے لگتی تھی جبکہ وہ سب اس سے  
بات کرنے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔  
رچیمہ نے زندگی میں فقط ایک بار اپنے پوتوں کو دودھ  
دیکھا تھا جب وہ پہلی اور آخری بار پاکستان آئے  
تھے۔ اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔

ہاشم شب و روز دولت اور کامیابی کی ریس میں  
گھوڑے کی مانند جتا ہوا تھا۔ خواہشیں اور ضرورتیں  
کسی ماہر جوگی کی طرح اس کی پیٹھ پر سوار اس کی  
لگام تھامے اسے اندھا دھند دوڑا رہی تھیں۔ اس  
لیے اسے کبھی اتنا وقت ہی نہیں مل پایا کہ وہ اس طرف  
توجہ ہی نہیں دے پایا کہ اپنے بچوں کو اپنی ماں سے  
متعارف کروا سکے۔ امریکہ میں روپے پیسے اور  
اسٹیٹس کی دوڑ میں اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں  
ہو پایا کہ وہ اپنے پیچھے کتنی بڑی دولت چھوڑ آیا ہے۔  
وہ دولت جو پچھلے کئی برسوں سے اس کی منتظر ہے۔  
ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو اس کے ساکت وجود میں  
ایک دم جان سی آگئی۔ وہ تیزی سے ٹیلیفون کی  
جانب لپکی اور جھٹ سے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو، اماں۔“ دوسری جانب سے سپاٹ سی  
آواز ابھری۔

”کیسا ہے تو، ہاشو، میرے بچے؟“ ہیلو کے  
جواب میں اس نے والہانہ انداز میں کہا۔  
”تیری دعا ہے، اماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تو  
کیسی ہے؟“ دوسری جانب سے اسی لب و لہجے میں  
پوچھا گیا۔

”یہ سوال مت پوچھا کر بچے کہ تو کیسی ہے،  
اماں! یہ پوچھا کر کہ میرے بغیر تو کیسی ہے، اماں۔“

وہ غم، افسردگی اور ناراضی بھرے لہجے میں بولی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی بات کا دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آئے گا اس لیے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ بے بسی دلا چارگی سے گویا ہوئی۔

”کاش کہ تو کبھی یہ مجھ سے پوچھتے تو میں تجھے بتاؤں کہ تیری اماں صرف تجھے ایک نظر دیکھنے اور چھائی سے لگانے کے لیے زندگی کے دن کن رہی ہے۔ تو آج اداے تو تجھے دیکھ لوں اور پھر سکون سے مرجاؤں۔ تو نہ آدے گا تو تیری اماں بے سکون ہی مرجاوے گی۔ تری اماں کا اتنا تو حق ہے ناں تجھ پہ کہ مرنے سے پہلے اپنے بٹا (بیٹے) کا چہرہ دیکھ لیوے؟“

دو موٹے موٹے آنسو اس کی مندیہ پلکوں سے پھل کر اس کے گالوں کی سلاٹوں میں نہیں گم ہو گئے تھے۔

”اماں! ابھی چار سال پہلے ہی تو چکر لگا کر آیا ہوں پاکستان کا۔ پورا ایک ہفتہ رکا تھا وہاں۔ اب امریکہ سے روز روز ٹھوڑی آیا جاتا ہے پاکستان۔“ اپنی ماں کی ہر باریک سی باتوں سے تنگ آ کر وہ بیزاریت بھرے لہجے میں بولا۔

”اس ایک ہفتے میں پانچ دن تو اپنے سرسراں میں اور صرف دو دن یہاں رکا تھا وہ بھی میرے لاکھ اصرار پر۔“ اس نے شکایتی انداز میں اسے یاد دلایا۔ اس کی بات پر لا جواب سا ہوا وہ ہنوز بیزاریت سے بولا۔

”اماں! ایک تو مجھے تیری سمجھ نہیں آتی۔ نہ تو امریکہ میں خوش رہے گی اور نہ پاکستان میں اتنے بڑے گھر میں رہ کر تجھے سکون ہے۔ پتا نہیں، اماں، تو چاہتی کیا ہے؟“

”تو یہی تو نہیں پوچھتا کہ اماں تو کیا چاہتی ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”اماں جو تو چاہتی ہے وہ ممکن نہیں ہے۔“ اپنی ماں کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے سر اور دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”کیوں ممکن نہیں ہے؟“

”بس ممکن نہیں ہے ناں، اماں! تو امریکہ کیوں نہیں آ جاتی۔“

”تیرے لیے اپنے گھر لوٹنا اتنا مشکل ہے، تو سوچ میرے لیے اپنا گھر چھوڑنا کتنا مشکل ہوویگا۔ وہ گھر جو میرے شوہر اور تیرے ابا نے اتنی محنت اور پیار سے بنایا تھا۔“ اس نے دکھ اور افسردگی سے کہا۔

”میرا بھی یہاں اپنا گھر ہے، اماں! جسے بڑی محنت اور پیار سے بنایا ہے میں نے۔ میں بھی اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”اپنی مٹی پر بنا گھر ہی اپنا ہووے ہے، بٹا۔“ غیر کی مٹی پر بنا گھر بھی غیر ہی ہووے ہے۔“ رحیم نے اسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اپنے مسائل اور مشکلیں بتاتے ہوئے دکھ اور بیزاریت سے بولا۔

”تو سمجھتی کیوں نہیں ہے، اماں کہ اب یہی میری دلیا ہے اور یہی میرا گھر کبھی۔ میں چاہ کر بھی پاکستان تیرے پاس نہیں آ سکتا۔“

”میں اور مریم زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ ڈبل ڈبل شفٹیں لگاتے ہیں۔ ایک ایک پیسا سوچ سوچ خرچ کرتے ہیں جبکہ وہاں تو محل جتنے پر تعیش گھر میں نو کروں چاکروں کے ساتھ رہتی ہے، تجھے روپے پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، فون پر مجھ سے بات بھی کر لیتی ہے جبکہ میرا یہ حال ہے کہ میں کئی کئی دن تک اپنے بچوں سے مل نہیں پاتا۔ رات کو جب آفس سے واپس آتا ہوں تو وہ سو رہے ہوتے ہیں اور صبح جب اٹھتا ہوں تو



بار بار اسے پکار رہی تھی لیکن دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ریسپور تھا مے دیر تک وہاں بیٹھی نیر بہاتی رہی تھی۔ اس کا شوہر تر کے میں اس کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گیا تھا۔ حتیٰ کہ علیم الدین مینشن بھی اسی کے نام پر تھا۔ اس کے علاوہ، امریکہ سے ہاشم بھی گاہے بگاہے اسے ایک معقول رقم بھیجتا رہتا تھا۔ رجمہ کو روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ خود کو دنیا کی مفلس ترین عورت سمجھتی تھی۔ جس ماں کی گود بھری ہونے کے باوجود خالی ہو، اسے قارون کا خزانہ بھی دے دیا جائے تو وہ خود کو خالی ہاتھ ہی تصور کرتی ہے۔

ہاشم کا یوں فون کاٹنا، اس کا کلیجہ چیر گیا تھا۔ ایسی بے اعتنائی اور بے وقعتی۔ وہ ایسے سلوک کی حقدار تو نہیں تھی۔ کیا دیار غیر کی مٹی میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اس کے آگے اپنی مٹی، خاک اور دھواں لگنے لگتی ہے؟ یہ کیسا دیار ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے، انسان اپنے خونی رشتوں کو بھلا دیتا ہے؟ روپے پیسے اور رتبے کی یہ کیسی دوڑ ہے کہ جس کا کوئی اختتام ہی نہیں ہے؟

ان گنت سوالوں کے گرداب میں گھری، وہ سارا دن اپنے بستر پر لیٹی یہی سوچتی رہی تھی۔ اس کے پاس ان گنت سوال تھے مگر جواب ایک بھی نہیں تھا۔ ان سوالوں اور جوابوں کے طلاطم خیز سمندر میں غوطے کھاتی وہ وہیں پڑے پڑے سوئی۔

اس دن گھر پر رجمہ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ اکبر اپنی بیوی کو لے کر بازار گیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے رجمہ نے وقت پر نہ تو اپنی دوا لی تھی نہ کھانا کھایا تھا۔ وہ بھوکے پیٹ پوٹھی بے سدھ اپنے بستر پر پڑی تھی۔ شام کے وقت اکبر آیا تو سیدھا اس کے کمرے

وہ اسکول جا چکے ہوتے ہیں۔ فقط اتوار کے دن مجھے اپنے بچوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا تھوڑا سا وقت مل پاتا ہے۔“

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی اور پھر دکھ اور یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

”تجھے تو ہفتے میں پھر بھی تھوڑا سا وقت مل جاوے ہے اپنے بچوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا۔ لیکن مجھے تو برسوں سے یہ ’تھوڑا سا‘ وقت بھی نہیں مل پایا ہے۔ ذرا سوچ، ہاشو، اس ماں کا کیا حال ہوتا ہوگا جس کی ہر صبح اور ہر شام اپنے اکلوتے بیٹے کو بنا دیکھے ہی گزر جاتی ہے۔“

”اور یہ ساری نعمتیں اور آسائشیں جو مجھے اس محل نما گھر میں میسر ہیں، یہ سب ایک تم اکیلے کا نعم البدل، کبھی بھی نہ ہو پاوے گی اور تیری اماں کو یہ سب چاہے بھی نہیں۔ اسے صرف اپنا بچہ چاہیے۔ وہ بچہ جسے دو وقت کی روٹی کی خاطر تو اس سے چھین کر سات سمندر پار لے گیا ہے۔“

ہمیشہ کی طرح وہ سسکنے لگی اور گڑ گڑا کر اپنے بیٹے سے واپس آنے کی التجاء کرنے لگی۔

”چھوڑ سب کچھ اور اب گھر واپس آ جاناں، میرے بچے۔ تیرے بغیر زندگی بڑی بے سودی، بڑی بے سکون سی ہے۔ تو آ جاوے گا تو تیری اماں کے دل کو سکون مل جاوے گا۔ اب آ جاناں، بٹوا، واپس اپنے گھر کب آوے گا جب تیری اماں نہ رہے گی؟ آئے گا ناں تو؟ بول؟“

کچھ دیر تک اس کے سوال کا کوئی جواب نہ آیا تو وہ پاگلوں کی طرح اسے پکارنے لگی۔

”ہیلو.....ہیلو ہاشو بٹوا.....ہیلو تو ہماری آواز سن رہا ہے ناں، بٹوا؟“

”ہیلو.....ہیلو کہاں گیا ہے تو؟ بٹوا؟ مجھے تیری آواز نہیں آوے ہے، بٹوا۔“ وہ ریسپور کان کو لگائے

ہاتھ لگاتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔  
رحیمہ نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور  
پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھرتے ہوئے  
خفیف سی مسکرا دی۔

”جو واپس آ جاوے، وہ برا نہیں ہوتا اور تجھ سے  
اچھا کون ہووے گا بھلا جو مجھے چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں  
جاتا، ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔“ وہ بھرپور  
استحقاق اور محبت سے بولی تو اکبر اس کے پاؤں کو  
بوسہ دیتے ہوئے گویا ہوا۔

”تو وعدہ کر اماں کہ تو بھی مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں  
جائے گی۔ ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔“ اس کی  
بات پر وہ بے طرح مسکرا دی۔

”میں عمر کے جس حصے میں ہوں، ہوا! اس میں  
پکا وعدہ نہ لیا جاوے ہے نہ دیا جاوے ہے۔“ آج  
بے ساختہ اس نے اکبر کو اکبریاں کی بجائے بٹاؤں  
پاتھا۔ اس کے منہ سے اپنے لیے یہ لفظ سن کر اکبر کی  
پلکوں میں تیرتی نمی میں اچانک اضافہ ہوا تھا۔

”میں تو بس کسی آس پر مستعار لی ہوئی زندگی  
جی رہی ہوں جس کی آخری قسط وصولی فرشتہ اجل  
کسی بھی وقت حاضر ہو سکتا ہے۔“

”اماں! اگر ایسی الٹی سیدھی باتیں ہی کرنی ہیں  
تو بہتر ہے کہ تو کھانا کھا اور چپ چاپ سو جا۔ ڈاکٹر  
صاب نے ویسے بھی زیادہ باتوں سے پرہیز برتنے  
کا کہا ہے۔“ اس کی بات پر اکبر ایک دم سے منہ  
پھلاتے ہوئے مصنوعی غصے سے بولا۔

”مجھے کھانا نہیں کھانا۔ بھوک نہیں ہے مجھے۔“  
اس نے کہا۔

”کھانا نہیں کھاؤ گی تو دوا کیسے لوگی۔ کھانا تو  
کھانا ہی پڑے گا تجھے۔“ اس نے قاطعیت سے کہا۔  
”اچھا۔ چل لے آ۔ تو ویسے بھی مان کر کہاں  
دے گا۔“ اس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

میں پہنچا۔ اسے یوں بے سدھ اور بے ترتیب لیٹا ہوا  
دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہوا اور سر دست آگے بڑھ کر  
اس کے کپڑے درست کرتے ہوئے، اس کو بازو  
سے پکڑ کر بلایا۔

”اماں؟“ وہ تفکر سے بولا۔

وہ ہنوز بے سدھ پڑی تھی۔ اکبر نے اس کی نبض  
پر ہاتھ رکھا۔ اس کی نبض بہت دھیمی رفتار سے چل  
رہی تھی۔ وہ فوراً ہر طرف بھاگا اور فون پر ڈاکٹر کو  
فوراً گھر پہنچنے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر وہاں آن  
پہنچا۔ ڈاکٹر کے بروقت علاج سے اس نے آنکھیں  
کھول دیں تو اکبر کی جان میں جان آئی۔

”اکبر میاں! ان کی حالت اب بہتر ہے لیکن  
کوشش کرنا کہ یہ دوبارہ اتنا اسٹریس نہ لیں۔ ورنہ  
اس اتج میں ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی  
جان بھی جاسکتی ہے۔“ ڈاکٹر کے زور دے کے کہہ  
کے آخری جملے نے اکبر کی جان نکال دی تھی۔

”اللہ نہ کرے، ڈاکٹر صاحب۔ اللہ میری اماں  
کو میری عمر بھی لگا دے۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں، اکبر میاں  
لیکن بیگم صاحبہ کو دواؤں کے ساتھ ساتھ، بروقت دوا  
کی بھی اشد ضرورت ہے۔ بس تم اس میں کوتاہی  
مت کرنا۔“

”جی، ڈاکٹر صاب! آپ فکر نہ کریں۔ میں  
انہیں وقت پر دوا دیتا رہوں گا۔“

”گڈ۔ اچھا چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“  
ڈاکٹر کو گیٹ تک چھوڑنے کے بعد وہ سیدھا

رحیمہ کے کمرے میں آیا۔ وہ اپنے بستر پر دراز پڑی  
خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔

”اماں! میں بہت برا ہوں۔ مجھے معاف  
کردے۔ میں آئندہ تجھے کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں  
جاؤں گا۔“ اکبر اس کی پائنٹی بیٹھ کر اس کی ٹانگوں کو

رات کا پچھلا پہر تھا۔ باہر بھاری گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ وہ اپنے بستر پر بڑی گہری نیند میں سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

”بانو.....“ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے باہر سے بلی کی آواز سنائی دی۔ آواز کا کرب اور لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بڑی مشکل میں ہے۔ وہ یکا یک اپنے بستر سے نیچے اتری اور کمرے کا دروازہ کھول کر صحن میں آ گئی۔ بلی کی آواز باہر دالان سے آرہی تھی۔ وہ نگے پیر بانو بانو پکارتی اس آواز کی سمت میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دالان میں پہنچی۔ موسلا دھار بارش اور سرد ہوا کے طاقنور تھپڑے نے ایک لمحے کے لیے اسے پیروں سے اکھاڑ دیا۔ اس نے بے ساختہ اپنے بازوؤں میں خود کو سمیٹنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے خود کو بمشکل سنبھالا تھا۔

موسم کی پرواہ کیے بغیر اس کی متلاشی نظریں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ دالان میں تیر ہوا میں اڑتے خشک پتوں کے سوا میں کوئی نہیں تھا۔ آواز یاغ میں موجود درختوں کے جھنڈ کی جانب سے آرہی تھی۔ باہر اس قدر زوردار بارش کا طوفان تھا کہ وہ دالان سے باہر قدم رکھنے کی جرات نہ کر پائی اور وہیں کھڑے کھڑے بلند آواز میں اسے پکارنے لگی۔

”بانو! بانو! کیا ہوا ہے تجھے؟ تو ٹھیک تو ہے ناں؟ بانو! ہماری آواز سن رہی ہے ناں تو؟ بانو۔“ وہ مسلسل اسے آواز میں دے رہی تھی لیکن جواب میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔

اس کی حالت بگڑنے لگی تو وہ دالان میں بنے سینٹ کے تخت پر ڈھسے جانے کے سے انداز میں

بیٹھی گئی۔ اس نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا کمزور اور لاچار محسوس نہیں کیا تھا۔ رجمہ کے لیے وہ فقط ایک پالتو بلی نہیں تھی، اس کی ہجولیوں جیسی تھی۔ اس کے درد اور تنہائی کی سانس تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کی ہجولی کو اس سے چھین کر بہت دور لے جا رہا ہے۔ وہ بے بس سی بس روئے جا رہی تھی اور اسے پکارے جا رہی تھی۔ بلی کی آواز ایک مرتبہ پھر ابھری تھی لیکن تیز ہوا کے باعث اس کی درست سمت معلوم نہ ہو پا رہی تھی۔ اس کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ رجمہ کا دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ وہ جتنی بلند آواز سے اسے پکار سکتی تھی پکارنے لگی۔ اس کی بلند آواز سن کر اکبر دوڑتا ہوا باہر وہاں آیا۔ وہ آج اپنے گھر نہیں گیا تھا۔

”اماں! اماں! اتنے خوفناک طوفان میں یہاں کیا کر رہی ہے تو؟“ اس نے رجمہ کو تخت پر بیٹھے دیکھا تو بھاگ کر اسے کے پاس آیا اور اپنا گرم کپنل اتار کر اس کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے نہایت نلکھ سے بولا۔

”اکو! دیکھ، بانو کیسے رو رہی ہے۔ کسی بڑی مصیبت میں ہے وہ۔ خدا را جاؤ اسے دیکھو۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی ہے۔“ وہ اکبر کو دیکھتے ہی آواز کی سمت اشارہ کرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ملتجیانہ انداز میں چلائی۔

”اچھا۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ تو پہلے اندر چل۔ موسم بہت خراب ہے۔“

”نہیں۔ ابھی دیکھ اسے جا کے۔“ وہ مصر ہوئی۔ ”کہا ناں میں دیکھتا ہوں۔ تو اندر چل۔ باہر موسم بہت خراب ہے۔ تیرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اس کے بستر پر لا کر لٹا دیا۔ وہ اپنی حالت سے بے نیاز مسلسل بانو بانو پکار رہی تھی۔ اس کی ہجانی کیفیت

دیکھ کر اکبر نے اسے نیند کی دوا کھلا کر اس پر گرم کمبل اوڑھا دیا۔ دوا کھانے کے چند ہی ٹاپے بعد وہ نیند کی گہری وادیوں میں گھو گئی۔

☆.....☆.....☆

ہاشم صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی موبائل کی بیل بجی۔ ایک ہاتھ سے ٹائی پکڑے، دوسرے ہاتھ سے جھک کر اس نے میز پر پڑا اپنا موبائل فون اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین پر ’اماں‘ کے نام سے سیو نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کی چھپلی باتیں سوچ کر ایک دم تذبذب کا شکار ہوا پھر ناچاہتے ہوئے اس نے ماتھے پر بیزاریت کے بل ڈالے بے ساختہ ’ریسیو‘ کا بٹن دبایا۔ دوسری جانب اکبر کی ڈبڈبائی ہوئی آواز ابھری۔

”صاب جی! اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بار بار آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ خدار ایک بار ان سے ملنے آجائیے۔ انہیں آپ کی اشد ضرورت ہے۔“ اکبر نے ڈبڈبائی ہوئی آواز میں انتہائی ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا، اکبر؟ امریکہ سے آنا اتنا آسان ہے کیا؟“ وہ دھیمی آواز میں چلایا۔

”اور اماں کو میری نہیں ڈاکٹر کی زیادہ ضرورت ہے۔ انہیں ہسپتال لے کر جاؤ اور جتنے پیسے چاہیے ہوں مجھے بتانا میں بھیج دوں گا۔“

”صاب جی! ڈاکٹر نے ہی کہا ہے کہ آپ کو بلا لوں اور صاب جی! اس وقت اماں کو پٹیسوں کی نہیں فقط آپ کی ضرورت ہے۔“ اس بار اس کا لہجہ دکھ اور یاسیت بھرا تھا۔ نجانے کیوں ہاشم چاہے کبھی انکار نہیں کر پایا اور اسے سوچ کر بتانے کا کہہ کر فون کاٹ دیا۔

اسے فون پر باتیں کرتا دیکھ کر اس کی بیوی نے

پوچھا تو اس نے اکبر کی کبھی ساری باتیں من و عن بیان کر دیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اسے پاکستان جانے کے لیے کہا۔

”شیور؟“ ہاشم نے بے یقینی سے سوالیہ انداز میں کہا۔

”یس۔“ وہ معنی خیز انداز میں چمک کر بولی۔ ”بھئی، آخر اتنا بڑا گھر ہے تمہارا وہاں۔ اگر تمہاری اماں کو کچھ ہو گیا تو اپنی پراپرٹی کے لیے تو جانا پڑے گا ناں تمہیں..... بلکہ ایسا کرتی ہوں میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ بچوں کو ہم مس مار تھا کے پاس چھوڑ جائیں گے۔ ویسے بھی ہم نے کون سا وہاں زیادہ دیر کرنا ہے۔ ہوں؟“

”اوکے فائن“ میں آج ہی ٹکٹس بک کروانا ہوں، کل صبح کی فرسٹ فلائٹ سے چلتے ہیں پھر پاکستان اماں کے سارے گلے شکوے بھی دور ہو جائیں گے اور یہ کام بھی نمٹ جائے گا۔“ اس نے معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے پراعتادی سے کہا۔

☆.....☆.....☆

”پانو کیسی ہے، اکو میاں؟ ٹھیک تو ہے ناں وہ؟“ رحیمہ نے ہوش میں آتے ہی بڑی بے چینی سے اپنے پائنٹی بیٹھے اکبر سے اپنی پالتو بلی کے بارے میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر سر جھکائے دھیمی آواز میں بولا۔

”ہاں، اماں! بالکل ٹھیک ہے وہ۔“

”رات کو کیا ہوا تھا اسے؟“ اس نے پوچھا۔ ”کچھ نہیں، بس اچانک طوفان آنے کی وجہ سے ڈر کر درخت کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے گھر جانے کا راستہ نہیں مل پارہا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے نکال کر اس کے گھر پہنچا دیا ہے۔ اب وہاں بڑے سکون سے ہے وہ۔“ اس نے ہچکچاتے

اگر کبھی اس گاڑی کا بیلنس آؤٹ ہونے لگے تو مرد کا کام ہے کہ وہ اپنی طاقت اور محبت سے اس بیلنس کو درست کر دے وے۔ تو سمجھ رہا ہے ناں ہماری بات؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا اپنی پلکوں کی نمی چھپانے کی اپنی ہی کوشش کر رہا تھا۔ آج دانستہ اس نے انگریزی کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ وہ انگریزی زبان سے محض اس لیے نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ انگریز کو اپنے بیٹے کی جدائی کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں بشری دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اپنی سانس بحال کرتے ہوئے وہ چپک کر بولی۔

”اماں، تیرا بیٹا آرہا ہے امریکا سے کچھ دیر پہلے کال آئی تھی اس کی کہتا تھا بس کچھ دیر میں پہنچنے والا ہوں اور تیری بہو بھی ساتھ ہے اس کے میں نے تو خوشخبری سنی تو بس دوڑی چلی آئی تھے سنانے۔“ یہ خبر سننے ہی رحیمہ کی آنکھوں کی بجھتی ہوئی لو ایک دم سے روشن ہوگئی اور چہرے پر ایک مہیب مسکراہٹ بھی پھیل گئی۔ اس کی کمزور پڑنی دھڑکنیں اچانک زندگی پا گئی تھیں۔ دل جتنی تیزی سے دھڑکا اتنی ہی تیزی سے ڈوبنے بھی لگا تھا۔ اس کی سانس پھولنے لگی اور جسم کپکپانے لگا۔ اس کی حالت غیر دیکھ کر اکبری کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر کو بلانے کے لیے وہ باہر کی جانب دوڑا۔ بشری وہیں کھڑی پریشانی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملنے لگی۔ اسے لگا شاید اس نے یہ خوشخبری سنا کر بڑی غلطی کر دی ہے۔ ڈاکٹر اور نرس بھاگتے ہوئے کمرے میں آئے اور رحیمہ کی بگڑتی ہوئی

ہوئے بمشکل اتنا کہا اور بہانے سے اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر نے مریض سے زیادہ بات کرنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خود کو مستحکم کرتے ہوئے وہ دوبارہ کمرے میں آیا۔ رحیمہ نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے، بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اس کی پانکٹی آ کر بیٹھ گیا۔

”میں جانتی ہوں، اس مستعار کی زندگی کی بیعاد ختم ہونے کو ہے اور آخری قسط کی ادائیگی کا وقت قریب ہے۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے دھیمے مگر مستحکم لہجے میں بات جاری رکھی۔

”میں تجھ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں، اکو! وعدہ نہیں اسے میری وصیت سمجھ لے تو۔ ہمرے جانے کے بعد علیم الدین مینشن کو ہمیشہ آباد رکھیو۔ میرے پرندوں کو روزانہ دانا ڈالیو اور میری بھجولیوں کا بہت سارا خیال رکھیو۔ انہیں ڈانیو مت اور نہ ہی انہیں گھر سے نکالیو۔ وہ گھر جتنا تمرا ہے اتنا ہی ان کا بھی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمرے بعد تم سب ایک ساتھ اکٹھے مل کر رہو۔ ہمرے ہاشو کی طرح چار پیسوں اور دو وقت کی روٹی کی خاطر اپنے گھر، اپنی مٹی سے دور دیار غیر کی خاک نہ چھانتے پھر دو۔“

اپنے بیٹے ہاشم کے ذکر پر ایک لمحے کو اس کی آواز ڈمگائی۔ پھر قدرے توقف کے بعد وہ خود کو مستحکم کرتے ہوئے بولی۔

”میں جانتی ہوں، تیری بیوی تھوڑی بیوقوف ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہ ہے لیکن میرا، بٹا، تو تو سمجھدار ہے۔ تو اسے پیار سے سمجھایا کر۔ اس سے لڑا کر نہ بدگمان ہوا کر۔ وہ زبان کی کڑوی مگر دل کی بوہت (بہت) صاف ہے۔ ہاں تھوڑی سست اور کاہل بھی ہے لیکن تو تو مرد ہے اور مرد زندگی کی گاڑی کا مضبوط پہیہ ہووے ہے۔“

حالت کو مستحکم کرنے کی اپنی ہی کوشش کرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

ہاشم اپنی بیوی کے ساتھ ایئر پورٹ سے سیدھا ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ بشری نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں، ہسپتال میں ہے۔ ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں کے بعد رحیمہ کی حالت تو قدرے مستحکم ہو گئی مگر اس میں بولنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

بس چپ چاپ نیم وا آنکھوں سے وہ داخلی داروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ نقاہت سے بوجھل بار بار بند ہوتی آنکھوں پر پلکوں کے دبیز پردوں کو بمشکل اٹھائے ہوئے وہ اپنے بیٹے کی ایک جھلک کی منتظر تھی۔ اچانک دوازے کے باہر اسے بوٹوں کی مانوس سی چاپ سنائی دی۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اس کی پلکوں کے بھاری پردے گر گئے۔

”آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی، صاب جی! آپ کے جانے کے غم میں جو اتنے سال زندہ رہی، آج آپ کے آنے کی خوشی میں ایک پل میں ہی مر گئی۔“ اکبر نے ہاشم کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ رحیمہ کے دونوں پیرائے ہاتھوں میں سمیٹے زار و قطار رو رہا تھا۔

ہاشم، دکھ، حیرت اور یاسیت کا بت بنا اس ہستی کے مردہ جسد خاکی کو خالی خالی آنکھوں سے تاکتا جا رہا تھا جو اس کے انتظار میں دن گنتی اپنی زندگی یار گئی تھی۔ وہاں اگر کسی کی آہ و بکا سنائی دے رہی تھی وہ فقط اکبر تھا۔

ہاشم کی وہ صرف ماں تھی لیکن اکبر کی وہ ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ اس کا تو پورا جہان لٹ گیا تھا۔ ہاشم کی آنکھوں سے بے ساختہ دو آنسو نکلے اور اس کے گال بکھوٹے ہوئے اس کی ٹھوڑی پر آ کر کرک

گئے۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور کانپتے ہاتھوں سے انہیں پونچھ ڈالا۔

☆.....☆.....☆

وہ غم آنکھوں سے اپنی ماں کی قبر پر دونوں ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اسے یاد آیا کہ اتنے سالوں میں سوائے عید کی نماز کے جو امریکہ میں مسلم کمیونٹی کی دیکھا دیکھی وہ بھی پڑھ لیا کرتا تھا، اس نے بھی نماز نہیں پڑھی تھی اور نہ ہی یوں ہاتھ اٹھا کر اپنی ماں کے لیے بھی دعا مانگی تھی۔

اس لیے آج اس کے پاس اپنی ماں کو دینے کے لیے ایک دعا تک نہ تھی۔ جو اپنے بیٹے کی جدائی میں اتنے سال بے سکون رہی آج وہی بیٹا اس کے سکون کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا تو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس منہ سے اپنی ماں کے لیے خدا سے سکون طلبی کی دعا مانگے۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ منہ سے ایک لفظ ادا نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے ہونٹ گویا جامد اور الفاظ جیسے گم ہو گئے تھے۔ آخر کار اس نے ایک قیمتی سنگ مرمر کے کتبہ پر انگریزی کے جلی حروف میں ”Amma Peace, in Rest“ کنداں کروایا اور اسے اپنی ماں کی قبر پر لگا دیا۔

وہ قبرستان سے نکلا تو دروازے پر اپنی بیوی کو وکیل کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ وہ چہرے پر غصے اور شکست کے تاثرات لیے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

”مسٹر ہاشم! یہ رہی آپ کی والدہ رحیمہ علیم الدین کی وصیت اور ایک خط جو انہوں نے صرف آپ کے نام لکھا ہے۔“ وکیل نے اسے وصیت کی فائل اور ایک لفافہ بند خط اسے تھماتے ہوئے کہا۔

”آپ کی وائف نے کہا کہ آپ لوگ آج ہی واپس جا رہے ہیں تو میں یہ پیپر ز لے کر یہیں آ گیا۔

اسے پڑھ لیجیے اور کچھ سوال کرنا ہو تو آپ کے پاس میرا فون نمبر ہے۔ مجھے کال کریئے گا، میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس نے مزید کہا۔

”تھینک یو۔“ ہاشم نے کہا تو وہ واپس چلا گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔

”میرے جگر کے ٹکڑے، میرے پیارے ہاشم! یہ خط جب بھی تجھے ملے گا، میں تجھ سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ جتنی دور تو مجھ سے چلا گیا ہے، اس سے کہیں دور۔ تیرے بغیر جس طرح میں نے زندگی گزاری ہے، میری دعا ہے کہ ویسی زندگی تو کبھی نہ گزارے۔“

اولاد کے ہوتے ہوئے بھی اولاد سے دوری کا جو دکھ اور اذیت میں نے جھیلی ہے، میں سوہنے اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ دکھ اور اذیت تو کبھی نہ جھیلے۔ جانے سے پہلے میں تجھ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تو اور تیری بیوی علیم الدین مینشن کو بیچ کر امریکہ میں ایک بڑا گھر خریدنا چاہتے ہو جبکہ میری خواہش تھی کہ یہ گھر تجھ سے اور تیرے بچوں سے ہمیشہ آباد رہے لیکن کچھ خواہشیں شاید پوری ہونے کے لیے ہوتی ہی نہیں ہیں۔

لیکن مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شکوہ اور شکایت ہے۔ تو نے جو چاہا وہ پالیا۔ میری دعا ہے کہ تجھے ہر وہ شے، ہر وہ خوشی ملے جس کی تو چاہ کرے اور تیرے سر سے ہر وہ بلا ملے جس سے تجھے رتی بھر بھی گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔ میری سب دعا میں تیری لیکن علیم الدین مینشن میں تیرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے اس گھر کی ملکیت اپنے چھوٹے بیٹے اکبر کے نام منتقل کر دی ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ تو اس سے اس بابت نہ سوال کرو گے نہ گلا شکوہ اور نہ ہی اسے عدالتوں میں گھسیٹے گا۔ وہ بہت معصوم ہے۔

اتنے سال اس نے تیری کمی کو پوری کیا ہے، اس کا اتنا تو حق بنتا ہے ناں۔ وہ تیرا بھائی نہ سہی لیکن میرا بیٹا ضرور ہے اور میں نے اپنا گھر اپنے بیٹے کے نام کیا ہے۔ ویسے تو وعدے کا زیادہ پکا تو نہیں ہے پر اسے ایک آخری وعدہ سمجھ کر اس کا پاس رکھ لینا۔“

اس کے گال آنسوؤں سے تر ہونے لگے تھے اور آنکھیں دکھ اور پچھتاوے کی آگ سے جلنے لگی تھیں۔

”آخر میں فقط اتنا کہنا چاہوں گی کہ میں تجھ سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں میں نے تجھے بہت تنگ کیا ہے، بس کوشش کرنا کہ جب بھی میری یاد آئے یا میرا ذکر ہو تو اپنے ماتھے پر نفرت و بیزاری کی نشانیں مت ڈالنا۔“

”فقط تیری اماں،“

”رحیمہ علیم الدین۔“

وہ لرزتے ہاتھوں سے خط تھامے دکھ اور یاسیت کا بت بنا بیٹھا تھا۔ خط کا بار اچانک اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لڑی جاری تھی۔ دکھ، غم اور پچھتاوے کا ایک مہیب الاؤ تھا جس میں وہ سرتا پیر جل رہا تھا۔

خط کھولنے سے قبل وہ توقع کر رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے لاکھ کوٹنے دیے ہوں گے، لعنت ملامت کی ہوگی، شکوے شکایتوں کے ڈھیر لگائے ہوں گے اور وہ چاہتا تھا کہ ایسا ہوتا کہ اس کے دل اور ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن وہ اسے معاف کر کے اس بار میں اضافہ کر گئی تھی۔

”ڈرائیور! گاڑی سیدھا ایئر پورٹ کی طرف لے چلو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بھیکے گال خشک کرتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔



# الابچی والی چائے

.....

منگل کا دن، شام چار بجے کیفے

کی وہ میز اور الابچی والی چائے.....

.....

میں وہ گم صم اپنی دنیا میں مست تھی جب ویٹر نے معمول کے مطابق گرین ٹی اس کے سامنے میز پر لا کر رکھ دی وہ بے اختیار چونکی۔

”نہیں گرین ٹی نہیں الابچی والی چائے پیئیں ہے۔“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ کے ہمراہ گہری اداسی کی چھاپ بھی محسوس ہوئی تھی۔ ویٹر نے کچھ ندامت سے کپ واپس اٹھا لیا اور پھر برابر شرمندہ ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

”وہ آپ روز گرین ٹی لیتی ہیں تو سوچا شاید آج بھی یہی لیں گی اسی لیے لے آیا۔“

”آج میرے دوست ساتھ ہیں اسی لیے میز الابچی والی چائے پیوں گی اور ویسے بھی میں پہلے بھی

تو الابچی والی چائے ہی پیتی تھی درمیان میں صرف ایک ہفتہ ہی گرین ٹی لی ہے۔“ وہ دھیمے پر اعتماد انداز میں خوشگوار لہجے میں سمو کر بولی تو ویٹر نے جیت

ت سے دیدے پھاڑ کر اس کے ساتھ خالی کرسیوں کو دیکھا اور پھر سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے؟ اچھا اگر وہ راستے میں

اچھا لگتا تھا اسے کبھی یوں خالی میزوں کے درمیان جا کر بیٹھ جانا، پھر چائے کا کپ آرڈر کرنا اور پھر اس برسوں سی شناسہ سی جگہ پر ان اپنوں کو یاد کرنا جو بڑی سفاکی سے اسے چھوڑ گئے تھے اور اس بات کا یقین وہ اب تک نہیں کر پا رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح منگل کی شام وہ ایسے ہی کسی احساس کے زیر اثر کرسیوں کے درمیان ایک بار پھر جا بیٹھی تھی جن پر کبھی اس کے ہر دل عزیز دوست اس کے ساتھ براجمان ہوا کرتے تھے۔ وہ خالی لکڑی کی کرسیوں کو گھور رہی تھی جو اسے گویا منہ چڑاتی محسوس ہوئیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بے جان لکڑی کی کرسیاں اسے کہہ رہی ہوں۔

”تم کیوں اتنا اعتبار کرتی ہو لوگوں پہ جانے والے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں پھر وہ واپس نہیں آیا کرتے.... وہ صرف جگہ نہیں چھوڑتے بلکہ جگہ

چھوڑنے سے پہلے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ اس کی نفی نہیں کر سکی کیونکہ جانے والوں نے اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ کیفے کے شور



تک کا لیدر بیک لہوا اور ماسٹر مل اور لہو اور  
 منانت سے اسے ٹٹولنے لگی، شاید لولی کا لہو لولی اور  
 ی مل جائے تو وہ اپنے سینے سے کم از کم اس بو بھ کو تو ا  
 تار پھینکے جسے اب کاغذ پہ اتارنا لازم ہو گیا تھا۔ بیک  
 میں ہاتھ مارتے ہوئے کوئی کاغذ تو اس کے ہاتھ نہ لگا  
 مگر وہ کتاب ”فراق“ سر اسامیل کی شاعری کا مجموعہ  
 کم از کم اس کے ہاتھ ضرور لگ گئی تھی جو پچھلے منگل  
 سر اسامیل نے اسے بطور تحفہ دی تھی جب وہ ان سے  
 ملنے ان کے آفس گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں ”ستارہ“ پتا نہیں ابا کو کیا سوچی تھی جو میرا نام  
 ستارہ رکھ دیا مگر میری قسمت کا ستارہ تو میرے نام کی  
 طرح کبھی نہ چکا، اس کی روشنی ہمیشہ ابر  
 کی وجہ سے ماند رہتی رہی اور پھر ایک دن اس  
 نے چمکنا ہی چھوڑ دیا۔ میں وہی بد قسمت ستارہ ہوں  
 جس کا ستارہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ میری زندگی  
 میں لوگ ایک مخصوص مدت کے لیے آتے ہیں اور  
 جیسے وہ مدت پوری ہوتے ہی یوں قطع تعلق کر لیتے

ہیں تو پھر بھی بتا دیں کتنے کپ میں تیار کروا دیتا ہوں  
 ۔“ کسی خیال پر اس نے خود ہی بات بدل دی۔  
 ”ہیں نا دیکھو میرے ساتھ ہی بیٹھے ہیں کبھی نہ  
 چھوڑ کے جانے کا عہد کرنے والے وفادار دو  
 ست۔“ لفظوں کو چپا کر بولتے ہوئے آج پہلی  
 بار اس کی آنکھوں کی سطح بھیگی تھی۔ ویٹرنے پھٹی  
 پھٹی آنکھوں سے اس لڑکی کو گھورا اور پھر خاموشی سے ا  
 لائیچی والی چائے کا ایک کپ میز پر لا  
 کر رکھ دیا۔ وہ ابھی بھی مڑ کر اس عجیب و غریب  
 لڑکی کو گھور رہا تھا جو خاموش لالچئی سی کپ لبوں پہ لگا  
 ئے ہوئے تھی مگر وہ اسے کیا بتاتی کہ

لالچئی والی چائے کے ہر سب میں یادوں کا خزانہ  
 ہے اور اس یادوں کے خزانے کو وہ اب مزید دفن  
 کرنا نہیں چاہتی، جس چیز کو دفن کر دیا جائے وہ بھی  
 دل میں تو پھر اس کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہو جاتا ہے  
 ، کتنے سال ہو گئے تھے اس نے یہ بوجھ اپنے دل میں  
 دفن کر رکھا تھا اور اب شاید وہ مزید اس کا بوجھ اٹھانے  
 سے قاصر تھی اس لیے اس نے ٹیبل پہ رکھا پتا سر مٹی ر



ہیں جیسے وہ بس

اتنی ہی مدت کے لیے آئے تھے، اسی لیے میری قسمت کا ستارہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ میں دس سال کی تھی جب اماں کی وفات کینسر سے

ہوئی، ان کی بیماری کے وقت ابا بہت اچھے تھے، مجھے یاد ہے آخری دنوں میں بھی انہوں نے ا ماں کا کتنا خیال رکھا تھا اتنا کہ شاید اگر انہیں

اماں سے محبت نہ ہوتی تو وہ اکتا جاتے مگر ان کے لبوں سے میں نے کبھی اف تک نہیں سنا لیکن جس دن اماں کی وفات ہوئی تو جیسے ابا کی شفقت کا بھی انتقال ہو چکا تھا، انہوں نے ہم پر سے ایسے ہاتھ اٹھالیا جیسے ہم ان کی اولاد نہ ہوں بلکہ یوں کہنا زیا دہ بہتر ہوگا کہ انہیں

نے ہمیں اپنی سرپرستی سے عاق کر دیا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کام میں مصروف رہتے اور شام کو گھر لوٹتے ساتھ ہی کھانا کھا کر، کچھ دیر ٹی وی دیکھ کر آغوشِ پیئد میں چلے جاتے۔ کتنے دنوں تک میری اور زین کی ان سے کوئی بات نہ ہو پا تی تھی۔ ان کی خاموشی اور اس عام سی

روٹین نے ہم سے وہ باپ چھین لیا تھا جو کبھی اس گھر کی مکمل تصویر ہوا کرتا تھا، جس کی شفقت و محبت کے ہم عادی تھے، جو دفتر سے واپسی پر کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتا تھا، ہمیشہ پھل، آئس کریم یا چپس وغیرہ کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتا اور ہم رات کا کھانا ساتھ ل کر کھایا کرتے تھے۔

وہ مسرت کے لمحات ہوا کرتے تھے مگر اب پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے، چہرے پر ہمیشہ رہنے والی سنجیدگی سے ان کے ماتھے پر شکنیں پکبی ہو گئی ہیں، چہرے سے رونق اڑن چھو اور داڑھی کے بال سفید ہو نے لگے ہیں، دن بدن صحت بھی گرتی جا رہی ہے، وہ دنیا اور خود سے لائق ہوتے جا رہے ہیں اور ہمار

ے درمیان ایک بہت بڑی اور مضبوط دیوار قائم ہو چکی ہے، جس نے محبت اور اپنائیت کسی بھوکے شیر کی طرح نکل لیے ہیں۔ ادا سی پچھلے گیارہ سال سے ہمارے گھر میں بال کھولے سو رہی ہے۔ انہیں کوئی خبر نہیں تھی کہ ہماری زندگی کیسی گزر رہی ہے، پڑھائی کیسی جا رہی ہے اور زندگی میں کونسے نئے مسائل ہمیں درکار ہیں۔ پتا نہیں وہ اتنے بے حس کیوں ہو گئے تھے؟

میری تعلیمی زندگی تو یوں ہی روکھی سوکھی گزر گئی جس میں مجھے صرف ان کی مالی سپورٹ حاصل تھی۔ یونیورسٹی آئی تو دوستی، محبت، چہل پہل اور زندگی جینے کی امنگ ان سب حالات کے بعد مزید بڑھ گئی۔ کچھ ہی دنوں میں میرے لباس اور شخصیت میں واضح تبدیلی رونما ہوئی،

سر سے دوپٹا اتر کر کندھوں پر اور پھر وہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ کمر تک گرتے سیدھے لمبے بال، سنپنس میں کٹ کر شانوں تک آ پینچے اور چہرے کی معصومیت آئی بروز اور دبیز میک اپ کے نیچے چھپ گئی، درمیانہ قد بیل کی خوبصورت نوک پر قدرے دل آویز لگنے لگا اور

دوستوں کے درمیان میری نخوت سے اٹھی گر دن نے بہت سے لوگوں کو میرا گرویدہ بنا دیا۔ میں دنوں میں بدلی تھی، اتنا کہ آئینے میں دیکھ کر خود کی پہچان مشکل ہو گئی تھی، وہ ڈر، خوف اور دنی سی گھٹی شخصیت کسی ابر آلود بادل کی طرح چھٹ گئی تو میری شخصیت کے رنگ تو سب فراخ کی طرح ہر سو بکھرنے لگے۔ دوستوں کی فہر ست طویل ہو گئی اور وقت کی یوں قلت ہونے لگی کہ پڑھائی کے لیے وقت کم پڑھنے لگا۔ میں جس مقصد کے لیے وہاں گئی تھی، اسے تو گویا میں اپنی حسرتوں کو پورا کرنے میں بالائے تاق رکھ

نظم

انجنام

ہم نے تو اکثر دیکھا ہے کہ جاناں!  
محبت کرنے والوں کے دل  
ان کی ہتھیلیوں پر دھرے ہوتے ہیں

اور وہ

آنکھیں بند کر کے سوئے دار چلے جاتے ہیں!!

شادی - کراچی

ڈھلکنے سے گریز کرنے کے لیے اس نے پلکیں زور  
سے جھپکیں اور ساتھ ہی چائے کے دو،

تین بڑے بڑے گھونٹ ایک ساتھ بھرنے لگی  
اب واپس کتاب کی طرف جھکنا مشکل ہو رہا تھا کیو

نکداس کا دل اسفندیار کی بات پر کسی  
نے مٹھی میں لے کر زور کا دبوچ لیا تھا مگر دفعتاً

وہ اپنے بکھرے ہوئے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ا  
یک بار پھر کتاب کی جانب جھکی اور

بال پوائنٹ کی نوک صفحے پر ٹکادی -  
”ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کی میری شادی میں آ

نے سے بچت ہو جائے۔“ یہ یونیورسٹی ختم ہونے کا آ  
خری ہفتہ تھا جب اسفندیار نے گاڑی کی

چابی دائیں ہاتھ میں گھماتے ہوئے بڑے شری  
انداز میں کہا تھا تو سب سوا لیہ نظروں سے اسے

دیکھتے رہے اسی دوران مجھے اپنے موبائل پر  
اسفندیار کا میسج موصول ہوا ”منگل کو شام چار

بجے اسی کیفے میں مجھے ملنا وہاں اس کا جواب ملے گا  
“۔ یہ میسج بڑھنے کے بعد میں قدرتی طور پر

بلیش کر گئی اور دل اتنی زور کا دھڑکا جیسے پسلیاں تو  
ڑکرا بھی باہر آ جائے گا مگر نظا ہر میں نے اس میسج کو  
انگور کیا اور اگلی منگل کو میں واقعی نا جانے

چکی تھی مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ جن دوستوں پر میں  
نے اپنا وقت اور محبت، اپنی ذات اور شخصیت کا  
نقصان کر کے لوٹائی تھی وہ مطلب پرست تھے اور مو  
قع پرست بھی۔ سارا دن ہم ساتھ گزارتے تھے، کلا  
سینز لینے کے بعد ہم گھنٹوں کیفے کے انہیں میزوں  
کے درمیان بیٹھ کر ایک ساتھ لالچائی والی چائے کے  
کپ پیا کرتے تھے اور جب کبھی ابر آلود بارش  
ہونے لگتی تو پکوڑوں کی پلیٹ کے ساتھ لالچائی والی  
چائے کے دو، دو کپ اور ڈھیروں وعدوں کے ساتھ  
اندیل لیا کرتے تھے۔“

ستارہ نے کتاب سے سراٹھا کر کیفے میں دیکھا  
تو وہی حل چل اور گہما گہمی اب بھی موجود تھی مگر صفحہ  
پلٹنے کے بعد اس نے ایک کپ چائے کا لیا اور ایک  
بار پھر پور مستعدی سے لکھنے لگی۔

”ہم پانچ دوستوں کا گروپ ہوا کرتا تھا۔ میں  
فریج، صدف، ذیشان اور اسفندیار۔“ سب ہی  
کیمسٹری میجر کے تھے اور اس کیمسٹری مضمون

کے علاوہ بھی ہماری کیمسٹری آپس میں خوب ملا  
کرتی تھی۔ چائے پیتے ہوئے ہم کیسے کیسے عہدو

پیاں نہیں کیا کرتے تھے۔  
”ہمیشہ ایسے ہی ساتھ رہیں گے ایک دوسرے

کے اچھے دوست بن کر۔“  
”ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔“

”زندگی میں جہاں بھی ہوں گے رابطے میں ر  
ہیں گے۔“

”اور ہاں ایک دوسرے کی شادی پر ضرور آ  
نیں گے۔“

اتنا لکھنا تھا کہ ستارہ کے ہاتھ لڑکھڑائے اور بال  
پوائنٹ کی گرفت اس کے ہاتھ میں ڈھیلی پڑ

گئی۔ اس نے جھکا ہوا سراٹھایا تو اپنی  
آنکھوں میں نمی کو محسوس کیا اور پھر گالوں پر پانی

ہی کیوں؟ اور الاچی والی چائے ہی کیوں؟ خود سے  
بہت سوال کرتی ہوں مگر جواب صرف  
”خاموشی“

اسفندیار کی زندگی تو ان تین سالوں سے بہت  
آگے بڑھ گئی ہوگی مگر میری زندگی تو آج تک منگل، چا  
ر بجے، کیفے اور الاچی والی چائے کے گرد ہی طواف  
کرتی ہے۔ کیا میں نے اس کے مزاق کو سنجیدہ لے لیا  
تھا؟ میں ابھی تک خود کو اس کا جواب اثبات میں نہیں  
دے پائی۔“

کتاب کا وہ آخری صفحہ ختم ہو گیا تھا اور اس کے  
ہاتھ لکھ کر تھک چکے تھے، اسے لکھنے کی عادت جو نہیں  
ہے مگر آج لکھنا مجبوری تھی۔ اس نے

کتاب بند کر کے واپس لیڈر کے بیگ میں رکھی  
اور ٹپ کے ساتھ پیسے میز پر رکھنے کے بعد اٹھی تو نظر  
یہ بے ساختہ سامنے دیوار کے ساتھ

ٹیک لگائے کھڑے اس ویٹر پر ٹھہر گئیں جو  
ہمیشہ کی طرح کھڑا اسے دیکھ رہا تھا، اس کی کہانی کا خا  
موش کردار۔ جو سب جانتا تھا مگر آج تک خاموش تھا  
، جس نے اس کی یونیورسٹی لائف بھی دیکھی تھی لیکن  
پھر بھی وہ خاموش تماشائی تھا۔ ستارہ نے کھڑے ہو  
کر ویٹر پر ایک

طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر میز پر رکھے ٹپ اور پیسے  
ن کا اشارہ کر کے یہ سوچتے ہوئے کیفے سے باہر نکل  
گئی کہ:

میری زندگی کو تک نہ یوں  
کہ نظر لگائے کو کچھ نہیں  
منگل کا دن، گھڑی کے چار  
خالی کیفے کی میزوں اور  
الاچی والی  
چائے کے سوا کچھ نہیں

□□.....□□

کون سے خواب ان آنکھوں میں سجائے، چار  
بجے کیفے پہنچ گئی۔ ایک گھنٹہ الاچی والی چائے پی کر  
اس کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آیا۔ مجھے اس

کی اس حرکت پر بے انتہا حیرت ہوئی، وہ تو میرا  
صرف دوست تھا پھر آخری دن یہ میٹج کرنے کی کیا  
تک تھی؟ یہ سوال میرے ذہن میں گونج  
رہا تھا اسی وقت آخری بار میں نے موبائل آن  
کر کے وقت دیکھا تو پانچ بج چکے تھے اور ساتھ ہی  
میری نظر کونے میں لکھی تاریخ پر پڑی تو  
”یکم اپریل“ دیکھ کر میرا دل سلگ اٹھا اور ذہن  
کو ایسا جھٹکا لگا کہ اس وقت مجھے پہلی بار اپنے دوستوں  
ن سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ آنسو کی لڑی

متواتر میری آنکھوں سے بہہ نکلی اور اس دن  
کتنی ہی دیر میں کیفے کی اس کرسی پر بیٹھی اپنی بیوقوفی  
پر ماتم منانی رہی۔ اس دن کے بعد مجھے میرے کسی  
دوست کا میٹج نہیں آیا، کبھی کسی نے کال نہیں کی۔ ڈگر  
ی لینے کے بعد سب اپنی زندگی میں گم ہو گئے  
تھے، ان کے لیے یہ یونیورسٹی

کی لائف شاید تھیل تماشہ اور وقت گزاری تھی  
، اسی لیے انہوں نے کسی کے جذبات مجروح کرنے  
سے پہلے ایک بار نہیں سوچا مگر میں نے  
جو اپنے گھر سے نکل کر خوشیاں تلاش کرنا چاہی  
تھیں اس میں دھوکہ کھایا تھا۔ تب پہلی بار سمجھ آیا تھا  
”محبت“ اور ”وقت“ دونوں بہت قیمتی

ہوتے ہیں، انہیں صرف اپنوں پر لوٹانا چاہیے اور  
نہ سوائے گھائے اور پیچھتاوے کے اور کچھ ہاتھ نہیں  
آتا۔ اس کے بعد سے میں نے اپنی

یہ یونیورسٹی میں جاب شروع کر دی اور اب  
تین سال سے یہاں پڑھا رہی ہوں۔ ہر منگل، چار  
بجے بے ساختہ یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔

کیوں آتی ہوں؟ منگل ہی کو کیوں؟ چار بجے

## ’سچی کہانیاں/دوشیزہ‘ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے

ادارہ ’سچی کہانیاں‘ اپنے قارئین کی سہولت کے لیے دفتر میں ایک ڈیسک قائم کر رہا ہے۔ آپ کو اگر ’سچی کہانیاں‘ ملنے میں دشواری ہے تو بذریعہ فون یا میسج ہمیں مطلع کریں آپ کہیں بھی رہتے ہیں ادارہ آپ کے گھر کے پتے پر بذریعہ وی پی ’سچی کہانیاں‘ ارسال کرے گا اس طرح آپ اور آپ کے پیارے ’سچی کہانیاں‘ کے درمیان جو دوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ ’سچی کہانیاں‘ اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے۔

فوری رابطہ 021-35893122-23

سہولت کار نمبر 0309-0364564

# موٹی.....!

(قسط 4)

~~~~~

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو موٹی تھی

اور معاشرے میں مس فٹ سی تھی مگر پھر کچھ ہوا.....

~~~~~

شہزاد مسکرا دیا۔ ”ہاں بھی، بھی دل سے کی گئی آرزو پوری ہو جاتی ہے۔“

چاندنی رات میں زوہی کا چہرہ اور بھی دلکش لگ رہا تھا اسے دیکھ کر شہزاد کے دل میں ایک خیال سا آ کر گزرا گیا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے مسکرا کر زوہی کو دیکھا۔ اس کے چند لفظ زوہی کو اپنے بہت قریب سنائی

دیے۔

”یہ سماں بڑا عجیب ہے..... جادو کر دینے والا ہپناٹا زکریا نے والا میں نے اتنا خوبصورت منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”یہ آتی جاتی لہریں ان کا شور یہ چاندنی رات یہ سب کتنا پراسرار ہے۔“ ایک پھکی سی مسکراہٹ زوہی کے حسین ہونٹوں پہ پھیل گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اس کے لیے تو حسن شہزاد کے ساتھ میں پنہاں تھا جہاں بھی ہوا سے قبول تھا۔ زوہی اپنے خیالوں میں گم اسے محویت سے دیکھ رہی تھی۔

شہزاد کی نظریں دور سمندر کے اس پار دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔

جہاں سمندر اور رات کی سیاہی ایک ہو گئی تھی اسے سردی کا احساس ہونے لگا نہ جانے یہ موسم کا اثر تھا یا وہ زوہی کی حسرت بھری نگاہوں سے جمنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

”شہزاد.....“ زوہی کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”مجھے خود سے وابستہ کر لیں مجھے اپنے نام کر لیں میں چاہتی ہوں لوگ مجھے آپ کی نسبت سے جانے



.....زوبی شہزاد.....“

”صرف آپ کا نام پھر چاہے آپ اپنی ساری الفت رمشا کے نام کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس طرح کم از کم بہت سے ٹوٹے رشتے تو جڑ جائیں گے۔“

نہ جانے کتنی بہت جمع کر کے آج زوبی نے پستی کی آخری حد کو چھو لیا تھا۔ اس کے انداز الفاظ اور آنسوؤں سے شہزاد کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ اس نے زوبی کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ.....!“ اس کے لفظ اس کے ذہن میں منتشر ہو گئے نہ جانے زوبی کی آنکھوں میں ایسا کیا کچھ جس نے آج شہزاد کی زبان کنک کر دی تھی۔ اسے اپنا آپ بہت کمزور محسوس ہوا۔

”میں گھروں کو ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی شہزاد۔“ زوبی کی نگاہیں جھک گئیں۔

”کیا یہی واحد راستہ ہے کہ میں آپ سے شادی کر لوں خود کو فوفا کر لوں اور سب کو بچا لوں؟“

”نہیں آپ کیوں فنا ہوں گے؟ آپ کا نام مانگا ہے ساتھ نہیں پاس ہونے اور ساتھ ہونے میں بہت فرق ہے شہزاد۔ بعض اوقات زندگی کی ڈگر یہ ساتھ چلنے والے مسافر ہم راہی تو ہوتے ہیں پر ہمد ہم نہیں پاتے انہیں دل کی منزل تک پہنچنے کا راستہ کبھی نہیں ملتا اس رہگذر کا ساتھ تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔“ زوبا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے میں جانتی ہوں۔ محبت زبردستی کا سودا نہیں میں آپ سے کبھی شکایت نہیں کروں گی کوئی گلا نہیں کروں گی مگر.....“ زوبی کا لہجہ رندہ گیا۔

”اماں اور چھوٹے ماموں جی کے لیے آپ اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے زوبی ہم دونوں کی زندگی کا سوال ہے۔ میں بھی ابو جی کے رویے سے دا داشتہ ہو کر پھوپھو کو کمانے کراچی بھاگا چلا آیا میرے پاس بھی بڑوں کی ضد نے کوئی آپشن نہیں چھوڑا۔ اگر اپنی مرضی مجھ پہ تھوپی ہی ہے تو پھر فیصلہ بھی میری شرطوں پہ ہوگا شہزاد کی محبت کا سودا اتنا نہیں۔ میں آپ سے دوسری شادی تو کر سکتا ہوں مگر پہلی چاہت اور خواہش رمشا ہی رہے گی بولو س منظور ہے؟“ شہزاد کا لہجہ ماحول کو اور بھی سرد کر گیا زوبی کے آنسو اس کی آنکھوں میں پھر ہو گئے۔

”بھوک لگ رہی ہے..... امبر جو دور پیٹھی کافی دیر سے زوبی اور شہزاد کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی بالآخر تنہائی سے اکتا کر دونوں کے پاس آ گئی۔ اسے دیکھ کر زوبی خاموش ہو گئی۔ شہزاد نے زوبی سے کہا۔

”کیوں نا آج تمہارے گراچی کا راتجگا بھی دیکھ لیں میں نے سنا ہے یہاں کی نائٹ لائف بارے میں بڑی رونق لگتی ہے یہاں رات بھر۔“ زوبی کی بے بس نگاہیں شہزاد کی مسکراہٹ پہ رشک رہیں تھیں۔

”کہاں سے لاتے ہوتی بے حسی.....“ اس نے دل میں سوچا۔

زوبی نے سی ویو کے بہترین ریستورنٹ سے شہزاد اور امبر کو ڈنر کر وایا راستے بھر شہزاد اور امبر ٹا ناورزاؤں مشہور مقامات سڑکوں اور شاہنگ مالز کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

گاڑی میں بیٹا ثانی کی آواز میں فیض کا، کلام گوں خ رہا تھا۔

گر مجھے اس کا یقین ہو



مرے ہمد مرے دوست  
 کہ ترے دل کی تھکن  
 تری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن  
 مری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی  
 گر مرا حرف نسلی وہ دوا ہو جس سے  
 جی اٹھے پھر تر اچھڑا ہوا بے نور داغ  
 تری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ  
 تری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے  
 گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمد مرے دوست  
 روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں  
 میں تجھے گیت سناتا رہوں

ہلکے شیریں  
 آ بشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت  
 آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت  
 تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں  
 کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم  
 گرم ہاتھوں کی حرارت سے پکھل جاتے ہیں  
 کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش  
 دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں  
 کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور  
 یکے بیک بادہِ احمر سے دھک جاتا ہے  
 کیسے گچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب  
 کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے  
 یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تری خاطر  
 گیت بنتا رہوں، بیٹھتا رہوں تری خاطر  
 پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں  
 نغمہ جراح نہیں، مونوس و غم خوار سہی  
 گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی  
 ترے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا  
 اور یہ سفاک مسیخ مرے قبضے میں نہیں  
 اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں

ہاں مگر ترے سوا، ترے سوا۔ ترے سوا۔!!۔

گھر آتے آتے کافی دیر ہو چکی تھی گھڑی  
نسیم کی نظروں میں اپنے لیے شکایت پڑھ کر اور بھی نادم ہو گئی گھر میں داخل ہوتے زوہبی کے قدم بوجھل ہو گئے۔

”اسلام علیکم پھوپھو.....!“ شہزاد نے ثریا نسیم کو سلام کیا۔

پر نجانے آج اس کی نظریں کیوں جھکی ہوئیں تھیں اس کی نگاہوں میں ثریا نسیم سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ وہ کوئی اور بات کیے بنا سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ زوہبی سراپا خطا بنی ثریا نسیم کے سامنے کھڑی تھی۔

”امبر تم اپنے کمرے میں جاؤ مجھے زوہبی سے کچھ بات کرنی ہے۔ میرے کمرے میں آؤ زوہبی.....“ ثریا نسیم نے اس کے اندر آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کافی دیر بعد زوہبی زرد چہرے کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی ایسا لگتا تھا زمانے بھر کی تکلیف سمٹ کر اس کی روح میں سما گئی ہو۔ امبر اسے دیکھ کر بستر سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

”خیریت.....؟ کیا ہوا.....؟“ زوہبی سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر نظریں گاڑھے بیٹھی تھی۔  
”دیکھو امبر اتنی کوشش کے بعد بھی میرے ہاتھ خالی ہیں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ امبر نے الجھ کر سوال کیا۔

”کیا مطلب.....؟“ زوہبی خاموشی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھتی رہی۔  
”آپی اماں نے کیا کہا..... میرا دل گھبرا رہا ہے تم تو صحرا کی طرح بنجر ہو کچھ بھی نہیں تمہارے چہرے پر نہ آنکھوں میں خدا را کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں کیا سوچ رہی ہو کیا فیصلہ کر بیٹھی ہو۔“ امبر نے پریشان ہو کر زوہبی کے ہاتھ تھام لیے وہ اب بھی خاموش تھی۔

”تم روزیہ روز کیوں اتنی مشکل ہوتی جا رہی ہو کہاں چلی گئی ہے وہ زوہبی جو ہنسا کرتی تھی مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی کون سا روگ لگا کر بیٹھ گئی ہو آپی.....“ امبر رو پڑی۔

زوہبی نے اپنے ہاتھ امبر کے ہاتھوں سے کھینچ لیے اور اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے آسمان کو تکتے لگی۔  
”تم نے کبھی چاند کو غور سے دیکھا ہے امبر.....“ اس کی نظریں افق پہ چمکتے چاند پہ جمی تھیں۔ امبر بے ساختہ بولی۔

”ہاں ہزاروں بار دیکھا ہے۔“

”کیا دکھتا ہے؟“ زوہبی نے پھر پوچھا۔ امبر اٹھ کر زوہبی کے برابر کھڑی ہو گئی۔

”بس چاند دکھتا ہے ہزاروں ستاروں میں چمکتا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ۔“ زوہبی ابھی بھی

چاند پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”یہ صرف چاند نہیں ہے امبر.....“

”یہ اپنے جیسا واحد ہے افق پہ.....“

”ہمارے لیے پورے افق پہ ہزاروں ستارے تو ہو سکتے ہیں پر اس جیسا کوئی دوسرا چاند نہیں ہو سکتا

کوئی اور ہے ہی نہیں جو اس کی آب و تاب کی جگہ لے سکے۔“  
 ”اس جیسا کوئی دوسرا لاسکتی ہو؟ جو اس کی جگہ آسان کو نور بخشنے، افق کی زینت بن کے چمکے، بالکل اس جیسا روشن۔“ امبرابجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں یہ صرف چاند نہیں ہے۔“ زوبی کی آواز اب دلیل کے ساتھ بلند ہو گئی تھی۔ اس نے امبر کو بازوؤں سے تھام لیا۔

”یہ صرف چاند نہیں ہے۔ یہ دیوانگی ہے یہ ناقابلِ تسخیر ہے میری دسترس سے باہر ہے میری پہنچ سے دور ہے۔“ زوبی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”میں اس تک پہنچنے کی لا حاصل کوشش کر رہی ہوں میں جانتی ہوں یہ بے سود ہے پر اس جیسا کوئی اور ملتا بھی تو نہیں جو میرے دل کے افق کی زینت بن جائے۔“ امبر اس کی دیوانگی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔  
 ”محبت ہو جانے اور محبت کرنے میں بہت فرق ہے۔“ زوبی نے سامنے کھڑی حیرت زدہ امبر کو بے بسی سے چھوڑ دیا۔

”دیکھو میرے خالی ہاتھ کچھ بھی میرے بس میں نہیں اماں کو میری کسی کوشش سے کوئی لگاؤ نہیں وہ چاہتی ہیں میں شہزاد سے دور رہوں وہ ان کے دل سے بالکل اتر چکا ہے۔“

”رشتے ٹوٹنے کی وجہ میرا ناقص ہونا ہے، میں اپنی ذات قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تاکہ کم از کم یہ بوجھ میرے دل سے اتر جائے اور ٹوٹے رشتے جڑ جائیں۔“ زوبی کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا وہ تھکے قدموں سے چلتی ہوئی واپس اپنے بستر پہ آ بیٹھی۔

”تم کس قربانی کی بات کر رہی ہو؟“ امبر نے پوچھا۔

”رشتے بچانے کا ایک راستہ ہے جس پہ شہزاد راضی ہے۔“ زوبی کی آواز میں برسوں کی تھکن عود آئی۔ امبر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”دوسری شادی.....“ زوبی کے منہ سے لفظوں کا گولا نکلا اور امبر کی سماعتیں اس دھماکے سے گونج اٹھیں۔

”کیا.....؟“ امبر کے دماغ میں لفظوں کا سیلاب اٹھ آیا پر زبان نے قوت گویائی سلب کر لی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے زوبی کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھی تھی۔

”آپی.....“ امبر نے پھر بولنے کی کوشش کی پردھ کی شدت شاید اتنی تھی کہ زبان الفاظ کا بوجھ اس بار بھی نہ اٹھا سکی۔ وہ زوبی کے قدموں میں نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

”آپی تم تو مایوسی کی حد تک کمزور ثابت ہو گئیں..... اتنی بے بس، اتنی لاچار..... اتنی کم ہمت کہ اپنی ہر خوشی سے ہی دستبردار ہو گئی ہو تمہارے ارمان تمہاری ذات تمہارے خواب تمہاری چاہت تمہاری وابستگی..... وفا..... محبت اس کا کیا؟ ظاہری خوبصورتی کی بنا پر رمشا کو اول نمبر اور تم تمام تر حسین باطن کے ساتھ بھی دوسری غیر ضروری.....“ امبر اس کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

”میرے دل کے افق پہ یہ چاند بھی واحد ہے اپنی ذات میں ہر لحاظ سے مکمل ہے میری بہن کسی سے

کم نہیں۔“ امبر نے اسے خود سے پلٹا لیا۔  
 ”تم کسی بھی حال میں دوسری شادی کے لیے ہاں نہیں کرو گی۔“ رات بھیک رہی تھی ہر طرف جل  
 نکل تھی۔ چاند چھپ چکا تھا ایک اٹق پہ اور ایک زوبی کے دل میں.....  
 صبح کی چائے تیار تھی جب دروازے کی کھنٹی نے زوبی کو چونکا دیا۔  
 ”اتنی صبح کون؟“ زوبی زیر لب بڑبڑائی۔ دروازے پہ یاسر ہاتھ میں آفس بیگ لیے تیار کھڑا مسکرا  
 رہا تھا۔

”آپ؟“ زوبی نے حیرانی سے کہا۔  
 ”اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں اور دو ابھی ترک کر چکی ہوں۔“ زوبی کی بات پر یاسر بے اختیار ہنس  
 پڑا۔ اس نے ہری شوخ نظروں سے زوبی کو دیکھا۔  
 ”لیکن آج تو آپ کو انجکشن لگانا ہے میں تو پوری تیاری سے آیا ہوں۔“  
 ”نہیں.....“ زوبی کچھ اگئی۔

”ہرگز نہیں“ میں کوئی انجکشن نہیں لگاؤں گی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ دروازے میں جمی کھڑی رہی۔  
 بھی ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟“ یاسر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔  
 ”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں اس کا فیصلہ تو میں کروں گا۔“  
 ”جی میں کیوں نہیں کہہ سکتی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے ابھی سب کے لیے چائے بنائی ہے  
 ..... اگر بیمار ہوتی تو کیسے بنائی۔“ زوبی کی معصومیت پہ یاسر پھر ہنس پڑا۔  
 ”اب اس کا فیصلہ تو چائے پی کے ہی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کتنی ٹھیک ہیں۔“  
 ”جی جی کیوں نہیں۔“ زوبی یاسر کو ہال کمرے میں موجود ڈائننگ ٹیبل تک لے آئی جہاں چائے  
 قرینے سے ایک خوبصورت سی ٹی کوزی میں سچی رکھی تھی۔

”آپ پیئیں۔“ زوبی نے چائے کا کپ یاسر کے سامنے رکھا۔  
 ”میں اماں کو بلاتی ہوں۔“ زوبی کے جانے کے بعد یاسر کی نظر ٹی کوزی پہ لگے شیشوں کے درمیان  
 کڑھے ہوئے زوبی کے نام پہ پڑی وہ دل ہی دل میں زوبی کے ہنری کی داد دیے بنانہ رہ سکا۔ اس نے  
 انتہائی خوبصورت اور نفیس شیشوں اور ہاتھ کی کڑھائی سے ٹی کوزی بنائی تھی۔  
 ”کیسے ہو بیٹا.....“ ثنائیم زوبی کے ساتھ ہال کمرے داخل ہوئیں۔ یاسر انہیں دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا  
 اور ادب سے سلام کیا۔

”جیتے رہو بیٹھو آج اتنی صبح کیسے آنا ہوا؟“  
 آنٹی آج بھی بس آپ کو تنگ کرنے ہی آیا ہوں دراصل میں ایک کانووکیشن کے سلسلے میں کچھ دن  
 کے لیے اسلام آباد چارہا ہوں۔ امی گھر میں بالکل تنہا ہوں گی لہذا آپ کو بتانا مناسب سمجھا ویسے تو آپ  
 بھی امی کے پاس آئی رہیں گی مگر آپ سے مجھے بہت ڈھارس رہتی ہے۔“  
 ”بیٹا تم بالکل بے فکر ہو کر جاؤ امیرا بہن کی خوش قسمتی ہے جو تم جیسی فرما بردار اولاد کی ماں ہیں ہم  
 سب ان کا خیال رکھیں گے۔“

”آپ کا بہت شکریہ۔“ یاسر نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 آپ کی چائے پی کر اندازہ ہوا کہ آپ واقعی بالکل ٹھیک ہیں۔“ یاسر کی شرارت بھری ہنسی آنکھیں  
 زوہبی کو دیکھ کر مسکرا دیں۔  
 ”اب خیال رکھیں تاکہ ایسی ہی چائے ہمیشہ ملا کرے۔“ یاسر کی بات سن کر زوہبی بھی مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

”کیا سوچ رہی ہیں اماں؟“ یاسر کے جانے کے بعد ثریا نسیم کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر زوہبی ان  
 کے پاس بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں تم شہزاد کو جگاؤ اور ناشتہ لگا دو۔“ ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ وہ جب بھی شہزاد کا ذکر کرتیں ان کا  
 ماتھا شکن آلودہ ہو جاتا۔ زوہبی خود میں چوری ہو گئی۔

”میں جاگا دوں؟“ ثریا نسیم کوئی جواب دیے بنا اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ زوہبی دیکھتے قدموں  
 سے چلتی ہوئی شہزاد کے کمرے تک پہنچی وہ کچھ دیر بند دروازے کے باہر اپنی تیز دھڑکنوں پہ قابو پانے کی  
 ناکام کوشش کرتی رہی اس نے کانپتے ہاتھ سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”اندرا آ جاؤ۔“ شہزاد کی بھاری آواز بند دروازے کے پیچھے سے زوہبی کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس  
 نے دروازے کا لاک گھمایا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ نیم تاریک تھا شہزاد کا لی ٹی شرٹ میں ملبوس موبائل  
 پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ زوہبی کو دیکھ کر اس نے کال منقطع کر دی۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف عیاں  
 تھی۔ اور نظریں ابھی بھی موبائل پہ جمی تھیں۔

”ناشتہ تیار ہے۔“ زوہبی نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے ابھی بھوک نہیں۔“ زوہبی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ جانتی ہیں میں دو ہرے عذاب میں مبتلا ہوں، آج بوجی اور پھوپھو مجھے دونوں کو منانا ہے۔ آج بوجی  
 مجھے ناکام واپس بلانا نہیں چاہتے اور پھوپھو مجھے کامیاب لوٹنے نہیں دیں گی۔ آپ نے اس مسئلے کا کیا حل  
 سوچا ہے؟“ شہزاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ زوہبی پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ شہزاد اس کے سامنے کھڑا  
 تھا اس نے کبھی سنا تھا بولتی آنکھیں وہ بولتی آنکھیں آج پہلی بار سن رہی تھی۔

وہ کچھ نہ بھی کہتا تو اس کی نگاہیں سب کہہ دیتی تھیں وہ ان کی بولی جانتی تھی اس نے نظریں جھکا لیں۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کچھ باتیں اختیار میں نہیں، بس سے باہر ہوتی ہیں۔“

”نہ آپ میرے اختیار میں ہیں نہ حالات نہ قسمت اور نہ یہ محبت جس کی آپ کی نظروں میں کوئی  
 قدر نہیں اور مجھے آپ کا سودا بھی عزیز ہے مجھے فنا ہونا قبول ہے میں جلد اماں سے اس بارے میں بات  
 کروں گی۔“

”اگر میری فنا میں ہی سب کی بقا ہے تو میرے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اماں ناشتے پہ آپ کی منتظر  
 ہیں۔“ زوہبی کے لیے اب مزید وہاں روکنا محال تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

آج زوہبی دوپہر کے کھانے سے سچی ٹرے کے ساتھ امیر ایگم کے سامنے موجود تھی

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی بیٹا.....“ ان کو خوشگوار حیرت ہوئی زوہبی نے کھانا سلیقے سے میز پہ چن

دیا۔ اس کے ہاتھ سے بنے کھانے کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ زوبی ڈانگ ٹیبل پہ ان کے ساتھ والی کرسی سرکا کر بیٹھ گئی۔

”میری طبیعت کب خراب کب ٹھیک کچھ پتا نہیں چلتا بڑھا پابذات خود ایک بیماری ہے جسے چوبیس گھنٹے نگہداشت کی ضرورت ہے اور آج کل کے مصروف دور میں جہاں کسی کے لیے چند لمحات بھی لوگ مشکل سے نکال پاتے ہیں یا سرمیری خدمت سے نہیں تھکتا، میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔“ ان کی آنکھیں میٹھی کی محبت سے چمک رہی تھیں۔

”تم کھانے میں اتنا اہتمام نہ کیا کرو بیٹی۔“ انہوں نے قورمہ بریانی سے بھی میز دیکھ کر کہا۔

”میں تو بہت سادہ کھانا کھاتی ہوں۔“ زوبی نے پانی کا گلاس ان کے قریب رکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو کھانے میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟“

”دال چاول۔“ انہوں نے بنا تردد کے جواب دیا۔

”نہ بنانے والے کو پریشانی نہ کھانے والے کو مصیبت۔“ زوبی ان کی بات سن کے ہنس دی۔ وہ کچھ

دیر ان سے باتیں کرتی رہی اس سچے انہوں نے برائے نام ہی کھانا کھایا۔ زوبی شام میں دوبارہ آنے کا کہہ کر گھر واپس لوٹ آئی۔

☆.....☆.....☆

”آج پھر اس بارش نے لائٹ کا ستیاناس کیا ہوا ہے۔“ نجمہ بھابی منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ سلسلی

باجی ان کے ساتھ مل کر چھت سے سوکھے کپڑے اتار رہی تھیں۔

”کچھ خبر ہے سلسلی کب تک لوٹے گا شہزاد کراچی سے؟“

”مجھے کیا پتا.....؟“ سلسلی باجی نے نجمہ بھابی کے سوال کا مختصر سا جواب دیا اور بے نیاز ہو گئیں۔ نجمہ

بھابی کے چلتے ہاتھ رک گئے۔

”ہاں مجھے کیوں بتانے لگے تم لوگ گھر میں کیا کچھڑی پک رہی ہے پر میں سب جانتی ہوں شریا پھوپھو

کی بیٹی سے کر ہی نہ لے وہ شادی ناک پہ کبھی تک تو بیٹھنے نہیں دیتا۔ رمشا سے اس کے چکر کے قصے

سارے خاندان کو معلوم ہیں تو کیا مجھے نہیں پتا ہوگا، کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے یہ بات اور تم لکھ کے رکھ

لو وہ شادی کرے گا تو اپنی مرضی سے ضد کا بڑا پکا ہے دیکھ لینا آج کی بات بھی نہیں مانے گا۔“ سلسلی باجی

اب پوری طرح نجمہ بھابی کی جانب متوجہ تھیں۔ نجمہ بھابی نے آواز دہمی کر کے کہا۔

”تم کو یاد نہیں خاندان کے کتنے ہی رشتے اس نے رمشا کی خاطر ٹھکرائے ہیں یہ کون سی پہلی بار

ہے۔ خالانے اس کے آگے ناک رگڑ لی اپنے بھائی کی بیٹی مدیحہ کے لیے کتنا ارمان تھا ان کو کہ شہزاد وہاں

شادی کرے پر اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔“

”ہاں سب یاد ہے۔“ سلسلی باجی بولیں۔

”جب ہی اماں کو رمشا ایک آنکھ نہیں بھاتی اور نہ مجھے کسی کی عزت کا، کوئی خیال ہی نہیں اسے۔ اماں

نے تو اس کے گھر جا کر کہہ دیا تھا کہ چھوڑ دے شہزاد کا پیچھا پر وہ تو شہزاد کو اپنی جائیداد سمجھتی ہے اس نے امی

جی کی بات کو اہمیت ہی نہیں دی۔ میں بھی کتنا سمجھاؤں شہزاد کو اس کی وجہ سے امی اور آجی کتنے پریشان

ہیں اسے کچھ خیال ہی نہیں۔“ سلمیٰ نے کپڑے ٹب میں ڈالے اور سیڑھیاں اترنے لگی۔  
 ”اس کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں وہ تو پہلے ہی کہتا ہے اپنی رمشا کو آپ لوگوں کے سائے سے بھی  
 دور رکھوں گا۔“

”یہ تو میں ہی ہوں جو تم لوگوں کو برداشت کر رہی ہوں تم دیکھنا کیسے راج کرتی ہے وہ مہارانی تم  
 لوگوں پر شہزاد کی مہربانی سے.....“ نجمہ بھابی کی تلخ آواز نیچے تک سلمیٰ باجی کا پیچھا کرتی رہی۔ ہاشم احمد  
 کے کمرے کے سامنے پہنچ کر سلمیٰ باجی کے قدم رک گئے چار پائی پر بیٹھے ہاشم احمد کے چہرے سے پریشانی  
 صاف عیاں تھی۔

اس نے کپڑوں کا ٹب زمین پر رکھا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ان کے سامنے کھڑی رہیں  
 پر ہاشم احمد نے انہیں نظریں اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”کیا ہوا سلمیٰ ایسے کیوں کھڑی ہو یہاں؟“ اماں بشیراں کے سوال پر سلمیٰ باجی پھٹ پڑیں۔  
 ”میں بوجھتی ہوں آخر ایسا کیا خاص تھا شہزاد میں جو ساری جمع پونجی اس پہ لگا کر اسے انجینئر بنایا۔ ہر  
 طرح اس کے خرچے اٹھائے اسے اس قابل بنایا کہ وہ اچھا کما کھا سکے کیا اس دن کے لیے کہ وہ زمانے  
 بھر میں ہمارا منہ کالا کرتا پھرے میرے سسرال والے الگ مجھے طعنہ دیتے ہیں اور آج نجمہ بھابی کی  
 باتیں تو آپ نے سن ہی لی ہوں گی۔“ کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سلمیٰ باجی  
 پھر بولیں۔

”ابو جی کب واپس آنا ہے شہزاد نے؟ میں تو کہتی ہوں کر دیں اس کی شادی جہاں وہ چاہتا ہے ویسے  
 بھی اس نے آج تک ہماری مانی ہی کب ہے۔“ ہاشم احمد سر جھکائے بیٹھے تھے۔  
 ”میں نہیں جانتا وہ کب واپس آئے گا نہ اس سے میرا کوئی رابطہ ہے۔ کراچی جانے کے بعد میری  
 اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں میری ایک ہی بہن تھی اور اب اس کے لیے میں مر  
 چکا ہوں۔“ ہاشم احمد کی آنکھوں سے بہتے آنسو ان کی بے بسی کی گواہی دے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”اے عشق ہمیں بر باد نہ کر بر باد نہ کر۔“ زوبی کے کمرے میں نیرہ نور کی آواز میں اختر شیرانی کا کلام  
 سر بکھیر رہا تھا وہ محو سماعت تھی۔

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر

پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم تو اور ہمیں ناشاد نہ کر

قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر

یوں ظلم نہ کر بیداد نہ کر

راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں رورو کے دعائیں کرتے ہیں

آنکھوں میں تصور دل میں خلش سر دھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں

اے عشق یہ کیسا روگ لگا جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں

اے عشق ہمیں بر باد نہ کر

جس دن سے بندھا ہے دھیان ترا گھبرائے ہوئے سے رہتے ہیں  
ہر وقت تصور کر کر کے شرمائے ہوئے سے رہتے ہیں  
کھلائے ہوئے پھولوں کی طرح کھلائے ہوئے سے رہتے ہیں

پامال نہ کر برباد نہ کر  
دنیا کا تماشا دیکھ لیا غمگین سی ہے بیتاب سی ہے  
امید یہاں اک وہم سی ہے تسکین یہاں اک خواب سی ہے  
دنیا میں خوشی کا نام نہیں دنیا میں خوشی نایاب سی ہے  
دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر  
اے عشق ہمیں برباد نہ کر۔

دروازے کی دستک پہ زوہی چونک گئی۔ شہزاد ہاتھ میں ایک شرٹ لیے دروازے پہ کھڑا تھا۔  
”آپ یہاں ہمارے کمرے میں؟“ امبر جو کتاب پڑھنے میں مصروف تھی شہزاد کو دیکھ کر سخت چڑھ گئی۔

”جی..... میں آج کل یہیں پایا جاتا ہوں آپ کے گھر میں، اور ماتھے پہ اتنے بل کیوں؟“ وہ مزے سے دندنا تھا امبر کے بیڈ پہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”اب تو میں سیکھ گیا ہوں کے لڑکیوں کے کمرے میں بنا دستک دیے نہیں جاتے۔“ شہزاد نے شوخ نظروں سے امبر کو دیکھا۔ امبر نے کتاب بستر پہ پچی اور کمرے سے باہر چلی گئی کمرے میں ابھی بھی نیرہ نور کی آواز سر بکھیر رہی تھی۔

”غزلیں پسند ہیں آپ کو؟“ شہزاد کے سوال پہ زوہی بس پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ نہ جانے ایسا کیوں تھا۔ شہزاد کے سامنے نہ اس کی زبان ساتھ دیتی اور دھڑکن بے قابو ہو جاتی تھی۔

”شہزادی ہو کر اتنی سادہ کیوں رہتی ہیں آپ؟“  
”میں نے کبھی آپ کی آنکھوں میں کا جل نہیں دیکھا۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں اور کالا رنگ ہی کیوں اتنا پہنتی ہیں، کیا کوئی لال رنگ نہیں ہے آپ کے پاس یا آپ کو پسند نہیں ہے؟“ زوہی شہزاد کے سوالوں پر اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جھک کر بولا۔

”میں نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے لگا ہوں آپ کو میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہے، پر ایسا ہی ہے، میں چاہتا ہوں اس خوبصورتی میں اضافہ کیا جائے مجھے نوز رنگ پسند ہے آپ پر بہت اچھی لگے گی پہن کریں۔ یہ شرٹ چھوڑے جا رہا ہوں۔ استری کر کے روم میں رکھ دیجیے گا آج آپ کا ذمہ میری طرف سے۔ جہاں آپ بولیں جو آپ کی پسند۔“ شہزاد اٹھ کھڑا ہوا زوہی ابھی بھی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی وہ اسے یوں ہی حیرت زدہ چھوڑ کر جانے کے لیے مڑا تو شریا نسیم کو سامنے کھڑا پایا۔ زوہی کا چہرہ ان کو دیکھ کر زرد ہو گیا۔

”اماں.....“ زوہی کے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔  
”لاؤ میں کر دیتی ہوں استری۔“ شریا نسیم نے شرٹ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ زوہی نے نہ سمجھنے



والے انداز میں انہیں دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ لاؤ مجھے دو کوئی حرج نہیں اگر میں بھی شہزاد کی کچھ خدمت کر دوں چند دن بعد اس نے چلا ہی جانا ہے۔“

”نہیں پھوپھو میں خود کر لوں گا۔“ شہزاد نے زوبی کے ہاتھ سے شرٹ جھٹی اور کمرے سے نکل گیا۔ ثریا نسیم نے زوبی کے قریب ہو کر اس کے شانے پہ بکھرے بال سمیٹ دیے۔

”میں تمہیں یاد دلانے آئی تھی اگر مفت کی خدمتوں سے فرصت مل جائے تو رات کا کھانا امیرا بہن کے ہاں پہنچانے کی بھی ذمہ داری تمہاری ہے، مگر مجھے لگتا ہے اور بھی بہت سی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کروانی پڑے گی۔“

”جی اماں۔“ زوبی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”زوبی.....“ ثریا نسیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا

”خود کو مضبوط کر لو زندگی بعض اوقات ایسے مقام پہ آ جاتی ہے جہاں دماغ کی آواز دل کے دلائل کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہے۔ صحیح غلط کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔“ ثریا نسیم کمرے سے جاتے جاتے پھر رک گئیں۔

”زوبی..... ایک بات یاد رکھنا مجھے تم سے ابھی تک کوئی گلہ نہیں ہے اور میں امید رکھتی ہوں یہ بھروسہ قائم رہے گا۔“ اماں کے جانے کے بعد زوبی مزید الجھ گئی دل اور دماغ فیصلہ کس کا بہتر ہے یہ فیصلہ کون کرے گا اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”وقت.....؟“ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

”اور وقت اگر ہاتھ سے نکل گیا تو؟“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے لگے قد آور آئینے میں موٹی زوبی کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ آج زوبی نے پرانے کپڑوں سے گلانی جوڑا نکالا جس کے ساتھ لال چمک کا ڈوپٹہ تھا وہ سلیقے سے تیار ہوئی کانوں میں آویزے ہاتھوں میں جڑاؤنگن امبر نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”ارے واہ..... چاند زمین پہ اتر آیا اس نے پیار سے اپنی باہیں زوبی کے گرد حائل کر دیں بہت پیاری لگ رہی ہو آپ، راتنا اہتمام کیوں؟ شہزاد نے پہلے جا رہے ہیں۔“

”کیا؟“ امبر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”تم تنہا؟ اور اماں نے اجازت دے دی؟“

”ہاں دے دی انہیں مجھ پہ بھروسہ ہے انہوں نے فیصلہ مجھ پہ چھوڑ دیا ہے۔“ زوبی نے نظر اٹھا کر ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔

”تم شاید بھول گئی ہو۔“ امبر کی آواز اسے اپنے عقب سے سنائی دی۔

”پہلی بار کا شکر انا، اپنے آنسو اماں کا چہرہ اپنی بے بسی..... اس کا غرور اپنی بے عزتی..... سب بھول گئی ہوں۔“

”نہیں مجھے سب یاد ہے، لیکن میں نے شہزاد کی آنکھوں میں اپنے لیے امید کی کرن دیکھی ہے۔“

# دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر لسٹ 2020ء

|   |             |                      |                                                                         |
|---|-------------|----------------------|-------------------------------------------------------------------------|
| 1 | جنوری       | شہر صد آئینہ         | عالی مان آفاقی                                                          |
| 2 | فروری       | بھوکے                | خولہ عرفان                                                              |
| 3 | مارچ        | گواہی                | ڈاکٹر عزیزہ انجم<br>لاک ڈاؤن کی وجہ سے<br>ایوارڈ اناؤنس نہیں ہو سکا تھا |
| 4 | جون/ جولائی | کچے رنگوں کی محبت    | ناہید طاہر<br>لاک ڈاؤن کی وجہ سے<br>ایوارڈ اناؤنس نہیں ہو سکا تھا       |
| 5 | اگست        | محبت ادھوری عشق مکمل | خولہ عرفان                                                              |
| 6 | ستمبر       | دھول                 | تحریم امان اللہ                                                         |
| 7 | اکتوبر      | لاک ڈاؤن             | رضوانہ پرنس                                                             |
| 8 | نومبر       | ؟؟؟؟؟؟               | ؟؟؟؟؟؟                                                                  |
| 9 | دسمبر       | ؟؟؟؟؟؟               | ؟؟؟؟؟؟                                                                  |

”اگر صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ زوبی نے پیار سے اس کا گال سہلایا اور کھانے کی ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔  
 ”بھول۔“ امبر کے دل سے صدا آئی۔  
 ”کہیں تم سے تو نہیں ہو رہی آپ۔“ امبر بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پر زوبی جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اتنا تکلف کیوں کر رہی ہو بیٹا۔“ امیرا بیگم نے زوبی کے سر پہ شفقت سے ہاتھ رکھا۔  
 ”آئی آپ کی پسند بنائی تھی تو بس آپ کے لیے آئی۔“ زوبی نے دال چاول کی ٹرے ڈانگنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

”ارے واہ.....“ امیرا بیگم مسکرا دیں۔

”جیتی رہو۔“ زوبی ان کے کھانا کھانے تک وہاں بیٹھی رہی کچھ گھر کی بکھری چیزیں سمیٹیں اور امیرا بیگم کا کمرہ قرینے سے صاف ستھرا کر دیا۔ امیرا بیگم کا دل زوبی کے اخلاق و ادب کا گرویدہ ہو گیا تھا۔  
 زوبی نے کھانے کے برتن سمیٹے اور اجازت چاہی، انہوں نے اس کا ہاتھ چوما۔

”آپ بہت ہی اچھی بیٹی ہیں۔“ زوبی مسکرا دی۔

”اور آئی آپ بہت اچھی اور شفیق ماں ہیں۔“ زوبی کے جانے کے بعد بھی امیرا بیگم اس کے بارے میں سوچتی رہیں ان کے دل نے ایک فیصلہ کیا تھا اب انہیں یا سر کا بے چینی سے انتظار تھا

☆.....☆.....☆

شہزاد نے زوبی سے کسی ایسی جگہ کے انتخاب کی فرمائش کی جہاں لوگوں کا رش نہ ہو اور تنہا بات کرنے کا موقع مل سکے زوبی شہزاد کے ساتھ ایک پوش علاقے کے ریستورانٹ میں موجود تھی خاموش ماحول میں ان کی ٹیبل کے اوپر ایک شینڈلیئر روشن تھا ہلکی موسیقی کی دھن بھلی معلوم ہو رہی تھی زوبی نظریں جھکائے شہزاد کے سامنے بیٹھی تھی۔ شہزاد کی نظریں اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔  
 ”اف یہ نظریں.....“ زوبی اپنے چہرے پہ شہزاد کی نظریں محسوس کر سکتی تھی۔

”آپ پونہی نظریں جھکائے بیٹھی رہیں گی، میں آپ کی میٹھی آواز سنا چاہتا ہوں، کچھ کہیے۔“ زوبی کی نظریں اور بھی جھک گئیں۔

”کیا بولوں؟“

”جو بھی آپ کے دل کی خواہش ہے کہہ دیں میں سننا چاہتا ہوں۔“ زوبی نے نظریں اٹھا کر شہزاد کو

دیکھا۔

”آہ یہ شخص میری خواہش لا حاصل.....“ زوبی کے کانپتے ہونٹوں سے اس کی محبت چھلکنے لگی۔

کبھی یوں بھی ہو سکی رات میں

کہ تیری آنکھ کے قریب ہی

کوئی میری یاد کا گل کھلے

تیری خوشبو سے وہ مہکا کرے

تیرے نور سے وہ دھکا کرے  
 تیری چاندنی میں وہ ڈوبا کرے  
 تیری پلکوں کو وہ چوما کرے  
 کسی رات تیرے رخسار پہ میری خواہشوں کا عکس ہو  
 تیرے روبرو بس ایک بار میری چاہتوں کا رقص ہو  
 تیری نیند سے سیلے ہوئے کسی خواب کا میں تھہ بنو  
 میں بھی فقط ایک بار روح میں تیری دمکا کروں  
 وہ بس ایک بار کی بات ہو  
 وہ کوئی خوش نصیب رات ہو  
 جو مجھ کو تجھ سے ملا کے پھر کبھی کسی سے نہ ملا سکے  
 مجھے تیرے وجود سے ملا دے پھر  
 نہ زندگی میری وفا کرے  
 وہ بس ایک رات کی بات ہو  
 جب تیرا میرا ساتھ ہو  
 تیری آنکھ کے پاس کھلا کرے  
 میری زیست یہی دغا کرے  
 (شمینہ مشتاق)

اس اظہار کے بعد زو بی کی آنکھیں نم تھیں اور شہزاد اس کے جذبات سن کر حیران تھا۔  
 ”زو بی.....“ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”مجھے چائے نہیں پسند پر آپ کے ہاتھ کی پینے لگا ہوں مجھے پرانی غزلیں نہیں پسند پر آپ سنتی ہیں تو میں سنتا ہوں۔ مجھ پر آپ کی چھاپ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ میں آپ کے رنگ میں رنگنے لگا ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو رہا ہے لیکن آپ کی محبت مجھے اپنے حصار میں جکڑ رہی ہے۔ میں نے رمشا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان آنکھوں کی صداقت پہ یقین کر لیں زو بی میری اس محبت پہ ایمان لے آئیں جو میرے دل میں آپ کے لیے جگہ بنا چکی ہے۔“ زو بی حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”مگر! چانک..... یہ سب۔“ زو بی نے کہنا چاہا لیکن الفاظ زبان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

”اچانک نہیں زو بی جب سے آپ سے ملا ہوں شاید خود سے جدا ہو گیا ہوں ایسی فریفتگی میں نے کبھی رمشا میں نہیں دیکھی آپ کے پر خلوص اور سچے جذبے نے مجھے آپ کی جانب جھکنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“  
 ”کیا واقعی۔“ زو بی کو یقین نہیں آیا۔

”ہاں زو بی میں سارے آنسوؤں کا مداوا کر دوں گا اب کی بار آپ جب گاؤں آئیں گی میری آنکھوں کو اپنا منظر پائیں گی۔“ شہزاد کی باتیں زو بی کو خواب لگ رہی تھیں لیکن حقیقت اس کی نظروں کے

# دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر لسٹ 2019ء

|    |        |                     |                                  |
|----|--------|---------------------|----------------------------------|
| 1  | جنوری  | تلافی               | فائزہ مشتاق                      |
| 2  | فروری  | منافق               | شمینہ مشتاق                      |
| 3  | مارچ   | کھڑکی               | عقیلہ حق                         |
| 4  | اپریل  | پیپ                 | شمینہ مشتاق                      |
| 5  | مئی    | جی لایزل            | فرح اسلم قریشی                   |
| 6  | جون    | بازگشت              | کاوش صدیقی                       |
| 7  | جولائی | آخری یقین / دکھ     | شمینہ مشتاق / حافظہ مون بخاری    |
| 8  | اگست   | سرمرگاں             | شمینہ عرفان راجپوت               |
| 9  | ستمبر  | عورت، سمندر اور میں | نسیم سیکینہ صدف                  |
| 10 | اکتوبر | گستاخ دل            | ڈاکٹر نعمان اسحاق                |
| 11 | نومبر  | گمان / جہان دیدہ    | افتخار چوہدری / ڈاکٹر عزیزہ انجم |
| 12 | دسمبر  | مسیحائی             | افسر سلطانہ                      |

سامنے تھی۔

”بس میری اتنی التجا ہے مجھے تھوڑا وقت دیں آپ سمجھ سکتی ہیں میں ایک دم رمشا کو انکار نہیں کر سکتا چھ سال کی وابستگی ایک پل میں ختم نہیں کی جاسکتی۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں۔“ زوبی آہستگی سے بولی۔

”آپ سمجھ سکتی ہیں پر پھوپھو کو سمجھانا بھی آپ کی ذمہ داری ہے انہیں راضی کریں کہ وہ اپنے حالات ابو جی کے ساتھ بہتر کر لیں میں یقین دلاتا ہوں کچھ عرصے بعد میں رمشا کو چھوڑ کر آپ سے شادی کر لوں گا۔“

”مجھے یقین ہے شہزاد۔“ زوبی مسکرائی۔ شہزاد نے زوبی کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔

زندگی ایک نئی ڈگر پہ چل پڑی تھی زوبی آسمان کی اس اونچائی پہ کھڑی تھی جہاں سے ہر منظر حسین لگ رہا تھا شہزاد کی محبت کا حصول اس کے لیے آب حیات سے کم نہ تھا جس نے اسے حیات جاوداں عطا کر دی تھی۔

گھر لوٹنے کے بعد ثریا نسیم نے زوبی سے کوئی سوال نہ کیا اس کے چہرے سے چھلکتی خوشی وہ با آسانی دیکھ سکتی تھیں لیکن نہ جانے کیوں زوبی کی یہ خوشی انہیں پر مسرت نہ کر سکی۔ امبر بھی خاموش تھی۔

”تم نے مجھ سے کل رات کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں۔“ زوبی نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ امبر نے اسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیا پوچھوں۔ تم خوش ہو بس کافی ہے۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔ میں زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے جا رہی ہوں اور تم ہو کے اتنی بیزار ہو۔“

”کیسا فیصلہ؟“ امبر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”شہزاد مجھ سے شادی کے لیے راضی ہو گئے ہیں۔“ زوبی نے خوشی سے کہا۔

”بہت جلد ہم ایک ہو جائیں گے وہ کچھ وقت کے بعد رمشا کو چھوڑ دیں گے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ امبر کے چہرے پہ تغیر میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”رمشا کو چھوڑ دیں گے؟ اتنی آسانی سے؟“ اچانک؟ یہ کیا بکواس ہے؟ اس آدمی کا کوئی دین ایمان بھی ہے یا نہیں؟ کیا کسی کو اس طرح اچانک چھوڑ دینا شہزاد بھائی کے لیے اتنا آسان ہے؟“

”ارے بابا سمجھنے کی کوشش کرو اسے اچانک نہیں چھوڑ دیں گے کچھ عرصے تک رمشا کو سمجھانے کے لیے انہوں نے وقت مانگا ہے۔“

”کیا سمجھانے کے لیے؟“ امبر نے پھر پوچھا۔

”یہی کہ شہزاد اس سے اب شادی نہیں کر سکتے اور کیا۔“ زوبی چبکی۔

”اور وہ مان جائے گی؟“ امبر بولی۔

”ہاں اور کیا کرے گی؟ جب کوئی راضی ہی نہیں ہے۔“ زوبی نے کہا۔ کچھ دیر کے لیے امبر کے الفاظ اس کے حلق میں گولہ بن کے انک گئے۔ ذہن اتنی تیزی سے سب کچھ سوچ رہا تھا۔

(جاری ہے)

# کڑوا بادام

”مجھے تو شروع سے تم پسند تھیں انیلا، تمہاری بجو میں وہ بات کہاں جو تم میں ہے۔“ وہ خبیث لہجے میں بولا، میں تو کب سے اس موقع کی تلاش میں تھا مگر تم کبھی میرے گھر رکنے نہیں آئی، آج موقع ملا تم سے دل کی بات کرنے کا، یہ فریبی شخص جب یہ سب باتیں کر رہا تھا تو.....

اپنی تمام قوت کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور بالآخر کامیاب ہو گئی، میں شاید گہری نیند کی مدہوشی میں تھی مجھے لگا کوء ڈراؤنا خواب ہے آنکھ کھلی تو ختم ہو جائے گا، مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ وہ ڈراؤنا خواب ہے جو آنکھ کھلنے پر شروع ہوگا۔

☆.....☆.....☆

ارے یہ کیا انیلا.....؟ تم ابھی تک تیار نہیں ہوو؟ میں ابھی محض ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھی اور اپنی ازلی سستی کے باعث ہنوز صوفے پہ براجمان تھی کہ ناہید باجی جو کہ میری اکلوتی بڑی بہن تھیں تشریف لے آئیں چونکہ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی تھیں تو ان کا انداز گفتگو ہمیشہ بہت تحکمانہ ہوا کرتا تھا اور آج تو وہ تشریف بھی خاص کر میرے لیے لائیں تھیں تاکہ میری شادی جو کہ دو مہینے بعد ہونا طے پائی تھی، اس کی تیاری میں میری مدد کرا سکیں۔ اسلام علیکم..... قاسم بھائی بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے آئے تو چارونا چار مجھے نشست چھوڑنا ہی پڑی۔ ناہید باجی اور قاسم بھائی کی شادی کو دس سال کا

رشتے، جو ہمیں قدرت عطا کرتی ہے جو ہمارے وجود میں بھی آنے سے پہلے ہمیں زندگی سے تحفے میں ملتے ہیں جو خود ہمارا وجود ہوتے ہیں، جینے کا سہارا ہوتے ہیں جینے کی وجہ ہوتے ہیں، وہیں کچھ رشتے ہمیں دنیا سے ملتے ہیں دوستی کے، محبت کے، خلوص کے، اپنائیت کے، مگر جہاں خوبصورتی ہے وہیں بدصورتی بھی ہے جہاں رشتوں کے اتنے رنگ ہیں انہی پیارے رنگوں میں کچھ بھدے رنگ بھی ہیں جو منہ پر نقاب چڑھائے ملتے ہیں اور نقاب زیادہ دیر پا نہیں ہوتے بھی نا کبھی کسی موڑ پر انکو اترنا ہی ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کوئی وحشت زدہ سا میرا دم گھونٹ رہا تھا، میرے لیے سانس لینا دو بھر سا ہو گیا تھا، ناصر مجھے بچالیں دیکھیں یہ مجھے مار رہا ہے میرا دم گھونٹ رہا ہے، میں بے بسی کے عالم میں کسی نامنہ سے آواز نکلتی تھی نا ہی ہاتھوں میں پٹنے کی سکت تھی، انف میرے خدا یا مدد، میں نے پوری شدت سے خدا کو یاد کیا اور

شاہنگ پر جانے کے لیے آنا تھا سو وہ بھی رکنے پر آمادہ ہو گئی۔

ہم دونوں بہنیں شاہنگ بیک سنبھالتے اوپر ا گئے، قاسم بھائی نیچے سے ہی جا چکے تھے،

یار بجو دعا کیا کرو کہ ناصر بھی قاسم بھائی جیسے شوہر ثابت ہوں، ہم لوگ گھر میں داخل ہو چکے تھے اور بیگز ٹیبل پر رکھ کر میں صوفے پر اور بجو تخت پر براجمان ہو چکی تھی، کھانا ہم کھا چکے تھے اور امی چائے لے آئیں تھیں۔

پھر تقریباً ایک مہینہ لگا مجھے شادی کی تیاریاں مکمل تو نہیں مگر کسی حد تک کرنے میں جس میں میری بہن اور بہنوئی پیش پیش تھے، میں دیکھتی قاسم بھائی کے ماتھے پر بھی ایک شکن تک نا آئی جیسے عمومی طور پر دامادوں کے چہرے سسرال کے نام سے ہی تن جاتے ہیں، قاسم بھائی تو جیسے ہمارے لیے ایک نعمت ثابت ہو رہے تھے میں دیکھتی اور بجو کی قسمت پر رشک کیے جاتی۔

”مگر ہر چکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن چمک

عرصہ بہت گیا تھا دونوں اولاد کی نعمت سے محروم تھے مگر قاسم بھائی ایک آئیڈیل شوہر تھے بھی کبھی مجھے اپنی بہن کی قسمت پر رشک آتا کہ کتنا سلجھا ہوا اور نرم مزاج انسان اس کا ریش سفر ہے۔

اب جلدی جلدی برتن سمیٹو اور چلنے کی تیاری کرو، ادھادان گھر میں ہی گزر جائے گا نہیں تو، والدہ نے مجھے آرام سے کام کرتے دیکھا تو فوراً ٹوک دیا میں بھی جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

پھر ہم نکلے تو تقریباً رات دس بجے کے قریب گھر میں قدم رکھا تھکن سے برا حال تھا،

ناہید اگر تمہیں یہاں رکنا ہے تو رک جاؤ، پارکنگ میں ہی قاسم بھائی نے بجو کو مخاطب کیا جو شاہنگ بیگز سمیٹا لے ہوئے تھی،

ہاں نا بجو رک جاؤ نا پلیز، میں جو پہلے سے ہی یہ چاہتی تھی کہ بجو رک جائے مگر شاید قاسم بھائی کو برانا لگے اس خیال سے چپ تھی مگر ان کے خود کے کہنے کرنے پر میں بھی اصرار کیے بنانا رہ سکی، بجو بھی خوب ہی تھک چکی تھی اور کل پھر انہوں نے میرے ساتھ





اصلی ہو یا نقلی آنکھوں کو خیرہ ضرور کر دیتی ہے۔“  
وقت پر لگا کے گزرا اور میں دلہن بن کے ناصر

کے آنگن میں آ گئی ، ناصر میرے لیے خدا کے عطا کردہ انعام سے کم تھے وہ ایک انتہاء محبت کرنے والے اور شریف النفس انسان ثابت ہوئے۔ میں خدا کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا، میں جو شادی سے پہلے بہت سے خدشات کا شکار تھی اور قاسم بھائی کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتی کہ پتا نہیں ناصر کیسے ہوں گے اتنے ہی خیال رکھنے والے ہوں گے یا نہیں اب انتہاء پر سکون ہو گئی تھی۔

میری شادی کو سال ہی گزرا اور منہی مسکان میری زندگی میں آ گئی میں اپنی نئی زندگی میں خوش اور مگن تھی کہ ایک دن اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی پیٹ میں شدید درد اٹھا، ناصر آفس جا چکے تھے چونکہ میں گھر پر اکیلی تھی میں ناصر کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے بچو کون کیا اور اپنی حالت بتائی بچو بولی کے میں تمہارے گھر آئی ہو تو جس سے کافی آرام آیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے۔

وہاں سے بچو مجھے اپنے گھر لے گئی اور ناصر کو بھی آفس سے وہیں آنے کو کہا۔

ناصر آئے تو بچو بولی کہ آج یہیں رک جاؤ کل ٹیسٹ کروا کہ اپنے گھر چلی جانا میں اور ناصر بچو اور قاسم بھائی کے بہت شکر گزار ہوئے۔

ہم وہیں تھے اور رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو قاسم بھائی خوش مزاجی سے کھڑے ہوئے اور بچو کو بولے کہ آج رات کی چائے میں خود تم سب کے لیے بناؤں گا کیونکہ تم سب تھک گئے ہو، کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا سب نے فوراً حامی بھر لی ، پھر بھائی چائے لائے اور سب کو دی سوائے میرے وہ بولے کہ تمہارا کپ کچن میں رہ گیا ہے مجھے حیرت ہوئی مگر میں نے سر جھٹک دیا، اور زیادہ پروا دہ نہیں کی ، چائے پیتے ہی سب کو نیند نے آلیا اور سب فوراً ہی

سو نے چلے گئے میں بھی لیٹ گئی بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے فوراً آنکھ لگ گئی۔

ابھی مجھے سوئے ہوئے کچھ دیر ہی گزری ہوگی کہ مجھے اپنے سینے پر کسی کا ہاتھ ریختا ہوا محسوس ہوا ، آنکھ کھلی تو بھیا تک منظر میرا منتظر تھا سامنے قاسم بھائی مکروہ چہرہ اور مکروہ ہنسی لیے کھڑے تھے، پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا، مجھے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں ، مگر بد قسمتی سے یہ کوئی خواب نہیں تھا زندگی بردا غ لگا دینے والی سچائی تھی، میں نے انہیں پرے دھکیلا جا پا مگر اس مکار شخص کی گرفت مضبوط تھی اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا میں چارو ناچار زور زور سے اپنے ہاتھوں سے بیڈ ہلانے لگی کہ ناصر اٹھ جائیں مگر اس مکروہ شخص نے سبکو نیند کی گولیاں کھلا دیں تھیں جس کی وجہ سے سب بے خبر سو رہے تھے۔

”مجھے تو شروع سے تم پسند نہیں ایلا، تمہاری بجو میں وہ بات کہاں جو تم میں ہے۔“ وہ خبیث لہجے میں بولا، میں تو کب سے اس موقع کی تلاش میں تھا مگر تم کبھی میرے گھر رکنے نہیں آئی، آج موقع ملا تم سے دل کی بات کرنے کا، یہ فریبی شخص جب یہ سب باتیں کر رہا تھا تو تھوڑی اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور میں نے پوری طاقت لگا کر اسے نیچے گرا دیا، اور زور زور سے چلانے لگی ناصر تو نا اٹھے مکروہ ڈر کر کمرے سے بھاگ گیا میں نے فوراً کمرہ لاک کر دیا، کیونکہ اس وقت سب کو اٹھانا بے سود تھا سب نیند کی گولیوں کے زیر اثر تھے، وہ شخص اپنے ناپاک ارادوں میں تو کامیاب نا ہو سکا مگر کتنے ہی رشتوں کو بگاڑ کر چلا گیا۔

رات بہت لمبی ہو گئی تھی، میرے دل کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا جیسے زمین پر کانٹے آگ آئیں ہوں، صبح ہوئی میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر اس مکروہ شخص کا اصلی روپ دنیا کو دکھا دوں مگر بچو کا چہرہ سامنے آ جاتا تھا لیکن اگر آج

تھا مگر پھر بھی ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔

”پوچھو اپنی اس بہن سے رات میں تم سب سوئے تو یہ خود میرے پاس آئی۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ناصر نے ایک بار پھر اسے مارنا شروع کر دیا بجو پھر جھپٹی۔

خدا کے لیے بند کرو یہ تماشا، ناصر پلیز انیلا کو لے کہ ابھی اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے، شاید وہ اپنے شوہر کی اصلیت پہلے سے جانتی تھی اس لیے نظریں چرا رہی تھی۔“ میں اور ناصر اسی وقت مسکان کو لیے وہاں سے گھرا گئے۔

اس کے بعد کئی بار یہ تماشا لگا کبھی والدہ کے سامنے کبھی بھائیوں کے سامنے مجرم نا ہوتے ہوئے بھی مجھے کٹھرے میں کھڑا کیا گیا۔  
”تم کیا کر رہی تھیں۔“  
”ناصر کہاں تھا۔“

”بجو کہاں تھی۔“ یہ وہ سوال تھے جو بار بار دہرا کر مجھ پر انگلی اٹھائی گئی اور اٹھانے والے کوئی غیر نہیں میرے اپنے تھے، بہن ناراض ہو گئی کہ میرے شوہر پر ڈورے ڈالے اور بہکایا، ماں ناراض ہو گئی کہ بہنوئی کا پردہ نہیں رکھا۔  
”سب کو بتایا چھپایا کیوں نہیں۔“

خدا کا شکر ہے کہ میرے شوہر نے مجھ پر نا صرف بھروسہ کیا بلکہ اعتماد بخشا اپنوں کی بے اعتنائی پر مجھے حوصلہ دیا، اس واقعے کو کتنے سال بیت گئے مگر اس کے بھدے رنگ جوں کے توں قائم ہیں۔

افسوس اپنوں کی کج ادائی کا ہے کہ الٹا مجھ سے ہی تمام رشتے توڑ دیے وہ رشتے جو کہ زندگی کا تحفہ ہوتے ہیں، جھین بضرور ہے لیکن میرا دل مطمئن ہے کہ میں غلط نہیں تھی کبھی نا کبھی والدہ اور بہن کو احساس ضرور ہوگا یہ سوچ کر میں نے اپنا فیصلہ سب سے بڑی عدالت پر چھوڑ دیا ہے۔



جب ہو گئی تو اس شخص کا حوصلہ اور بڑھ جائے گا اسی تلے میں نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس سنگین حقیقت کو عیاں کرنے کا ٹھان لیا۔  
میں نے ناصر کو بتایا تو ناصر کا تو دماغ ہی بھک سے اڑ گیا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم حواسوں میں ہو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی تمہیں۔“

اس شخص نے اپنا امیج اتنا اچھا بنایا ہوا تھا کہ میرے شوہر کو اس بات کا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔  
”ہاں یہ سچ ہے نا چاہتے ہوئے بھی میری آواز کیپکا گئی اور لہجہ بھرا گیا۔“ تو ناصر نے مجھے سینے سے لگالیا۔

میں اسے چھوڑوں گا نہیں بد ذات کہیں کا، وہ مجھے چھوڑ کر کمرے سے نکلے اور بجو کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

بجو نیند میں آنکھیں مسلتی باہر نکلی۔  
”کیا ہوا ناصر نہائی خیریت تو ہے انیلا کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ بجو نے پریشانی سے استفسار کیا۔  
”کچھ ٹھیک نہیں ہے آپ اس مکار شخص کو باہر نکالے۔“ ناصر نے چیخ کر کہا اب کی بار بجو چونکی اور بات کی سنگینی کا احساس ہوا۔

”کیا ہو گیا ناصر بھائی کیا بات ہو گئی ہے۔“  
ابھی وہ یہ پوچھ ہی رہیں تھی کہ وہ مکار کمرے کے اندر سے نمودار ہوا۔

”کیا ہے بے میرے گھر میں کھڑا مجھ پہ چلا رہا ہے، مجھ پہ کوئی الزام لگانے سے پہلے اپنی بیوی سے پوچھ۔“

یہ سننا تھا کہ ناصر اس پر جھپٹ پڑے اور مارنا شروع کر دیا، ارے مجھے بھی تو بتاؤ کیا ہوا ہے بجو اپنے شوہر کو چھڑاتے ہوئے چلا چلا کر پوچھ رہی تھی اور میں، میرے تو ہاتھ پیروں میں جان نا رہی تھی، بجو نے مشکل سے اسے چھڑایا جو ہولہان ہو گیا

# دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ونر لسٹ 2018ء

|    |        |                      |                        |
|----|--------|----------------------|------------------------|
| 1  | جنوری  | دیوار کا پھول        | حاجرہ ریحان            |
| "  | جنوری  | واپسی                | غزالہ عزیز (اُم ایمان) |
| 2  | فروری  | تجدید ایمان ضروری ہے | عقیلہ حق               |
| 3  | مارچ   | دلخراش گھونٹ         | نگہت سیما              |
| 4  | اپریل  | دھوپ چھاؤں           | آسیہ بنت عبد اللہ      |
| 5  | مئی    | سراغ جادہ            | تسنیم منیر علوی        |
| 6  | جون    | مضبوط ڈھال           | تحسین انجم انصاری      |
| 7  | جولائی | غوطہ کی ابابلیں      | زرافشاں فرحین          |
| 8  | اگست   | نیون سائن            | سید علی ارسلان         |
| 9  | ستمبر  | پرسونا               | حاجرہ ریحان            |
| 10 | اکتوبر | ناسور                | فائزہ مشتاق            |
| 11 | نومبر  | نمکین پانی           | غزالہ فرخ              |
| "  | نومبر  | لیزی ڈیزی            | تسنیم منیر علوی        |
| 12 | دسمبر  | میں ہاری ستیاں       | سعدیہ سیٹھی            |

# رمز ہاجر و وصل

(دوسری قسط)

~~~~~

محبت اب اور نہیں کہنے والا شخص زندگی کے ایسے موڑ پر آ جاتا ہے جہاں اُسے کہنا پڑتا ہے کہ ایک محبت اور سہی۔ ایسی محبت جس نے اُسے رجز و صل کی لذت سے آشنا کیا۔ جس کے وصل نے سمجھایا محبت میں ضد، اُنا، بغاوت نہیں ہوتی۔ محبت بس محبت ہوتی ہے شرطوں کی قید سے آزاد.....

~~~~~

ایک کر کے چیزوں کو سمیٹنے لگی۔

”کب تک بھوکی رہو گی؟ ہونا تو وہی ہے جو ماموں ممائی اور تمہارے بھائی چاہتے ہیں۔ پھر ضد بازی کیوں؟“ رومیہ نے کہا تو عنایہ نے جن نظروں سے دیکھا رومیہ کو جھر جھری آ گئی۔ وہ ناشتہ چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

عنایہ نے دراز سے پین نکالا۔ رجسٹر کا صفحہ پھاڑ کر اُس پر کچھ لکھنے کے لیے جھک گئی۔

☆.....☆.....☆

”صبح سے کمرے میں بند ہو۔ چلو باہر آؤ۔ سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاؤ۔ پھر تو تمہیں چلے ہی جانا ہے۔“ شبیر کی بیوی اقصیٰ آئی تو کمرے کی حالت دیکھ کر تاسف سے عنایہ کو دیکھنے لگی۔ کمرہ گزشتہ رات سے بے ترتیب تھا۔ اُس سے پہلے الوپیہ، شزاء، نبیلہ، رومیہ سب کھانے کا کہہ کر جا چکی تھیں مگر وہ اُس سے مس نہ ہوئی۔

”یہ سب کیا ہے؟ کیا حالت بنائی ہے کمرے کی؟ کس بات کا سوگ منا رہی ہو۔ تمہارے بھائی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گے۔“ وہ چڑ گئی۔ ایک

”کمرے کی حالت کا اندازہ ہے میرے دل پر کیا گزر رہی ہے کسی کو احساس نہیں۔“ وہ سوچ ہی سکی۔

”اب بولتی نہیں۔“ اقصیٰ بد زبان قسم کی عورت تھی۔ شبیر کی طرح وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھ جاتی تھی۔ عنایہ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

”ہنہ۔ اللہ جانے آج کل کی لڑکیاں یونیورسٹی پڑھنے جاتی ہیں یا بڑھوٹے۔“

”میرے بھائی کو لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اتنی اچھی اچھی لڑکیوں کے رشتے آ رہے ہیں۔ امی نے خالہ جانی کو زبان دی تھی بھی تم سے شادی کروا رہی ہیں ورنہ تم جیسی۔ ہنہ۔ کان یونیورسٹی پڑھائی کے بہانے عشق معشوقی کی ٹینکٹیں جھولنے جاتی ہیں۔“ جلی کٹی باتیں سناتے سناتے کمرہ سمیٹ دیا۔

عنایہ نے ضبط سے آنکھیں بند کر لیں۔

”ہمت تو دیکھو کیسے دندنا تا آ گیا صبح۔ اچھا ہوا تمہارا بھائی سویا ہوا تھا ورنہ ٹانگیں توڑ دیتا اُس



کی۔“ ناشتے کی ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ناشتہ جوں کا توں ہی پڑا تھا۔

”یہ جو عشق کا بھوت ہوتا ہے نہ شادی سے پہلے نچاتا ہے۔ بعد میں بیوی کو شوہر کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے۔ عشق و شوق سب نکل جاتا ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔ سیدھی طرح آ جاؤ باہر۔ خچرے دکھانے کی ضرورت نہیں۔“ عنایہ کی خاموشی افسی کے لیے حیران کن تھی۔ غلط بات وہ برداشت نہیں کرتی تھی۔ افسی کی بدزبانی اور منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے عنایہ کی اُس سے کبھی نہیں بنی۔ حالانکہ دونوں خالہ زاد تھیں۔ وہ اکثر سوچتی شبیر بھائی کو اس میں کیا نظر آیا جو مر مٹے۔ حیران تو وہ والدین کے رضا مند ہونے پر بھی تھی جنہوں نے شبیر بھائی کی شادی افسی جیسی تیز طرار و بے لحاظ لڑکی سے کر دی۔ جو بولتی پہلے بھی سوچتی بعد میں۔ عنایہ کی مسلسل چپ نے اُس کو مزید تپا دیا۔ وہ پیر بیٹھتے وہاں سے چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی عنایہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگ گئی۔ اُسے کرنے کے لیے یہی کام بچا تھا۔

رات ہوتے ہی عنایہ کا دل مزید دکھی و بدگمان ہو گیا۔ پروفیسر ماجد اور نکین میں سے کوئی اُسے پوچھنے تک نہ آیا۔ کسی نے خبر نہ لی بیٹی کس حال میں ہے۔ ایک نظر دیکھ لیتے تو شاید اپنا فیصلہ بدل دیتے۔ مگر!! اس مگر کے بعد ایک گہری چپ تھی، خاموشی تھی، جامد سناٹا تھا جو رگ و پے میں اتر کر اُسے گھائل کر رہا تھا۔

”عنایہ۔“ الوینہ نے اُس کا حال دیکھا تو تڑپ گئی۔

”زندگی کو زندہ ولی سے جینے والی، زندگی سے پیار کرنیوالی لڑکی۔ خود پر اتنا ظلم مت کرو۔ مت اذیت دوائے آپ کو۔“ عنایہ کا ہاتھ پکڑ کر چوما۔

”میں ظلم کر رہی ہوں؟ میں اذیت دے رہی

ہوں؟ ظلم تو یہ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔ کتنی چالاکی سے ماما پاپا نے ہال ہاشم کے کورٹ پر پھینکی۔ کتنی ہوشیاری سے سارا کام کیا کہ میں بھی ہاشم کے پاؤں سے بدن گئی جبکہ میرے اپنے۔ میرے۔ میرے ماما پاپا اُن لوگوں میں سے ہیں جو۔ جو زبان سے پھرنے کو تو بہن سمجھتے ہیں۔ جان جائے زبان نہ جائے۔ کوئی فرق نہیں ہاشم کے پاپا اور میرے ماما پاپا میں۔ ذرا بھی فرق نہیں۔“ الوینہ کے ہاتھوں پر ماتھ رکھ کر وہ رو پڑی۔

”میرے ساتھ اچھا نہیں ہو رہا۔ یہ زیادتی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ ماما پاپا کے رویے نے میری روح کو گھائل کر دیا ہے۔ جانتی ہو کل سے اب تک ایک بار بھی میرا حال پوچھنے نہیں آئے۔ یہ نہیں سوچا ایک بار جا کر دیکھ لیں کہ کس حال میں ہے اُن کی بیٹی۔ اُن کو کوئی پروا نہیں۔ کتنا اذیت ناک رویہ ہے اُن کا۔ تکلیف دہ۔“ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ الوینہ کا دل بھر گیا۔

”کاش میں کچھ کر سکتی۔ میں نے مام ڈیڈ سے بات کی تھی عنایہ۔“ اُس نے پُر امید ہو کر الوینہ کو دیکھا تو اُس نے نظریں جھکا لیں۔

”انہوں نے صاف منع کر دیا کہ وہ چاچی جان سے ہرگز بات نہیں کریں گی۔ اُن کا ماننا ہے کہ والدین اولاد کا برا نہیں سوچتے۔“

”پہنہ۔ برا نہیں سوچتے۔ وہ یہ نہیں جانتے مرنے پسند سا بھی نہ ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ زندگی گزارا عذاب لگتا ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے ہی کرنا ہے جو بھی کرنا ہے۔“ الوینہ نے نا سنجی کے انداز میں دیکھا۔

”کیا کرو گی تم؟“ وہ ڈر گئی۔

”فکر نہ کرو۔ بھاگوں گی نہیں۔ ہاشم بھگانے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ بھگانے والوں میں

سے ہوتا تو میں کب کی عنایہ ہاشم بن چکی ہوتی۔“

”پھر“ وہ ناچاہتے ہوئے بھی ہم گئی۔

”کچھ نہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ تم جاؤ سو

جاؤ۔ مجھے بھی سونا ہے۔ بہت نیند آرہی ہے۔“  
الوینہ چپ چاپ چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

نئی صبح، کھلا کھلا موسم، سرسبز و شاداب منظر۔ سب کچھ ویسا تھا پھر بھی کچھ نیا نیا تھا۔ صبح گھر میں رونق لگ گئی۔ قریبی رشتے داروں کی آمد شروع ہو گئی۔ رومیہ کی بہنیں اور بھانجیاں آ گئیں۔ پروفیسر ماجد کی بہن اپنی بچیوں سمیت آ گئیں۔ رومیہ، انصی اور نبیلہ سب کے لیے ناشتے کا بندوبست کرنے لگیں۔ الوینہ اور شہزادہ ہم عمر کزنز کے ساتھ کپڑوں اور جیولری کی میچنگ میں لگ گئیں۔

”ارے بھئی عنایہ کہاں غائب ہے۔ نظر نہیں آ رہی۔“ ناشتہ کرتے ہوئے رومیہ کی والدہ نے کہا۔  
”اپنے کمرے میں ہوگی۔ کچن میں ہوتی تو ملنے ضرور آتی۔“ رومیہ کی بہن شمسہ ادھر ادھر دیکھتے بولی۔

”گلتا ہے اعتکاف پر بیٹھ گئی ہے۔ شام کو ہی سامنے آئے گی۔“ سدرہ نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔  
”میں ذرا مل کر آئی۔“ شمسہ نے کہا تو سدرہ اور اقراء بھی پیروی میں چل پڑیں۔

دروازہ بجا بجا کر تھک گئیں عنایہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سورہی ہوگی۔ بعد میں مل لینا۔“ ساتھ والے کمرے سے زیریں کی بیوی مصباح نکلتے ہوئے بولی۔  
رومیہ ناشتے کی ٹرے لے کر عنایہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ وہ بھی دروازہ کھٹکھٹا کر تھک گئی مگر عنایہ نے جواب نہ دیا۔

”عنایہ دروازہ کھولو۔ عنایہ۔ عنایہ۔ عنایہ دروازہ

کھولو پلیز۔ اللہ کے کے لیے ایک بار کھول دو۔ تھوڑا سا تو کھالو۔ پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ عنایہ۔ پلیز۔“ رومیہ نے منت کی۔

عنایہ نے جیسے دروازہ کھولا وہ فوراً اندر داخل ہوئی مبادا وہ دوبارہ بند نہ کر دے۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوچ سوچ چکی تھیں۔ آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”ناشتہ کرلو۔ تمہاری پسند کا کچھ دار پر اٹھا بنایا ہے نبیلہ باجی نے۔“ نوالہ اُس کے منہ کے پاس لیجاتے بولی۔

”بھوک نہیں ہے۔“ عنایہ نے اُس کا ہاتھ پیچھے کر دیا۔

”چہ۔ کب تک۔ آخر کب تک۔“ نوالہ پلیٹ میں رکھ کر بولی۔

”جب تک سانس ہے۔“

”زندگی سانس سے مشروط ہے اور زندہ رہنے کے لیے کھانا پڑتا ہے۔ بھوکے رہ کر جنگ نہیں لڑی جاسکتی۔“

”جنگ کس احمق کو لڑنی ہے اور جینے کا شوق کس کو ہے۔“ رومیہ نے اُبھی نگاہوں سے دیکھا جیسے بات کا مطلب جاننا چاہ رہی ہو۔

”میں اتنا جانتی ہوں دونوں صورتوں میں جیت میری ہے صرف میری۔“

رومیہ ناشتے کی ٹرے وہیں چھوڑ کر کمرے سے چلی گئی۔ اُس کا دل عجیب سا ہو گیا۔ عنایہ کی ضد، اُس کی باتیں، اُس کا لہجہ، اُس کا باغیانہ انداز بتا رہا تھا کہ کچھ غلط ہو نیوالا ہے، بہت غلط، بہت برا۔

☆.....☆.....☆

”احسن، احسن اُنھیں۔ اوہو احسن اُنھیں مجھے بات کرنی ہے آپ سے۔“ رومیہ بھاگی بھاگی کمرے میں آئی۔

”کیا بات ہے“ سونے دو تھوڑا سا سارا دن

”آپ کیا کر لیں جان کر۔“ جوش دلانے کے لیے پچا رنگی سے جواب دیا۔ حالانکہ آنکھیں نکام کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے دماغ نے فوراً کام کیا۔ پریٹیکل کی کاپی اُس کے آگے کر دی۔

”پریٹیکل کی کاپی ہے۔“  
 ”ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں۔ مگر مجھے کیوں دے رہی ہو۔“ وہ ناچھی کے انداز میں بولا۔ سمجھ وہ چکا تھا کہ عنایہ چاہتی کیا ہے۔

”میرے اچھے بھائی، میرے پیارے بھائی مجھے میم سے مار پڑے گی۔ ڈائنگ رومز بنا دو نہ۔“  
 ”خود کیوں نہیں بنا رہی۔“

”آج پاکستان بنگلہ دیش کا میچ ہے۔ مجھے دیکھنا ہے۔ شروع ہو نیوالا ہے۔ بنا دو نہ اچھے بھائی۔“  
 اٹھلاتے ہوئے بولی تو احسن کو ہاں کرنا پڑی۔ جس لاتی رومیہ ہنس پڑی۔ ”میچ کی دیوانی۔“ جاتے جاتے رومیہ کا یہ جملہ اُسے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ منظر بدلا!!

”بھائی مجھے بات کرنی ہے۔“ احسن سمجھ نہ پایا وہ پریشان ہے یا ایکٹنگ کر رہی ہے۔  
 ”پہلے بھی اجازت لینے کی ضرورت پڑی کیا۔“  
 وہ شرمندہ ہو گئی۔

”بھائی مجھے ابھی شادی وادی نہیں کرنی۔ ابھی تو ایگز امر دیے ہیں۔ مجھے آگے پڑھنا ہے۔ ایم بی اے کرنا ہے۔ ممامیری ایک نہیں سن رہیں۔“ بغیر تاخیر وہ اصل مدے پر آئی۔

”اچھا تو جیسا میری بیٹی کہے۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں مما پاپا سے بات کروں گا۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا۔

”یہ بھی کہہ دیجئے گا مگنی نکاح کچھ بھی نہیں۔ مجھے توجہ سے پڑھنا ہے۔ مگنی یا نکاح کے بعد پڑھائی

میں کہاں دل لگتا ہے۔“  
 ”اچھا جناب! کیا بات ہے۔ تمہیں بہت تجربہ ہے۔“

”کہاں بھائی۔ رومیہ بھابھی کی مثال لے لیں۔ میٹرک کیا نہیں ڈلہن بن کر نازل ہو گئیں بلکہ ہماری ممانے نازل کیا زبردستی۔ حالانکہ بھابھی پڑھنا چاہتی تھیں۔“ رومیہ کو دیکھ کر پل بھر کو احسن کا رنگ بدلا۔

”عنایہ۔ بیٹا لفظوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“

”کیا غلط کہا عنایہ نے۔ صحیح تو کہہ رہی ہے۔ آپ تھرڈ ایئر میں تھیں ہمارے شادی ہوئی۔ میں نے تو میٹرک کی چھٹیاں بھی انجوائے نہیں کی تھیں۔“ رومیہ ہنسنے ہوئے بولی تو احسن کا دل ہلکا ہوا۔ اُسے لگا رومیہ کو عنایہ کی بات بری نہ لگی ہو۔

”ہم ایجوکیٹڈ فیملی سے ضرور ہیں لیکن سوچ۔ سوچ وہی کہ کم عمری میں شادی بہتر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہر کسی کا اپنا نظریہ ہے کیا کہہ سکتے ہیں۔ مما کا نقطہ نظر بھی کوئی نہیں بدل سکتا۔ پاپا نہیں بدل سکے تو ہم کیا چیز ہیں۔“

”ہم کوئی چیز نہیں اولاد ہیں بھائی۔ رہی بات پاپا کی۔ وہ تو خود بدل گئے ہیں اُن کے ساتھ رہتے رہتے۔“ عنایہ کے تلخ حقیقت بیان کی۔

”تم جاؤ۔ میں بات کر لوں گا۔ بدگمان مت ہوا کرو۔ پیرئیس ہیں ہمارے۔“ احسن نے مزید بات کرنے سے منع کیا۔

”آج ہی کرنی ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔

”عنایہ مسکرا اٹھیں اور رونقیں لے کر آتی ہے۔ جب جاتی ہے تو ہمارا کمرہ پران کر جاتی ہے۔ احسن جب اس کی شادی ہوگی تو گھر ہی ویران ہو جائے



مزید نکھار رہی تھیں۔ سب مکمل تھا۔ پرنیٹ۔  
بھائیوں نے کسی چیز کی کسر نہ چھوری تھی۔ کسی چیز کی  
کمی نہ ہونے دی تھی!!

”افسوس! ذرا آپ کو فون ملا کر پتہ کر دیا کہیں رہ گئے  
یہ لوگ۔ ساڑھے آٹھ ہو گئے ہیں۔“ نکمین ماجد  
ساڑھی سنبھالتے ہوئے بولیں۔  
”کامران کو کال کی تھی اُس نے نمبر بڑی کر  
دیا۔ لگتا ہے راستے میں ہیں۔“ سیلفی لیتے لیتے  
جواب آیا۔

”شراء بیٹا جا کر دیکھو عنایہ تیار ہوئی۔“  
”بڑی مہم میں اپنی فرینڈ کا ویٹ (انتظار) کر  
رہی ہوں۔ آپ کسی اور کو کہہ دیں پلیز۔“ نکمین کو  
پیار کر کے لاڈ سے کہا۔ نظریں گیٹ کی جا تھیں۔  
”اچھا اچھا۔ مسکانہ لگاؤ۔ میک آپ خراب ہو  
جائے گا۔“

”آپ کا کیا میرا۔“ شراء نے چھیڑا۔  
”دونوں کا۔ اچھا انتظار کرو۔“

”رومیہ کہاں غائب ہو۔ جا کر عنایہ کو دیکھو  
تیار ہوئی کہ نہیں۔ میں جب تک تمہارے خالو کو لے  
آؤں۔“ جاتے جاتے رومیہ کو حکم صادر کیا۔ وہ جی  
اچھا ہی کہہ سکی۔ کیا کہتی پچھلے دو گھنٹوں سے دروازہ  
پیٹ رہی ہے وہ کھول کر نہیں دے رہی۔

”اریا آپ اب تک یہیں ہیں۔ وہ لوگ راستے  
میں ہیں کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔“ ویل چیئر  
پکڑتے ہوئے بولیں۔

”ویل گھبرا رہا تھا سوچا تھوڑی دیر تنہا بیٹھ جاؤں  
شاید طبیعت بہتر ہو جائے۔“

”کمال کرتے ہیں ماجد۔ طبیعت تنہائی سے  
بہتر ہوتی ہے کیا۔ آپ بھی۔“ شیشے کے آگے بالوں  
کو سیٹ کرتے ہوئے بولیں۔

”چلیں۔“ ویل چیئر دروازے تک لیجاتے

گا۔ کیا کریں گے ہم؟ مجھے اُس کی عادت ہو چکی  
ہے۔ ایسا لگتا ہے میری اپنی بیٹی ہو۔“ رومیہ نے کہا  
تو احسن نے ہاتھ تھام کر ہاں میں ہاں ملائی۔

”بیٹی ہی ہے وہ۔ میری پیاری بیٹی۔“  
”کاش اللہ ہمیں بھی عنایہ جیسی پیاری بیٹی سے  
نوازدے۔“ رومیہ کا ادھر اپن زبان پر آ گیا۔  
”دے گا۔ ضرور دے گا۔ اُس کے ہاں دیر ہے  
اندھیر نہیں۔“ احسن سے اُسے ساتھ لگاتے ہوئے  
کہا۔

احسن نے اُس کی ہر بات پر لپیک کہا تھا۔ ہر  
خواہش پوری کرتا تھا۔ ہر ضد مانتا تھی۔ چھوٹی سے  
چھوٹی بات، چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ لے کر وہ احسن  
کے پاس جانی تھی جسے وہ منٹوں میں حل کر دیتا  
تھا۔ اُس کی شادی کو کافی سال ہو چکے تھے۔ اولاد کی  
نعمت سے محروم ہونے کے باوجود مایوس نہیں تھا۔  
عنایہ کو وہ بیٹھتا نہیں تھا سمجھتا بھی تھا۔ رومیہ اُس کی  
خالہ زاد بھی تھی اور بھابھی بھی۔ عنایہ سے سلوک میں  
فرق نہ رکھا بلکہ احسن کی خاطر اُس کی ہر ضرورت کا  
کہے بغیر خیال رکھتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہر سو خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ مسرتوں کا  
ساں تھا، قہقہے، مسکراہٹیں، چٹکے، باتیں، روشنیاں،  
رونقیں!! دیدہ زیب، رنگین و خوبصورت لباس میں  
ملبوس ادھر ادھر گھومتی پھرتی لڑکیاں فضا میں تیلیوں کی  
طرح رنگ و بو بکھیر رہی تھیں۔ پھولوں، فیومز اور  
میک اپ کی ملی جلی خوشبو سیما حول مہک رہا تھا، فضاء  
معطر ہو رہی تھی۔ چونکہ نکاح تھا اس لیے انتظام گھر  
کے لان میں ہی کیا گیا تھا جو روشنیوں سے جھلملارہا  
تھا۔ لان میں لگے چھوٹے بڑے پود پیرتی قفوں  
سے چمک رہے تھے۔ روشنی ہر چیز کو منور کر رہی تھی۔  
لائٹوں سے نکلنے والی روشنی دو شیزاؤں کے حسن کو

نہ کسی سے بحث کی نہ ضد اور نہ ہی ہمیشہ کی طرح احسن کے پاس گئی۔ بلکہ احسن کو رومیہ کے کہنے پر اُس کے پاس جانا پڑا تاکہ سمجھا سکے۔ نتیجہ صفر رہا۔ اب اُسے احساس ہوا کہ اِس معاملے کو ہلکا لے کر غلطی کی۔ اُس کا دِل انجانے اندیشے سے دھڑکنے لگا۔

”عنایہ خدا کے لیے ہماری بات سنو۔ احسن آئے ہیں۔ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“ اپنا نام سن کر وہ چونکا۔

”ہاں۔ ہاں ہاں۔ میں آیا ہوں۔“

”تم دونوں یہاں؟“ زبیر کمرے سے نکلا تو احسن کو روتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اُس نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔

”عنایہ دروازہ نہیں کھول رہی۔“

”پریشان ہو نیوالی کوئی بات ہے۔ تیار ہو رہی ہو گی وقت لگتا ہے تیاری میں۔“ بٹن بند کرتے ہوئے بے فکری سے بولا۔

”زبیر بھائی ہم پچھلے دو گھنٹوں سے کوشش کر رہے ہیں وہ نہیں کھول رہی۔ اندر کوئی نہیں اُس کے ساتھ جو تیاری میں مدد دے۔“ رومیہ نے کہا

تھوڑی دیر میں مصباح، کلین، نبیلہ، الوینہ وہاں موجود تھیں۔ سب نے کوشش کی دروازہ نہ کھلا۔

”عنایہ دروازہ کھولو۔ ڈرامہ مت کرو۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ کیوں تماشا بنوانے پر تلی ہوئی ہو۔“ کلین ماجد نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا تو پروفیسر ماجد سمیت رومیہ اور احسن نے ملاقاتی نظروں سے اُسے دیکھا جسے بیٹی کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ اب بھی عزت کی پروا تھی، لوگوں کا خیال تھا۔

”مجھے لگتا ہے لاک توڑنا ہوگا۔“ الوینہ نے بالوں کو میٹتے ہوئے کہا۔

”دماغ خراب کر دیا ہے اِس لڑکی نے۔ بے

ہوئے پروفیسر ماجد نے کہا۔ وہ بالوں کی لٹ میں کرم ڈال کر باہر کی جانب چل دیں۔

”بات سنیں۔“ مشکل سے احسن کو ڈھونڈ کر سائیڈ پر لگئی۔

”عنایہ دروازہ نہیں کھول رہی۔ میں کھٹکھٹا کر تھک گئی ہوں۔ مصباح اور نبیلہ باجی نے بھی کوشش کی مگر جواب نہیں دے رہی۔ مم مجھے لگتا ہے کچھ ہو نیوالا ہے۔ میرا دِل بیٹھ رہا ہے۔“ احسن کا رنگ مزید پیلا پڑ گیا۔ صبح سے اُس کا دِل بھی عجیب ہو رہا تھا۔ وسوسوں کا ناگ بار بار ڈس رہا تھا۔

”کیا اول فول بول رہی ہو میا۔ میرا دِل بھی ہولا رہی ہو۔“ وہ تیزی سے عنایہ کے کمرے کی طرف بھاگا۔

باہر کھڑے ہمت مجتمع کرتے ہوئے لمبا سانس لیا اور دروازہ بجایا۔

”عنایہ۔ عنایہ۔ عنایہ دروازہ کھولو بیٹا۔“ جواب نہ دارا!

”عنایہ میرے بیٹے ایک بار دروازہ کھول دو۔ دیکھو تمہارا بھائی آیا ہے۔ ضد چھوڑ دو گر گیا۔ اچھا سنو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری مرضی کیخلاف کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ مم میں کھڑا ہوں گا تمہارے ساتھ۔ کھول دو دروازہ بیٹے۔“ سرد دروازے پر رکھی گڈ گڑاتے ہوئے وہ رونے کے قریب تھا۔

عنایہ سب سے زیادہ اُسی کے قریب تھی۔ کوئی بات منوالی ہوتی یا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا وہ احسن کے پاس جاتی تھی۔ منٹوں میں اُس کا مسئلہ حل کر کے اُس کے ہونٹوں پر تبسم بکھیر دیتا۔

”میرے ہوتے ہوئے پریشان مت ہوا کرو میرے بیٹے۔“ اُس کے سر پر ہاتھ رکھے وہ ہمیشہ یہی جملہ کہتا اور وہ ہنستے ہوئے اُس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر پرسکون ہو جاتی تھی۔ اِس معاملے پر اُس نے

خوشبوؤں کو موت نے ایک پل میں نگل لیا۔ ایک پل لگا موت کو صرف ایک پل!

رومیہ نے احسن کو دیکھا جس کا سر دروازے کی چوکھٹ پر تھا۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رومیہ اُس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر الفاظ ترتیب دینے لگی۔ کچھ کہنے کے لیے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

”احسن۔ احسن۔“ اُس کو جھنجھوڑتے ہوئے وہ چیخی۔ زیر بھاگ کر احسن کے پاس گیا۔ نبض چیک کی اور سر دیوار کے ساتھ ٹکا کر رونے لگ گیا۔

”ماموں ممانی یہ بول نہیں رہے۔ احسن اُنھیں۔ زیر بھائی یہ۔ یہ بولتے کیوں نہیں۔“ زیر کا رونا اس بات کی گواہی تھا یہ زندگی کی دوڑ ٹوٹ چکی ہے۔ عنایہ کی موت کا صدمہ ایک اور زندگی نگل گیا۔ ”نن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ عنایہ تم کہو اپنے بھائی کو ایسا مت کریں۔ چلو تم بھی اُنھ جاؤ اب۔ تنگ نہیں کرو۔ اُنھ نہ بیٹا۔ دیکھو تمہارے بھائی بھی نہیں اُنھ رہے۔ میری گڑیا اٹھاؤ نہ احسن کو۔“ عنایہ کی لاش کو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ الوینہ نے اُس کو پکڑا۔ وہ بیہوش ہو کر اُس کی بازوؤں میں جھول گئی۔ نکمین ایک کونے پر کھڑی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے سب خواب ہو۔

”عنایہ نے خودکشی کر لی۔ توبہ توبہ حرام موت وہ کیوں بھلا۔“ کہیں سے آواز آئی۔

”لگتا ہے کسی کو پسند کرتی ہوگی۔ مرضی کے خلاف شادی کروا رہے ہوں گے گھر والے بھی جان دے دی۔ چہ۔“ ایک اور نے اپنا نقطہ نظر پیش کرنا ضروری سمجھا۔

”پڑھی لکھی فیملی ہے لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی کیوں کریں گے بھلا۔“ نا سمجھ عورت بولی۔

عزت کروانے پر تلی ہوئی ہے۔“ نکمین ماجد نے کہا۔ نبیلہ، الوینہ اور رومیہ نے تاسف سے دیکھا جن کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ فکر تھی تو عزت کی۔

”خالہ جان مہمان آ گئے ہیں۔ کتنا وقت لگے گا عنایہ کو تیاری میں۔“ انھی شرارہ سنبھالتے ہوئے بولی۔

”تم مہمانوں کے پاس جاؤ۔ ہم آتے ہیں اُس کو لے کر۔“ نبیلہ نے کہا۔ سب کی موجودگی انھی کو حیران کر رہی تھی۔ ایک عنایہ کو لینے کے لیے سب موجود تھے۔ سر کو ایک ادا سے جھٹک کر وہ باہر چلی گئی۔

زیر نے مشکل سے دروازے کا لاک توڑا۔ اندر کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ ایسا لگتا تھا سب کو سانپ سوگھ گیا ہے۔ کوئی کچھ بول سکا نہ داویلہ چاسکا۔ احسن اپنا سینہ سلاستیا نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کا رنگ خطرناک حد تک پیلا پڑ چکا تھا۔ رومیہ کو ہوش نہ رہی کہ احسن کی طرف توجہ نہ کرتی۔ وہ عنایہ کے بے جان وجود کو دیکھ کر سکتے میں تھی جسے زیر بازوؤں میں لیے بیٹھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی الوینہ نے چیخ ماری۔ خوشیوں و رعنائیوں سے بھرپور لڑکی مر چکی تھی۔ دم توڑتی حسرتیں، ادھوری خواہشیں، بکھرے خواب، بیکراں آہیں، گھٹی گھٹی سسکیاں سب سمیٹ کر لے گئی!!

رونے کی آوازیں سن کر سب اندر کی طرف بھاگے۔ پروفیسر ماجد ویل چیئر گھینٹے ہوئے اندر آئے۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر کرسی سے نیچے گر گئے۔ جیسے تیسے کر کے اُس تک پہنچے، اُس کا سراپنی نیم ٹوٹی ٹانگوں پر رکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر میں صُف ماتم بچھ گیا۔ خوشیوں، روشنیوں، قہقہوں، مسکراہٹوں اور

”اچھی خاصی ذی شعور، سمجھدار، ہنس مکھ اور گھلنے ملنے والی لڑکی تھی۔ خود تو مری۔ بھائی کو بھی مار گئی اور تو اور ماں باپ کی عزت کو سوالیہ نشان بنا دیا۔“ لوگ بغیر جانے کی چہ گوئیوں میں مصروف تھے۔

”چہ چہ۔ کیسے مٹی کے حوالے کرتا۔ بہن کو۔ بہت محبت کرتا تھا عنایہ سے۔ ایک پل کے لیے الگ نہیں رکھتا تھا خود سے۔ شادی کے بعد بھی عنایہ کی پر چھائی بنارہا۔“

”کس قدر بے حس ہیں۔ ہماری آہ و بکا، ہمارے آنسو، ہمارا دکھ دیکھ کر آپ کا دل نہیں تڑپ رہا؟ سارے نتائج یہیں اخذ کر لیں گے؟ کچھ بعد کے لیے رکھ چھوڑیں اور تماشا دیکھنے کی بجائے خدا را اپنے گھروں کا رخ کریں۔ جائیں چلے جائیں۔“ الوینہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ شزاء نے اسے گلے لگا لیا۔

اتم کا سماں تھا۔ چیخ و پکار!!

☆.....☆.....☆

”مرگئی پھولوں جیسی لڑکی۔ محبت کی خاطر جان کی بازی ہار گئی۔ میری خاطر میری محبت کی خاطر اپنا آپ مار ڈالا۔ مٹی کے ڈھیر تلے سکون کی نیند سوئی ہوئی ہے۔ طمانچہ مار دیا ذات پات ماننے والوں کے گال پر، بتا دیا زبان کا بھرم رکھنے والوں کو کہ محبت کر نیوالا ہر شخص ہلکا نہیں ہوتا۔ کچھ میں محبت کے جراثیم اس قدر پائے جاتے ہیں جن کو نکالنے کے چکر میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ آہ!! جراثیم حب ختم نہیں ہوتا انسان ختم ہو جاتا ہے۔“

”خودکشی کر کے سکون کی نیند سونا۔ ناممکن۔ ہر بل، ہر لمحے اُسے وہی موت بار بار دی جاتی ہے جس کا انتخاب اُس نے کیا ہوتا ہے۔ اُسے بار بار وہی تکلیف و اذیت دی جاتی ہے جس کا مزہ وہ دُنیا میں لے چکا ہوتا ہے۔“ ہاشم کے چہرے پر ناگواری کے

اثرات اُبھرے۔ چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے جیسے وہ فون سے دیکھنے سے رہی۔ اس لیے بولی جا رہی تھی۔

”مجھے دکھ ہے مگر خودکشی حرام ہے اور حرام موت مرنا مطلب آخرت تک وہی عذاب، وہی تکلیف، وہی اذیت مسلسل۔ بار بار۔ ہر بار!!۔“

”تمہارے لیے باتیں کرنا آسان ہے بہت آسان ہوتا ہے جزا و سزا کا بتانا۔ محبت کھودینے کا احساس وہی جان سکتا ہے جو شدت سے کسی کو چاہتا ہے۔ وہ مجھے بے پناہ چاہتی تھی، بے حد، بہت زیادہ۔ کسی اور کا ہونے کا تصور اُس کے لیے سواہن روح تھا۔ تم کیا جانو۔ تم نے کونسا محبت کی ہے۔“ مہرین اُس کے لہجے کی سختی اور تلخی محسوس کر سکتی تھی۔ اُس نے غصے سے فون کاٹ دیا۔ مہرین کتنی دیر موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹھی رہی کہ شاید کال یا میسج آجائے۔ مگر موبائل نے رات کے سنانے کی طرح خاموشی نہ توڑی۔

ناراضگی و غصے کی پر وہ وہاں کی جاتی ہے جہاں کسی کے لیے دل میں گوشہ محبت موجود ہو۔ اُس کے دل میں مہرین کے لیے نرم گوشہ تو موجود تھا مگر گوشہ خاص ہرگز نہیں جو معذرت کے لیے میسج یا فون کرتا۔ اُس کی نسبت عاصم کے ساتھ طے تھے اور کزن ہونے کے ناطے وہ اُس سے ہنس بول لیتا تھا۔ مگر اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے انوکھے، اُن کہے اور دل آواز رنگ دیکھ کر یہ سچ بتانا پڑتا کہ وہ جان سکے کہ اُس کی زندگی میں ایک محبت کی گنجائش تھی۔ اُس سے پہلے اُس کے بعد کوئی نہیں۔ سمجھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

بیٹھک نما کمرے میں سب موجود تھے۔ چوہدری وجاہت ایوب نے چائے کا کپ

سائینڈ ہر رکھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے چار بج رہی تھی۔

”ہاشم اور عاصم کہاں رہ گئے۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا انتظار کرتے۔“ اتنے میں دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

”خیریت پاپا۔ سب کو اکٹھا کیا۔ کوئی خاص بات۔“ عاصم نے پوچھا۔ ہاشم جانتا تھا یہ محفل بلا وجہ نہیں ہے۔

”بغیر تمہید کے اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ میں نے حفیظ سے مہرین کا ہاتھ مانگا تھا عاصم کے لیے۔ سوچا کیوں نہ باقاعدہ رشتہ ڈال دوں کیونکہ مہرین کے لیے اُس کی خالہ، ماموں اور تم لوگوں کی پھوپھی اصرار کر رہی ہیں۔ حفیظ چاہتا ہے باقاعدہ منگنی کی رسم کر لی جائے تاکہ سب کو پتہ چل جائے وہ عاصم کی امانت ہے۔“

”پاپا میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔ بار بار ایک ہی بات!“ ہاشم نے عاصم کا ہاتھ دبا کر نارٹل بننے کا اشارہ دیا۔

”پاپا شادی گڈا گڈی کا کھیل نہیں جو دو لوگوں کے کہنے پر کر دی جائے۔ زندگی میں نے گزارنی ہے۔ مجھے اپنے لیے پڑھی لکھی اور سمجھدار لائف پارٹنر چاہیے۔ مہرین کم عمر ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے مراحل میں ہے۔“

”شادی اُس کی تعلیم پوری ہونے کے بعد ہو گی۔“ انہوں نے تسلی دی۔

”پاپا مجھے وقت دیں سوچنے کے لیے۔ میں نے اُس کو کبھی اُس نظر سے نہیں دیکھا۔“ اُس نے پیچھا چھڑوانا چاہا۔

”ہادیہ کی شادی پر ایک ہفتے کے لیے آئے گی رُکنے۔ اچھی طرح پرکھ لینا اُس کو۔ شادی بہر حال اُسی سے ہوگی۔“ وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔

”واہ۔ کی گل اے تہا ڈی۔ اگر شادی اُسی سے کروانی ہے تو پرکھنے کا فائدہ؟ یہ سہولت کیونکر اگر میری مرضی کی وقعت نہیں۔“ عاصم چڑ گیا۔

”ٹھیک ہے پاپا۔ جیسا آپ کہیں۔ عاصم کافی وقت پڑا ہے سوچنے کے لیے۔“ ہاشم نے بد مزگی سے نیچنے کے لیے اُس کو کمرے سے باہر بھیجنا چاہا۔

”سوچ کر نہ سوچ کر بھی اُسی سے شادی کرنی ہے تو سوچ کر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ آئی ایم سوری پاپا۔ آپ کا یہ پہلا حکم ہے جو میں نہیں مان سکتا۔ زندگی مجھے گزارنی ہے۔ کس کے ساتھ گزارنی ہے وہ میں جانتا ہوں۔ انتخاب کر چکا ہوں۔“ عاصم نے صاف گوئی سے کہا۔ سب حیران پریشان اُس کو دیکھ رہے تھے۔

”ایک ہفتہ رُکنا ہے اُس نے۔“ چوہدری وجاہت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ نزہت بیگم نے سہارے لیے تھام لیا۔ وہ کمرے سے چلے گئے۔

عاصم بیہوش چھت پر چلا گیا۔ سگریٹ برسگریٹ پھونک رہا تھا جیسے سارا غبار سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اُڑا دینا چاہتا ہو۔

”ادو اتھتھے بیٹھا سگریٹ پھونکی جاندا ایں۔ کسی کو لکھ فرق نی پینا (تم یہاں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے ہو۔ کسی کو ذرا فرق نہیں پڑتا)۔“ ہاشم نے مزاح کا ماحول پیدا کرنا چاہا۔

”جانتا ہوں کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ یار اگر پڑھ لکھ کر بھی ذات بات کے گرد ہی گھومنا ہے تو کیا فائدہ عقل و شعور غی سیڑھیاں چڑھانے کا۔ بندہ جاہل بھلا جس کے ساتھ مرضی باندھ دیں۔“ وہ سخت خائف تھا۔

”یو آر فریکلی آل رائٹ عاصم۔ تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں۔ لیکن یار یہ جو ہمارے بڑے ہوتے ہیں نہ۔ اپنے بڑے ہونے کا فائدہ

اُٹھاتے ہیں۔ ماں باپ ہونے کا حق جتاتے ہیں۔ اولاد پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں زندگی کا شکھ دے رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر کیا کریں یار۔ بڑے ہیں ہمارے۔ اس طرح ری ایکشن دکھائیں گے تو بات خراب ہی ہوگی۔“ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”میں کسی اور میں انٹرنسٹڈ ہوں۔ کیسے مہرین کو زندگی کا ساتھی بنا لوں۔ پاپا حد کرتے ہیں۔“ سگریٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

”پاپا چاہتے ہیں رشتہ مضبوط ہو جائے اور کوئی وجہ نہیں۔“

”تو کریں رشتہ مضبوط و مستحکم۔ شوق سے کریں۔ مجھے کیوں قربان کر رہے ہیں۔ اور ویسے بھی خون خون سے الگ ہوا ہے کبھی جو خون کے رشتے کو ایک اور رشتے میں باندھ رہے ہیں۔ کمال ہے یار۔“ وہ ایکدم کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چلے۔“ ہاشم نے پوچھا۔  
”واش روم۔ چلو گیساتھ۔“ تنک کر جواب ملا تو ہاشم اپنی لمبی نہ ضبط کر سکا۔

☆.....☆.....☆

پورا گھر جگمگا رہا تھا۔ برقی قہقہوں نے در و دیوار کو لپیٹ رکھا تھا۔ ہر منظر روشن و شفاف تھا۔ اسٹیج پہلے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ آج ہادیہ کی مہندی تھی۔ انتظام محن میں کیا گیا تھا۔ مہرین ایک دن پہلے ہی اپنی والدہ اور بھابھی سمیت آجلی تھی۔ آدھے سے زیادہ کام اُس نے سمیٹ لیے تھے۔

ابھی بھی پہلے گرنا، سبز چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے وہ انتہا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سارہ جیسی گھنی لمبی پلکوں نے اُس کی خوبصورتی کو بڑھا دیا۔ سانولے رنگ پر ہلکے میک اپ نے اُس کے روپ کو چار چاند لگا دیے تھے۔ پہلے پراندے میں

باندھے گئے بالوں کی لٹیں اُڑ کر گالوں کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ اُس نے آج پہلی بار اُس کو غور سے دیکھا تھا۔ لمحے بھر کو دل بے ایمان ہوا۔ جیسے ہی مہرین کی نظر اُس پر پڑی اُس نے فوراً رخ موڑ لیا۔ مہرین کا دل دھڑکا۔ چہرے پر حیا کی لالی چھا گئی۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس وہ وجہ لگ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اُس کو دل میں اُترتا محسوس ہوا۔

”مہرین چلو رسم کر لو۔ بڑے کر چکے ہیں۔“ مہرین کی والدہ سرین نے کہا تو وہ چونک گئی۔

”جی چلیں امی۔“ وہ سرعت سے آگے بڑھ گئی۔ سارا وقت دوں گا ہوں کا احساس اُسے مسکرانے پر مجبور کر دیتا۔ ایک عجیب سا سرور، لطف، خوشی رگ و پے میں سرایت کر ہی تھی۔ اُسے ہاشم کی نظروں کے حصار میں رہنا اچھا لگ رہا تھا۔

کسی کی نظروں کے حصار میں ہیں

ہمارے چہرے پر رونق بلا کیسے!

آدھی رات مستیاں کرنے میں گزر گئی آدھی رات ہاشم کے تصور میں سوتے جا گئے۔ دل ایک پُر سرور لے پر جھوم رہا تھا۔ وہ اس کیفیت کو سمجھ نہ پائی۔ وہ اچھا لگتا تھا، اُس سے باتیں کرنا، اُس کے سچ اور کال کا انتظار کرنا۔ مگر اب جو ہو رہا تھا وہ نیا، انوکھا اور مسجور کن تھا۔ وہ اُس کی نظروں کی قید سے نکلنا چاہتی تھی نہ خود کو اُس کی سوچ سے آزاد کرنا چاہتی تھی۔

صبح روشن اور کھلی کھلی تھی۔ ہلکی ہلکی بوند باندی کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔ مہرین نے سنیچہ اور زہیرہ کے ساتھ مل کر سب کے لیے ناشتہ لگوا دیا۔ نان پائے اور حلوہ پوری بازار سے منگوا لی گئی تھی۔ مہرین نے چائے کا پانی رکھ دیا۔ پانی کا گلاس لے کر فریئر

کو دوا دینے لگی تو راستے میں ہاشم سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے بچا۔  
 ”اواللہ کی بندی دیکھ کہ چل لیا کر۔“ ہاشم نے کہا۔

”راستے میں آپ آئے اور الزام مجھے کیا یہ کھلا تضاد نہیں۔“ وہ شوخ ہوئی۔ اُس نے دیکھا ہنستے ہوئے وہ اور بھی اچھی لگتی تھی۔ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ مہرین دیکھتی رہ گئی کہ ایسا کیا غلط کہہ دیا۔  
 ”عجیب انسان ہیں۔ اپویں ای منہ بنالیا۔“ وہ ماں کو دوائی دینے کے لیے آگے بڑھ گئی۔

شام ہوتے ہی گھر میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ ہر کوئی وقت پر تیار ہونے کے چکر میں تھا۔ کسی کو کپڑے پر پیس کرنے تھے، کسی کو بالوں میں کرل ڈالنا تھا، کسی کو بال اسٹریٹ کروانے کے لیے اسٹریٹر چاہیے تھا تو کسی کو کپڑے پر پیس کرنے کے لیے استری۔ ہر کوئی مصروف تھا، ہر کسی کو اپنی پروا تھی۔

”جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔ آٹھ بجے ہر حال میرج ہال پہنچنا ہے۔ دس بجے کے بعد ایک منٹ بھی رُکنے نہیں دیں گے۔“ نزہت نے با آواز بلند کہا۔

ڈارک بلیو میکسی اُس پر پرچ رہی تھی۔ اُس کے اوپر سلور ستاروں سے کام ہوا تھا۔ جس کی چمک برقی قہقہوں کی روشنی کے ساتھ مل کر اُس کے چہرے پر پڑ کر اُس کے حسن کو مزید روشن کر رہی تھی۔ بالوں کو کھلا چھوڑ کر اُس پر فاصلے فاصلے سے موتیوں کی لالہ لگائی ہوئی تھی۔ کسی کام کے لیے کمرے میں آیا تھا۔ ایک پل کو پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عام نقوش والی لڑکی اس حد تک حسین بھی لگ سکتی ہے۔ وہ کھوس گیا۔ بظاہر نگاہیں مہرین پر تھیں مگر دماغ کہیں اور تھا۔

”یوں لگتا ہے یہ رنگ بنا ہی تمہارے لیے ہے۔“ نیوی بلیو گول دامن والی قمیض کے ساتھ ڈارک ریڈ پٹیللا شلوار پہنہ وہ بے حد کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ نیوی بلیو رنگ اُس کی سرخ و سفید رنگت کو مزید نکھار دیتا تھا۔

”اچھا!! نوازش!“ کندھوں تک آتے گولڈن بال ایک آواز سے جھٹکتے ہوئے بولی۔  
 ”ہماری شادی والے دن تم اسی کمر کا ڈریس پہننا۔“ اُس کی طرف جھٹکتے ہوئے بولا تو وہ شرماوی۔  
 ”ہاشم۔ بس بھی کرو۔“ اُس نے آنکھیں دکھائیں۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے چمک رہا تھا۔  
 ”کچھ چاہیے تھا بھائی؟“ زبیرہ کے پوچھنے پر وہ خیالات سے باہر آیا۔

”آں۔ ہاں سب باہر آ جاؤ۔ گاڑی آگئی ہے۔“ نظریں مہرین کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ خود میں سمٹ گئی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔ سب پرفیکٹ تھا۔  
 ”آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت۔ ہاشم کی نظروں میں اپنا آپ دکھائی نہیں دیا کیا۔“ مہرین کی بھابھی نے کہا۔ وہ چونک گئی۔

”چلیں کیا۔“ رانیہ کو دوسری بازو میں پکڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ خدیجہ کی پیروی میں باہر کی جانب چل دی۔

نا چاہتے ہوئے بھی بار بار ہاشم کی نظریں اُس کے گرد جھوم جاتیں۔ شکیل نے سب کی تصاویر بنائیں۔ ہاشم کے ساتھ تصویر بناتے مہرین کے چہرے پر انوکھے رنگ بکھر جاتے۔ محبت کے، چاہت کے، اپنائیت کے!! آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے وہ مجسمہ محبت لگ رہی تھی۔

رات کو سب تنکھے ہارے لوٹے تو چوہدری وجاہت نے چائے کی فرمائش کر دی۔

”مہر بیٹی۔ ایک کپ چائے بنا دو۔ و دیا جی ہووے۔“ وہ جی کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔  
 ”سات کپ چائے بنا دو۔“ موبائل میں نظریں جمائے وہ بچن میں داخل ہوا۔  
 ”جی اچھا۔“ مہرین کی آواز سن کر نظریں موبائل سے ہٹائیں۔

”سوری مجھے لگا زنیہ یا سنیہ ہوں گی۔“  
 ”اِس اوکے۔ میں بنا دیتی ہوں۔“ عاصم کی موجودگی اسے بد مزہ لگ گئی۔ وجہ کوئی بھی نہ تھی۔ اُسے لگتا تھا عاصم اُس کی فیملی سے دور رہتا ہے اور یہ سچ بھی تھا۔ جب سے وہ لوگ ملے تھے عاصم ایک بار بھی اُن کے گھر نہیں گیا تھا۔ بات چیت پکی ہو جانے کے بعد بھی اُس نے مہرین سے کوئی بات نہ کی جبکہ ہاشم کا مزاج دوستانہ تھا۔ اُسی دوستانہ مزاج اور خوش اخلاقی سے وہ اُس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی عاصم کو پسند نہ کر سکتی تھی۔ عاصم بھی لکسی اور میں انٹرنسٹڈ تھا۔ اُس نے نظر بھر اُسے دیکھا۔ وہ بے حد حسین نہ صبح البتہ خوبصورت تھی۔ چونکہ وہ انوشے کو پسند کرتا تھا اس لیے یہ معنی نہ رکھتا تھا مہرین خوبصورت ہے یا نہیں۔

”میں بیٹھک میں ہوں۔ آواز دے دینا۔ بلکہ میں خود لے جاؤں گا تھوڑی دیر تک آکے۔“ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ مہرین سوچتی رہ گئی کہ منگیت ہونے کے ناطے بے شک نظر بھر نہ دیکھتا مگر بندہ کزن ہونے کے ناطے تو بات چیت کر سکتا ہے۔  
 ”ہنہ۔ مینوں کی۔ نئی ویکھد اتے نہ ویکھے۔“  
 دل میں کہا۔

ڈیرہ بج گیا۔ نیند کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ کروٹ بدلتی رہی۔ ہاشم کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ جاتا تو بے اختیار مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھر جاتی۔ عاصم کچوالے سے دیکھتی تو دل مٹھی میں آ

جاتا۔

”ہاشم کی محبت کی جڑیں تناور درخت بن چکی ہیں اِس قدر گہرے پنچے گاڑھ لپے ہیں اِس درخت نے کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں اکھاڑ سکتی۔ عاصم۔ آہ نہیں عاصم کے بارے میں رتی برابر نہیں سوچ سکتی۔“ وہ سوچ ہی تھی۔ اپنی محبت کا تعین کر رہی تھی۔ آج اُسے عینا یہ کی محبت کا اندازہ ہوا۔ کس قدر ٹوٹ کر چاہتا تھا اُس نے ہاشم کو۔ اتنی شدت، اتنی چاہت، اتنا عشق کہ اپنی جان کی بازی لگا دی۔

”کیا محبت بے خود کر دیتی ہے؟ بیٹا نماز کروا کہ کچھ بھی کروا سکتی ہے؟ کیا محبت کے سحر میں عنایہ نے جان کی بازی ہار دی؟ نہیں نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ محبت پاک ہوتی ہے۔ یہ ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ بے لوث، مقدس، معطر، منور، پرسرور!! کسی کیسے جان لے سکتا ہے۔ ایمان کی گزوری ایسا کرنے پر اِکساہی ہے۔ شیطان وار کرتا ہے جس کی وجہ سانسان کمزور لمحوں کی زد میں آ کر عشق مجازی کے گئے عشق حقیقی کی عطا کردہ زندگی سے کھیل جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ یہ جان تو اللہ کی مانت ہے پھر کسی کی خاطر کیوں؟“ وہ سوچ رہی تھی۔ بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

”اگر ہاشم نہ ملا اور تمہاری شادی عاصم سے ہو گئی تو۔“ خود سے سوال کیا۔

”مالا کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاؤ گی۔ میری ذات یہاں وہاں جا بجا مالا کے دانوں کی طرح بکھری ہو گی۔ لیکن پورا یقین ہے کہ شوہر کی وفا، قربت، چاہت، اپنائیت سمیٹ لے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی یاد دل کے کسی کونے میں دفن ہو جائے گی، ماضی بن جائے گی۔ وقت بہر حال لگے گا مگر سمٹ جاؤ گی۔“

”کیسے سمٹو گی پاگل لڑکی کیسے۔ وہ پل پل



تمہاری نظروں کے سامنے ہوگا۔ بتاؤ بھلا کیسے سمیٹو گی؟ جھلی ہو۔“ اندر کی آواز نے ڈپٹا۔

”عاصم سے شادی کرو گئی تو سامنا ہوگا۔ میں عاصم سے شادی نہیں کرو گئی۔ کبھی نہیں۔ میں ہاشم کو بتا دو گئی کہ۔“ وہ خود ہی لجا گئی۔ ڈر گئی۔ اندر کی آواز خاموش ہو چکی تھی۔ جانے کب وہ بھی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆.....☆.....☆

دیر سے سونے کے باعث نماز فجر قضا ہو چکی تھی۔ ساڑھے چھ بجے اٹھی تو کوئی بھی نہ اٹھا ہوا تھا۔ چائے کی طلب ہوئی تو بال سمیٹ کر اٹھ کھری ہوئی۔ چوہدری حفیظ صحن میں بیٹھے تھے۔ مہرین کو دیکھتے چائے کا مطالبہ کر دیا۔ دوبارہ کمرے میں گئی بیگ سے ڈائجسٹ نکالا اور چائے کا کپ لے کر چھت پر چلی گئی۔ میز پر چائے چڑھتے ہی سامنے چار پائی پر لیٹے ہاشم پر نظر پڑی۔ کریٹ کو اٹھا کر کے اُس پر بیٹھ گئی۔ ڈائجسٹ پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی ہاشم آدھ کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ یہ خیال جہاں خوش کن تھا وہیں ایک ڈر بھی تھا۔

”باقی سب اٹھ گئے؟“ ہاشم بیٹھ گیا۔ چائے کا سب لیتے ہوئے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”مہر۔“ اُسے مخاطب کیا۔ مہرین کا روم روم کانپ رہا تھا۔ یہ کچی ڈر کی وجہ سے نہیں تھی۔ عجیب کیفیت تھی جسے وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی۔

”جی۔“

”ایک بات کرنی تھی۔ وقت مناسب ہے نہ جگہ مگر ضروری ہے بھی سوچا کر لوں۔“

”کہیں۔“

”عاصم تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کسی اور بس انٹرسٹڈ ہے۔ پاپا تم سے شادی کے لیے دباؤ

ڈال رہے ہیں۔“

”غلط کر رہے ہیں۔“ مہرین اتنا ہی کہہ سکی۔

”وہی تو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ شادی زبردستی کی جائے کیونکہ تمہیں وہ پیار نہیں مل سکے گا جو ایک بیوی کو ملنا چاہیے۔ ہاں ممکن ہے کسی موٹر پر وہ اُس لڑکی کو بھول اور دل سے اپنا لے مگر سفر طویل بھی ہو سکتا ہے۔“

”زبردستی کے رشتوں کی قائل تو میں بھی نہیں۔“ ہاشم شاید کچھ اور بھی کہتا۔ مہرین کے بولنے پر وہ اُس کو دیکھتا رہا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

”میں نہیں چاہتا کہ دو بھائیوں میں پھر سے فاصلے آئیں، پھر سے ناراضگیوں کا ناگ پھر سے پھن بھیل جائے۔ میں چاہتا ہوں یہ دوریاں اب نہ آئیں۔ بھائی ملتے رہیں۔“

”آپ کی یہی باتیں، یہی سوچ، یہی انداز فکر مجھے اچھا لگا ہے ہاشم بھائی۔ آپ سب سے الگ ہیں سب سے جدا۔“ اُس کے چہرے پر چاہت کے رنگ واضح تھے۔ اُس کی سانولی رنگت دمک رہی تھی۔ ہاشم ہر رنگ سمجھتا تھا، ہر رنگ سے خوب واقف تھا۔

”او۔ والہ اللہ کی بندی!! میری تعریفوں کے لیے پوری زندگی پڑی ہے۔ ابھی تو پاپا اور چاچو کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔“ ہاشم نے مزاح سے کہا۔

”دو بھائیوں میں صلح قائم رکھنے کی خاطر لازم ہے کہ عاصم کی خوشیوں کو قربان کر دیا جائے؟ مجھے زبردستی اُس پر مسلط کر دیا جائے تاکہ میری زندگی بھی اجیرن ہو جائے؟“ مہرین نے کہا۔

”اسی لیے بات کرنی تھی۔“ مہرین نے ناسمجھی کے انداز میں دیکھا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں؟“ چائے کا کپ زمین

پر رکھا۔

”ہاں۔“

”کیا مطلب ہاں۔“ وہ اُلجھ گئی۔

”عاصم تم سے شادی نہیں کرے گا۔“

”نہ کرے مجھے کونسا شوق چڑھا ہے اُس سے

شادی کرنے کا۔“ کندھے اچکا کر کہا۔ ہاشم کو عنایہ

یاد آ گئی۔ اُس کے مطلب کی بات نہ ہوتی یا جس

بات سے اُس کو فرق نہ پڑتا وہ بھی اسی طرح

لاپرواہی سے کندھے اچکا کرتی تھی۔

”گل تے پوری سن لے۔“ وچ ای ٹوک دینی

ایں (بات تو پوری سن لو۔ بیچ میں ہی کاٹ دیتی

ہو)۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”تسی دی تے بار بار کہہ رہے ہو کہ اوشادی نئی

کرے گا تیرے نال۔ ائی دی گئی گزری نئی۔

ہنہ (آپ بھی تو بار بار کہہ رہے ہیں کہ وہ تم سے

شادی نہیں کرے گا۔ ائی گئی گزری نہیں)۔“

”تے حقیقت دس ریاواں (تو حقیقت بتا رہا

ہوں)۔ اُس صورت میں چاچو اور پاپا میں پھر سے

دوریاں آ سکتی ہیں۔ پاپا نے بہت مان سے تمہارا

ہاتھ مانگا تھا۔ ہاں غلطی کر گئے عاصم سے نہ پوچھا۔

مسئلہ گھمبیر ہو چکا ہے۔ عاصم راضی نہیں ہوگا خواہ کچھ

بھی ہو۔“

”آپ کھل کر واضح بات کریں۔ بار بار یہ بتا کر

کہ عاصم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کیا بتانا

چاہتے ہیں؟“ مہرین تب گئی لیکن لہجے کو حتی الامکان

نارل رکھا۔ اُسے اپنی تذلیل محسوس ہو رہی تھی۔

”میں پاپا سے کہوں گا کہ چاچو کو دی گئی زبان

پوری ہوگی۔ ضرور پوری ہوگی اور تم اسی گھر کی بہو بنو

گی۔“ مہرین سمجھ کر شرما گئی۔ منہ دوسری طرف کر کے

منڈیر کے پار دیکھنے لگی۔

”تمہیں کوئی اعتراض۔“ ہاشم نے تصدیق

چاہی حالانکہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ مہرین کے

جذبوں سے واقف تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اپنا

عکس دیکھ چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر بکھرے قوس و

قزاح کے رنگوں سے نا آشنا نہیں تھا۔

وہ کچھ کہہ نہ کسی۔ شرما کر اثبات میں سر ہلایا اور

نیچے چلی گئی۔

رات کو کو لیہ تھا۔ آف وائٹ شرارہ پہنے وہ اچھی

لگ رہی تھی۔ ہاشم کی نظریں نا چاہتے ہوئے بھی

اُس کے گرد گھومتیں۔ یہاں وہاں آتے جاتے وہ

ایسی نلتی لگی جسے پکڑنے کی خواہش ایک ننھا بچہ کر رہا

ہو۔ وہ خود کو ملامت کرتا تو بھی دل کے ہاتھوں مجبور

ہو کر نگاہ پسندیدگی ڈال لیتا۔

وقت گزرتا گیا۔ مہرین نے وہاں نو دن

گزارے۔ ان نو دنوں میں ماسوائے ضروری بات

کہ ہاشم نے کوئی بات نہ کی۔ وہ اُلجھن کا شکار بھی کہ

گریز کیونکر۔ پہلے بات کرتا تھا، لہجے مذاق کرتا

تھا۔ مہرین نے نوٹ کیا جب سے اُس کی رضامندی

لی اس دن کے بعد شہبازم کا رویہ بدل گیا ہے، اُس

کے انداز گفتگو میں تبدیلی آ گئی ہے، اُس کو مخاطب

کرتے وقت نظریں چراتا ہے۔ کہیں وہ شادی کا کہہ

کر پچھتا تو نہیں رہا؟ وہ اور مہرین دونوں جانتے ہیں

چوہدری وجاہت ہاشم کے حوالے سے نہیں مانیں

گے کیونکہ مہرین اور ہاشم کی عمر میں فرق کافی زیادہ تھا

نیز مہرین ابھی سیکنڈ ایئر میں تھی۔ اسی کشمکش میں وہ

اپنے گھر آ گئی۔ عجیب سی بے سکونی، بے چینی اور

اُلجھن کا شکار تھی۔

مجھے خوف ہے کہ

وہ نباہ کے کسی مرحلے پہ

آ کے یہ کہہ دے کہ اب نہیں!

مرے دل کو تیری طلب نہیں!!

☆.....☆.....☆

”دل کر رہا ہے یہ پلیٹ اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں۔ میں کب سے کب کر رہی ہوں اور تم کھانے میں لگی ہو۔“ مہرین کو تانیہ پر غصہ آیا۔

”کیا کروں یہ بتا دو۔ نہ کروں تو یہ پلیٹ کیا جو مرضی سر پر دے مارنا۔“ سمو سے انصاف کرتے ہوئے مہرین کو نندی لگی۔

”یہ۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ تم کیا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“ صفائی والا کپڑا جھٹکتے ہوئے بولی۔

”یار ہاشم بھائی کا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ پہلے ہر دوسرے دن فون کرتے تھے۔ میسج پر بھی تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی تھی۔ پر اب۔ مجھے آئے بھی ڈھائی ہفتے ہو گئے ہیں۔ میسجز کیے۔ ایک کا جواب آیا کہ گھر میں شادی کے حوالے سے بات چیت ہو رہی ہے۔“

”پریشان مت ہو۔ سب اچھا ہوگا۔“

”اچھا نہیں ہوگا۔ بالکل بھی اچھا نہیں ہوگا اگر عاصم دباؤ میں آ کر مان گیا تو؟ میں اُس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ ہاشم سے جب جب سامنا ہوگا میرا دل۔ چہ۔ چھوڑ دیا کر کیا سمجھاؤں۔“

”ایک بات بتاؤ۔ تمہارے تایا اور ابو کیوں نہیں مانیں گے؟ عاصم نہ صحیح ہاشم صحیح۔ پھر پنگا کیونکر۔“

تانیہ نے کہا۔

”اتج ڈفرنس۔ عاصم کی میری عمر میں 5 سال کا فرق ہے جبکہ ہاشم بھائی کی میری عمر میں 11 سال کا۔“

”اتنا زیادہ فرق نہیں کہ وہ انکار کر دیں۔ تمہارے امی ابو میں سولہ سال فرق ہے۔ میری اُمو اور ابا میں پورے اُنیس سال کا فرق۔ کوئی معنی رکھتا ہے اُنیس سال۔ تمہاری شادی عاصم سے ہو یا ہاشم سے بات تو ایک ہے۔ عمر کا فرق بہانہ ہو سکتا ہے وجہ نہیں۔“ تانیہ کی بات اُس کے دل کو لگی۔

”تم اتنی کم عمر اور نا سمجھ ہو تو عاصم کے لیے بھی کوئی پیچور لڑکی دیکھ لیں۔“

”لڑکی وہ پسند کر چکا ہے۔ رہی بات میری تو شادی میری پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہوگی۔ دو تین سال پڑے ہیں ابھی تو۔ اس دوران ہاشم کی عمر کیا ہوگی تم اندازہ لگا سکتی ہو۔“ مہرین نے کہا۔

”ہا ہا ہا۔ تین سال اور بڑا اور بوڑھا ہو جائے گا۔ اور کیا۔“ تانیہ نے قہقہہ لگا پاتو مہرین تپ گئی۔

”اب اتنا بڑا بھی نہیں۔ 28 سال کے ہیں۔“ چائے کے برتن سنک میں رکھتے ہوئے بولی۔

”آئی واز جو نک مہرین۔ تم سیر لیں ہو گئی۔“

مہرین کا چہرہ صفاتار ہاتھا اُسے برا لگا ہے۔

”تانی میرے نزدیک محبت صرف محبت ہے۔ جس کا کوئی دین مذہب نہیں، کوئی دھرم نہیں۔ یہ ذات پات، رنگ، نسل، امیری غریبی اور عمر جیسے فرق سے ماورا ہوتی ہے۔ وفا، ایثار، خلوص، چاہت، اپنائیت سے بھری بے لوث!!“ وہ ڈور خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ تانیہ کو لگا کسی رنگین نے انہن کی مہارت کے ساتھ اُس کے چہرے پر محبت کے رنگ بکھیرے ہیں۔ ہر رنگ اتنا واضح تھا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔

”تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ میں اتنا جانتی ہوں جوڑے آسانوں پر بنتے ہیں۔ ہاشم تمہارے نصیب میں ہے تو تمہارا ہی ہوگا ورنہ لاکھ کوشش کر لو نہیں ملے گا۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں، نصیب کی بات ہے۔“ تانیہ کو سمجھ نہ آئی کیا کہے۔ شاید وہ اس دور سے گزری نہیں تھی۔ اس راہ پڑی نہیں تھی اس لیے کچھ کہنے سے قاصر رہی۔

”دُعا سے قسمت بدل جاتی ہے۔ میں بد لوگی اپنی قسمت۔ اپنے رب سے اُس کا ساتھ مانگو گی۔“ مہرین نے پُر امید ہو کر کہا۔

کون شادی کرے۔ پتہ نہیں خود کو سمجھتا کیا ہے۔  
ویسے بھی ایسے سڑیل، اکڑا اور بد مزاج سے شادی کا  
شوق مجھے بھی نہیں تھا۔ ابو کی خواہش تھی بھی چپ  
رہی۔“ سب اٹھا کر کھاتے ہوئے بولی۔

”ہاشم بھائی اُس سے بہت مختلف ہیں نہ۔ ہنس  
کھ، زندہ دل، ملنے جلنے والے، جی دار۔“ مہرین  
نے کہا پھر خود ہی جھینپ گئی۔

”تمہیں ہاشم کیسا لگتا ہے؟“ بھابھی کے واضح  
پوچھنے پر وہ بوکھلا گئی۔

”اچھا ہے۔“ مختصر جواب۔  
”اگر تایا ابو ہاشم کے لیے کہیں تو؟“ خدیجہ  
نے پوچھا۔

”کیا انہوں نے بات کی ہے؟“ فوراً پوچھا  
اور زبان دانتوں تلے ڈبالی۔

”سوال پر سوال نہیں پوچھا جاتا۔ جواب دیا  
جاتا ہے۔“ مہرین شرمندہ ہو گئی۔

”عاصم کی باری اعتراض نہیں تھا۔ اب کیوں  
ہوگا؟“

”یعنی اُسے پسند کرتی ہو۔“  
”نا پسند کر بیوالی بات نہیں اُس میں۔ اتنی  
خوبیاں تو گنوا چکی ہوں۔“

”تم دونوں کی عمر میں کافی فرق ہے۔ وہ میچور  
ہے تم نا سمجھ امیچور۔ وہ پریکٹیکل بندہ ہے اور تم جذباتی  
لا ابالی لڑکی۔“

”وقت کے ساتھ ساتھ بندے میں میچورٹی  
آ جاتی ہے بھابھی۔ میں بھی میچور ہو ہی جاؤ گی۔  
ساری عمر امیچور یا لا ابالی نہیں رہو گی۔“ اُسے خدیجہ کی  
بات بری لگی تھی۔

”آپ کی اور ٹیکل بھائی کی اتج میں 9 سال  
فرق ہے۔ ہاشم کی اور میری اتج میں 11 سال کا۔  
صرف دو سال کا ہی فرق ہے۔“ وہ حاضر جواب تھی

”تمہاری لگن سچی ہے، تمہارے جذبے خالص  
ہیں۔ وہ تمہارا ہی ہوگا۔ ان شاء اللہ۔“ دونوں نے  
ایکسا تھ آئین کہا۔

☆.....☆.....☆

”السلام علیکم! کیا حال احوال ہیں؟“ مہرین  
نے ایک بار پھر متوج کیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ جواب  
ناردا!

میرے لفظوں کا سکتا لہجہ  
کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا!

میٹج سینڈ کیا۔ مزید کچھ منٹس انتظار کیا پھر منہ بنا  
کر موبائل صوفے پر پٹخ دیا۔

”کس بات پر غصہ ہے؟“ پیاز کا ٹٹے ہوئے  
خدیجہ نے پوچھا۔

”غصہ تو نہیں۔“ مہرین کو احساس ہوا۔  
”اچھا موبائل تو ایسے پھینکا جیسے کسی پر خفا  
ہو۔“ ٹیوٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھابھی۔ میں رکھ رہی تھی  
جانے کیسے چٹا گیا۔“ اُس کو سمجھ نہ آ رہی تھی کیا کہے۔  
بھابھی جہاں دیدہ نہ صحیح لیکن نا سمجھ بہر حال نہیں  
تھیں۔

”کافی ٹائم ہو گیا ہاشم ملنے نہیں آیا۔“ پتہ نہیں  
وہ پوچھ رہی تھیں یا بتا رہی تھیں۔

”ہمیں کیا آتا ہے آئے ورنہ مرضی اُس کی۔“  
وہ لا پرواہی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ لہجہ الفاظ کی  
چغلی کھا رہا تھا۔

”تایا ابو کا فون آیا تھا ابو کو۔“ خدیجہ کی بات سن  
کر حیرانگی سے دیکھا۔ وہ کیسے لاعلم رہی۔

”کہہ رہے تھے عاصم شادی کے لیے رضامند  
نہیں ہے۔ شرمندہ تھے۔ بار بار معافی مانگ رہے  
تھے۔“ انہوں نے خود ہی بات بڑھائی۔

”اچھا ہے منع کر دیا۔ ایسے سڑیل مزاج سے

یاد ہے اور میں حال۔ وہ مجھ پسند کرتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا ہے میں نے۔“ غلط سوچ کو لٹاڑا۔

”مہرین۔ مہرین۔“ سوچوں میں اتنی موتھی شکیل کی آواز نہ سن سکی۔

”جج جی بھائی۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”کیا بات ہے۔ کہاں گم ہو؟“ شکیل نے پوچھا تو پانی کا گلاس تھما دی خدیجہ نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا۔

”گم نہیں تھی بھائی۔ دھیان نہیں رہا آپ کے آٹے کا۔“

”جب دھیان کہیں اور ہوگا تو ایسا ہی ہوگا۔“

خدیجہ نے طنز کیا۔ ان کا رویہ مہرین سمجھ نہ پا رہی تھی کہ وہ کیوں بدل گئی تھیں۔

”کیدرا دھیان کتنے وا (کس کا دھیان کدھر ہے)۔“ چوہدری حفیظ نے کچن کی دیوار کے ساتھ لگے تخت پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”السلام علیکم!! یونہی باتیں کر رہے تھے ابو۔ آپ بیٹھیں میں چائے لائی۔“ مہرین چائے بنانے چلی گئی۔

”اپنی ماں کو باہر بھیجو۔“ جی اچھا کہہ کر وہ چلی گئی۔

”دونوں کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔ کیا سوچا؟“ چوہدری حفیظ نے دونوں کو مخاطب کیا تو خدیجہ کچن میں جاتے جاتے رُک گئی۔ وہ جلد آ، جلد مہرین کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔

”مجھے اعتراض نہیں۔ ہاشم دیکھا بھالا لڑکا ہے۔

ملنے جلنے والا۔ عاصم سے نہ زیادہ بات چیت ہوئی آج تک نہ واسطہ پڑا۔ یوں کہہ لیں اُس کو واسطہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔“ شکیل نے صاف گوئی سے کہا۔ اتنے میں مسز حفیظ بھی آ گئیں۔

نہ بحث کر نیوالی۔ عاصم کی باری وہ دو ٹوک میں بات ختم کر دیتی تھی۔ ہاشم کی باری دلائل، وضاحتیں، مثالیں سب حاضر تھا۔ خدیجہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔

محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں محبت میں اتنی طاقت ہوتی کہ انسان خود کو بدلنے پر مجبور ہو جائے۔ اپنے آپ کو محبوب کی پسند کے سانچے میں ڈھنسنے کا حوصلہ وہی کر سکتا ہے جو شدت محبت کرتا ہو۔ ورنہ خود کو بدلنے کی سعی کوئی نہیں کرتا، کرنا ہی نہیں چاہتا۔

”آپ نے بتایا نہیں۔“

”کیا؟“ وہ چونکی۔

”بہی کہتا یا ابو نے کیا بات کی ہے؟“

”بات کیا کرنی ہے عاصم نے منع کر دیا ہے شادی کے لیے۔ انہوں نے ہاشم کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ ابو نے کہا سوچ کر بتائیں گے۔“ سبزی اٹھا کر وہ کچن میں چلی گئی۔

مہرین کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ سب اتنا آسان ہوگا اُس نے کہاں سوچا تھا۔ وہ سمجھی تھی تا یا ابو کبھی نہیں مانیں گے مگر یہاں تو بازی کی پلٹ گئی۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا ابو انکار نہیں کریں گے۔ ایک نظر مو بائل کی طرف دیکھا جو ساکت تھا جیسے قسم کھا رکھی ہو خاموش رہنے کی۔

”کیا پتہ اسی لیے منیج یا فون نہیں کرنے سے اجتناب کر رہا ہو۔ گھر بھی اسی لیے نہیں آ رہا۔ مگر بتا تو سکتا تھا۔“ خود کلامی جاری تھی۔

”پاگل لڑکی!! نہ وہ لڑکی ہے کہ اجتناب کرے نہ وہ تم سے محبت کرتا ہے جو مطلع کرتا۔“ منشی سوچ نے بھڑکایا۔

”محبت بھی ہو جائے گی۔ میرے ساتھ رہ کر وہ عنایہ کو بھول جائیں گے۔ وہ ماضی کی یاد بھولی بسری

حفیظ نے کہا۔

”ابو جی اُس نے جاب کے لیے اپلائی کیا ہے۔ اُمید ہے جلدی نوکری لگ جائے گی۔ مہرین اور تیمور کا ہاں (جوڑ) بھی ہے۔ دونوں کی جوڑی اچھی لگے گی۔ تسی اک واری سوچو تے صیالیں بارے تے۔“ اُس نے اپنے طور مکمل کوشش کی۔

”مہرین۔ کہاں رہ گئی؟ چائے پکا رہی ہو یا پائے۔“ چوہدری حفیظ کی آوازیں کر دروازے سے ہٹی اور چائے کو بالادیکر کپ میں ڈالا۔

”یہ کیس چائے۔“

”اک کپ سی چا دا۔ اپنی دیر لگا دتی۔“ کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

”سلیب صاف کر رہی سی ابوجی۔“ صفائی دی۔  
”بیٹھ بیٹھ۔ گل کرنی اے۔“ اُس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھایا۔ خدیجہ جانتی تھی وہ کیا بات کرنا چاہتے تھے۔ اتنا آزاد ماحول تو نہیں گھر کا پھر آج ابوجی کیوں مہرین سے پوچھ رہے ہیں۔ وہ سوچ سکی زبان پر نہ لاسکی۔ وہاں سے اٹھ کر کچن میں سالن بنانے چلی گئی۔ وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ جب مہرین ہاشم کو پسند کرتی ہے رضامند ہے تو وہ کون ہوتی ہے اعتراض کر نیوالی۔

”مہرین تم اپنی بھابھی کا ہاتھ بٹا دو جا کر۔“

شکیل نے کہا۔

”ابو کی بات۔“

”کھانے کے دوران ہو جائے گی بات۔ جاؤ تم۔“ اُس نے بات کاٹ دی۔

”کمال اے ابوجی۔ اُس دی کوئی عمر اے جو تسی اودی رضامندی لے رہے او (اُس کی کوئی عمر ہے جو آپ اُس کی رضامندی لے رہے ہیں)۔ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ ذہن منتشر ہو جائے گا۔“

”جھلیا۔ عاصم کو لے کر اُس کا ذہن منتشر ہوا؟

”تسی عمر دافرق پل جان دے او (آپ عمر کا فرق بھول جاتے ہیں)۔“ خدیجہ نے شکیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں تیرے توں کرنا وڈاواں؟ فیروہی نبھ رہی اے۔ بلا وجہ کی باتوں کو بنیاد نہ بنا خدیجہ (میں تم سے کتنا بڑا ہوں۔ پھر بھی نبھ رہی ہے)۔“

”شکیل ٹھیک کیندا اے۔ ویارہ تو بعد کڑی نوں شعور آ جاندا اے۔ مہرین عقلمند اے، اچھا برا سمجھدی اے۔ سنبھال لے گی سب (شکیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو شعور آ جاتا ہے۔ مہرین عقلمند ہے، سمجھدا رہے، اچھا برا سمجھتی ہے۔ ہینڈل کر لے گی سب)۔“ مسز حفیظ نے کہا۔ بانی لوگوں کے لہجے میں پنجابی ٹچ نمایاں تھا۔ اُردو بھی بولتے تو پنجابی جھلکتی تھی۔ مسز حفیظ کو سرے اُردو بولنی ہی نہ آتی تھی۔ وہ پنجابی میں ہی بات کرتیں۔

”تیمور کے لیے امی ابو۔“ شکیل نے ہاتھ کے

اشارے سے منع کر دیا۔

”خدیجہ خدیجہ تو سمجھدی کیوں نئی پار۔ وٹہ سٹہ زندگیاں تباہ کر دیتا ہے۔ ایک نہیں دو گھر اُجاڑتا ہے۔ تھوڑی سی اونچ نیچ ہوئی نہیں ہو گیا کام خراب۔“

”تیمور۔ ہاں اچھا لڑکا ہے۔ مگر شکیل کی بات سے انکار نہیں کر سکتا دھی رانی۔ ویسیگی شادی میں رسک رہتا ہے۔ ایک طرف اُن بن ہو دو گھر پلیٹ میں آ جاتے ہیں۔“ انہوں نے رسان سے خدیجہ کو سمجھایا تاکہ وہ خفا نہ ہو۔

”اُس کی کوئی جاب نہیں ہے۔ وہ اس بارے سنجیدہ بھی نہیں ہو رہا۔ اپنے پیروں میں کھڑا ہونے کے لیے اُسے وقت چاہیے۔“ شکیل نے کہا تو خدیجہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

”جبکہ مجھے مہرین کو جلد بیاہنا ہے۔“ چوہدری

☆.....☆.....☆

رات کھانے کے بعد وہ کتنی دیر چوہدری حفیظ کے پاس بیٹھی رہی شاید بات کریں۔ مگر چائے پی کر وہ سو گئے۔ موبائل لیا اور اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔ موبائل گھماتے گھماتے کافی دیر ہو گئی۔ ٹائم دیکھا تو ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میسج کیا۔

آئے تو یوں جیسے ہمیشہ تھے مہربان بھولے تو یوں گویا کبھی آشنا نہ تھے! ”مہربان ہوں سچ ہے۔ بھول گیا غلط بات۔“ غیر متوقع طور پر جواب آ گیا۔ ”مہینہ ہو گیا بات کیے۔“ میسج کا جواب نہیں، کال نہیں کی، گھر نہیں آئے۔“ مہرین نے شکوہ کیا۔ ”مصرف تھا۔ پاپا کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی۔“

”ابو نے بتایا تھا۔ اب کیسے ہیں؟“  
”اے وَن! الحمد للہ!“

مہرین کو سمجھ نہ آیا کیا کہے، کیا پوچھے۔ وہ چاہتی تھی ہاشم خود سے کوئی بات کرے۔ مگر کوئی میسج نہ آیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ وہ کروٹ بدلتی رہی۔ بیچنی وبے سکونی نے پورے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ دوبار اٹھ کر پانی پی چکی تھی۔

”تی کی گل اے۔ پیمیری دی طرح پھری ایں۔ تینو نیندر نہی آندی؟ (کیا بات ہے پیمیری کی طرح پھر رہی ہو۔ تمہیں نیند نہیں آرہی)۔“ ماں کے کہنے پر چپ چاپ لیٹ گئی۔ کروٹ دوسری طرف لے لی۔ موبائل سائیلنٹ پر لگایا ہوا تھا۔ اس لیے نظرس فون پر جمی ہوئی تھیں کہ شاید میسج آ جائے۔ رات کی طرح گھپ اندھیرا، سناٹا، گہری خاموشی، ویرانی!!

(جاری ہے)

نہیں نہ۔ پھر اب کیوں؟ اچھا ہے پوچھ لوں کہ وہ کیا کہتی ہے اس بارے میں۔“

”بات تو ٹھیک ہے، چلیں مرضی تہاڑی۔ رات نوکل کر لینا۔“ شکیل نے کہا اور واش روم چلا گیا۔

چوہدری حفیظ چاہتے تھے کہ جلد از جلد بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ دل کے مریض تھے۔ جب سے دوسرا ہارٹ اٹیک آیا تھا زیادہ فکر مند رہنے لگ گئے تھے۔ عاصم کے انکار کا سن کر کتنے دن پریشان رہے۔ بھوک پیاس مر گئی۔ پھر ایک دن فون آیا کہ ہاشم کے لیے مہرین کا رشتہ دے دیں تو انہوں نے سوچنے کا وقت مانگا تاکہ بیٹی کی مرضی بھی جان لیں۔ اُن کی اپنی فیکٹری تھی لیکن جب سے کاروبار تباہ ہوا اُن کا زوال شروع ہو گیا۔

مہرین اُس وقت مشکل سے سات ماہ کی ہوگی۔ قسمت اُن کو بنگلے سے ایک چھوٹے گھر پر لائے

آئی۔ چوہدری وجاہت سے اُن زمینوں کا پوچھا جو والدین نے دونوں کے نام کی تھیں تو اُن کے بقول وہ زمین اُن کی ہے۔ اس بات پر کافی ٹکرا رہی ہوئی۔

بات جھگڑے تک پہنچ گئی اور دیوار جدائی نے راہ بنا لی۔ پچھلے سترہ سال سے وہ ایک مہینی میں معمولی سے عہدے پر فائز تھے۔ تنخواہ اتنی تھی کہ گزر بسر ہو

جائے۔ ڈھائی سال پہلے والد کی وفات پر دونوں بھائیوں میں صلح ہو گئی۔ خون کب تک ایک دوسرے سے الگ رہ سکتا ہے۔ جوش تو مارتا

ہے۔ یوں بھی دونوں عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ اس تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے چوہدری وجاہت نے مہرین کا ہاتھ عاصم کے لیے مانگ لیا۔ عاصم کے انکار پر انہوں نے ہاشم کو پوچھا تو اُس نے

جیسا آپ کہیں کہہ کر اُن کا مان بڑھا دیا۔ چوہدری حفیظ چاہتے تھے مہرین کی رائے جان لیں کہیں اُس کو اعتراض تو نہیں۔

## دختر

~~~~~

آخر ہم بچیوں کو کب اوڑھنے پہننے کا سلیقہ سکھائیں گے ہم انہیں کب یہ سمجھائیں گے کہ مادر پدر معاشرے میں سنبھل کر رہنا چاہیے.....

~~~~~

خوشبو اور AC کی ٹھنڈک بھی اس کے غصے پر قابو پانے پر ناکام تھی۔ کیوں اس کا چینل مزید چینلز کی طرح اونچی اڑان نہیں بھر پار ہا۔ جبکہ اس نے تربیتی یافتہ اسٹاف اونچی تنخواہ پر رکھا تھا۔ جب اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا تو تھک کر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

پاپا..... اور امجد صاحب چونک کر بیٹھ گئے سامنے سونیا کھڑی تھی۔ جس میں اُن کی جان تھی۔

امجد صاحب جس وقت کراچی آئے تھے۔ ان کی عمر 18 سال تھی۔ مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ تھے۔ انٹرمیڈیٹ کی سند اور دو جوڑی کپڑے جو ماں نے پیسے جوڑ کر بنوائے تھے۔ تاکہ ان کا پڑھا لکھا بیٹا احساس کمتری کا شکار نہ ہو اور وہ بابو بن کر واپس آجائے۔

جب کہ واپس آنے کا اس کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس کی اڑان بہت اونچی تھی۔

اس نے سنہرے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے شمسہ جو اس کی کلاس فیلو تھی اور اس کے پرفریٹ

جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا ہانیہ نے کھٹ سے چینل بدل کے کاڈرامہ لگا دیا۔ وہ توجہ دیے بغیر اپنی مطلوبہ چیز اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے کمرے پر نظر پڑتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ہانیہ تم کو نظر نہیں آ رہا کہ کمر اس قدر پھیل رہا ہے۔ ہر وقت لیوی سے چپکی رہتی ہو۔ یہ نہیں کہ ذرا روم ہی سمیٹ لو۔

جی..... ممابلس اٹھ رہی ہوں۔ ذرا یہ قسط ختم ہو جائے۔ ہانیہ نے جواب دیا۔

یہ کہاں ختم ہوں گے۔ فرح بڑبڑائی۔  
فکر نہ کریں مما۔۔۔۔۔ اس کے بعد آپ کی قسط مس ہوئی تھی۔ فرائیڈے والا وہ آئیگا۔ جب نانی آئی ہوئی تھیں اور آپ نے ان کے خوف میں نہیں دیکھا تھا۔ ہانیہ شرارت سے بولی۔ فرح اس کو مسکرا کے دیکھتی ہو باہر نکل گئی۔

ہانیہ اس کے نکلتے ہی چینل بدل چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

ویل ڈیکوریٹڈ آفس میں ایئر فریشٹر کی مسکورن



تھی۔ یہ جان کر کہ وہ ایک بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماں کے انتقال کے بعد تو انہوں نے رحیم یار خان اور اپنے بڑے بھائی کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا۔

ہانیہ فرح اور سعد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جو شادی کے 12 سال بعد پیدا ہوئی تھی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے بعد ان کے ہاں مزید کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ دونوں کی آنکھ کا تارہ تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق کے باوجود وہ لوگ ہانیہ کو مہنگے ترین اسکول میں تعلیم دلوا رہے تھے۔

جن اسکولوں کا مقصد صرف موٹی موٹی فینسیں لیکر فر فر انگلش بولنا سکھا کر والدین کو امپریس کرنا کے ان کا بچہ بہت قابل ہے۔ کیونکہ یہاں قابلیت کا معیار صرف انگلش بولنا ہی ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ چاروں کانفرنس کال میں مصروف تھے۔ یار..... کل پہلے بوٹ بیسن پر ناشتہ اس کے بعد

12 والا شو پھر..... عیاشی۔ قیصر بولا۔

نووین..... یار تم تو بچے ہی رہنا۔ شہر یار نے قیصر کا مذاق اڑایا۔ سمیر نے لقمہ دیا۔

یار! میرے ایک فرینڈ نے بتایا ہے کہ ایک پرائیوٹ سینما گھر ہے۔ ایک پلازہ میں جہاں مزیدار فلمیں دیکھائی جاتی ہیں۔ وہاں چلیں گے۔ ہانیہ اور نووینا کو بھی لے لیں۔؟ قیصر نے کہا۔ نہیں، کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو کل فرسٹ ٹائم ہے نہ اگلی بار یہ عیاشی بھی سہی۔ سمیر نے جواب دیا۔

یہ بیباک زین ہے؟۔ راجیل نے قہقہہ لگایا۔ زین کی تو حالت ہی خراب تھی۔

نہیں یار! اس کو ل بنک نہیں اگر مٹا کو پتہ چل گیا تو۔؟ وہ گھبرار ہاتھا۔ آخر کار ان لوگوں نے زین کو مٹا ہی لیا۔

☆.....☆.....☆

فرحان آج ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرامز کی ریٹینگ چیک کر رہا تھا۔



نہیں کیا ہوا۔  
ایسا کرتے ہیں۔ اسپانسرز کی ایک میٹنگ کال کرتے ہیں تاکہ سب سے مشورہ کر سکیں۔  
ایسا نہ ہوا تو سارے اسپانسرز ٹوٹ جائیں گے۔ امجد صاحب سنجیدگی سے گویا ہوئے۔  
فرحان اس چیلن کا CEO تھا۔ اس لیے یہ تمام ذمہ داری اس کی تھی۔

آج میٹنگ کا دن ملے تھا۔ فرحان ٹائم سے قبل آفس میں موجود تھا۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔  
تمام اشتہاری کمپنی کے نمائندے موجود تھے۔  
بس امجد صاحب کا انتظار تھا۔  
جیسے ہی امجد صاحب نے صدارتی کرسی سنبھالی۔

آپ لوگوں کو میٹنگ کا ایجنڈا تو معلوم ہی ہے۔  
لہذا تجاویز..... انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

سر! مارننگ شووز کے معیار کو ہائی کیا جائے۔ کون دیکھتا ہے۔ یہ بیوٹی ٹیس اور کھانا پکانے کی ترکیبیں۔ دوسرا طزیہ انداز میں گویا ہوا۔  
سب پرانی چیزیں ہو گئیں۔ اب اس میں مصالحہ ڈالیں مصالحہ۔ ریحان نے کہا۔

آج کل مارننگ شووز میں لو برڈز گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والے کپڑوں کی کہانیاں نمک مرچ لگا کر نشر کی جاتی ہیں۔ جب لوگ متاثر ہوتے ہیں ورنہ ریویو ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

اور ان سے ہی مارننگ شووز کی ریٹنگ میں اضافہ ہوتا ہے۔

یوتھ کو اٹریکٹ کریں یوتھ کو۔ پتہ ہے نہیں چیلن کھول کے بیٹھ گئے۔ وہ سر جھٹک کر بولا۔

یہاں اغوا شدہ بچے اور بچیوں کے ریپ کی ہیڈ لائن دو گھنٹے بعد چلتے جب کہ تمام نیوز چینل کے

ابے یار مارے گئے۔ اتنی کم ریٹنگ باس کے ہاتھوں خون تو پٹکا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔  
اب اسپانسر کے خفگی بھرے فون اور امجد صاحب وہ تو کھا جا کینگے۔ فرحان نے سر پکڑ لیا۔  
سر آپ کو باس بلارہے ہیں۔ پیون نے آکر وہ ہم بھاڑ ہی دیا۔

☆.....☆.....☆

فرحان ایک ڈرامے میں کھوئی ہوئی تھی۔ لوسین پورے عروج پر تھا۔ کہ فرحان کی نظر ہانیہ پر پڑی۔ وہ بھی پوری دلجمعی کے ساتھ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

اس کو بہت عجیب سا لگا۔ امی ٹھیک کہتی ہیں۔ آجکل کے ڈرامے اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے۔

ہانیہ! پانی کی بوتل اور گلاس لانا۔ ایک لمحہ کو ہانیہ نے نظر ہٹائی۔

مما ایک منٹ رکیں دوبارہ وہ نظر جما کر ٹھنکی۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔

اوہو..... اس منٹ کو بھی ابھی جانا تھا۔ سارا مزا کر کر کر دیا۔ فرحان جل کے رہ گئی۔

اب لائٹ آئے تو شرافت سے پڑھنے بیٹھ جانا کیا ہر وقت ٹی وی سے چپکلی رہتی ہو۔ فرحان ڈپٹ کر بولی۔

☆.....☆.....☆

یہ کیا ہے فرحان؟ ریٹنگ اتنی کم! اسپانسرز الگ کال کر کر کے میری جان کو رو رہے ہیں کیا جواب دوں ان کو۔ امجد صاحب نے لیپ ٹاپ اس کی طرف گھمایا۔

سر! کچھ سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں؟ فرحان نے بے بسی سے سر پکڑا۔ اچھا خاصا ٹھیک چلتے چلتے پتہ

ہاں وہ کہہ رہا تھا کہ 12 بجے ہانیہ کی کال آئی تھی کہ وہ خود سے گھر چل جائی گی۔ فرح تو لگ رہا تھا کہ درود کہہ مر جائے گی۔

اجہا تم چپ کرو میں امی کو کال کر کے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

سعد نے فرح کو دلا سہ دیا۔ مگر اس کے دل کو پنکھ لگ گئے تھے۔ آخر ہانیہ گئی تو کہاں گئی۔ اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی 24 گھنٹے گزرنے کے بعد FIR کٹوا دی۔

”بریکنگ نیوز کلفٹن سی ویو سے ایک سولہ سالہ بچی کی لاش پر آمد۔ بچی کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔“

نمائندہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ سب سے پہلے یہ خبر ہم نے بریک کی۔

واؤ! فرحان میاں آج تو دل خوش کر دیا اور اسپانسرز کی مبارک باد..... واہ واہ۔ امجد صاحب سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ انہوں فرح سے بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھی۔

Lets cleberet young man

No thanks sir یہ میں نہیں لیتا۔ فرحان بولا۔ اگر سو فٹ ڈرنک مل جائے یا شاندار لُنچ؟ آج لُنچ میری طرف سے۔ وہ بولے۔

بریکنگ نیوز بار بار چل رہی تھی۔ نہ ان لوگوں کو اس بچی سے کوئی ہمدردی تھی۔ نہ اس کے گھر والوں سے وہ تو صرف اپنے چینل کی ہائی ریٹنگ کا جشن منا رہے تھے۔

آج ان کا ٹی وی بھی خاموش تھا۔ فرح تسبیح کے دانوں کے ساتھ ساتھ آنسو بھی گرا رہی تھی۔

فرح بیٹا ہمت کر سعد کو دیکھو۔ وہ کتنا پریشان ہے۔ فرح کی امی دو دن سے یہیں مقیم تھیں۔

سعد کے موبائل کی بیل بج رہی تھی۔ فرح نے بے

نمائندے اس نیوز کو دو گھنٹے پہلے بریک کر چکے ہوتے ہیں۔ آپ کے نمائندے پتہ نہیں کہاں سو رہے ہوتے ہیں۔

امجد صاحب نے خشمگین نگاہوں سے فرحان کو گھورا۔

سب کی خاطر مدارات کے بعد میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔

مما! آج میری ایکسٹرکلا س ہے۔ ہانیہ بولی۔ آج ہفتہ کو؟ فرح نے حیرت سے پوچھا۔

جی آپ کسی کو بھی کال کر کے پوچھ لیں۔ ہانیہ بولی

وین آئے گی؟ فرح بولی۔

آپ بابا کو بولیں۔ وہ مجھے ڈراپ کر دیں دوپہر میں وین چھوڑ دے گی۔ ہانیہ بولی۔

بابا کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ہانیہ نے اس کو کال ملائی۔ کہاں ہو تم جلد آؤ۔

میں حاضر ہوا میری جان..... وہ پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

کیا تم بھی ناوہ شرمائی اور آنکھیں جو جھل ہو گئیں۔ وہ ہانیک لے کر آیا تھا۔

آج کا دن ہمارا ہے صرف ہمارا۔ اس کے پیچھے بیٹھ کر ہانیہ بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیے

ہانیہ کی مہک اس کو دیوانہ بنا رہی تھی۔

دونچ چکے تھے۔ فرح کی ٹانگیں گیٹ کا چکر لگا لگا کر ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہیں تھے۔ برے برے خیالات اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر سعد

کو کال کر دی نہ اس کا دل قابو میں تھا نہ اس کے ہاتھ پاؤں۔

سعد! ہانیہ ابھی تک گھر نہیں آئی۔ وین والے کو کال کی۔

قراری سے سعد کو دیکھا۔

تھانے سے فون ہے۔ سعد نے کہتے ہوئے کال ریسیو کی۔ اس کا دوست راشد اس کے ساتھ تھا۔ اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ ہم آتے ہیں۔ وہ راشد کا ہاتھ پکڑ کر جلدی جلدی سے باہر نکل گیا۔

میری بچی! سعد ہانیہ کی لاش سے لپٹ گیا۔ یہ میری بچی ہے۔ اس کے چہرے کے نشان اور پھٹے کپڑے اس پر گزری داستان سنار ہے تھے۔

انسپکٹر صاحب کس نے کس نے کیا اس کا یہ حال؟ سعد ٹپ رہا تھا۔

ہمیں کیا پتہ؟ ہم تو اب تلاش کریں گے۔ آپ بتائیں آپ کی کسی سے دشمنی تھی۔ اس نے خالص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔

راشد سعد کو سنبھال کر بے حال ہو رہا تھا۔ نہیں سر شریف لوگ ہیں ہم کیوں دشمنیاں پالیں گے۔ راشد نے جواب دیا۔

کارروائی کر کے لاش ان کے سپرد کر دی۔ آج ہانیہ کو دفنائے چوتھا روز تھا۔ لوگ طرح طرح کی چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ لوگوں کو تو صرف باتیں بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔ ان کو کسی کے جذبات کی کیا پرواہ۔ سب تین دن کا سوگ پورا کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

خاموشی کے گہرے سائے چہار طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہانیہ کی چیزیں اس کا کمرہ ان لوگوں کو دکھ سے باہر نہیں آنے دے رہا تھا۔

یا اللہ! ہم کو صبر عطا فرما۔ میری بچی کے قاتلوں کو گرفتار کروا دے۔ فرح بلک بلک کے رو رہی تھی۔ اللہ ایسا دکھ کیسی کو نہ دینا۔

بس کرو خدا کے لیے! فرح چپ ہو جاؤ۔ وہ فرح کو سینے سے لگا کر کرب سے چیخا۔ میری طرف دیکھو..... کیا وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ میری طرف

دیکھو میرا تو خیال کرو۔ فرح نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ بڑھی ہوئی شیو۔ کھڑے بال سرخ ویران آنکھیں پلپلیز! تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ویسے ہی ہمارے تو جینے کا آسرا ختم ہو گیا۔

ڈور بیل بجی اس نے گیٹ کھولا۔ تو سامنے راشد کھڑا تھا۔ بار بار بریکنگ نیوز چل رہی تھی کہ ہانیہ کے قاتل گرفتار..... تم کو کال نہیں آئی تھانے سے..... راشد بولا۔

ارے..... موبائل شاید دوسرے کمرے میں ہے۔ راشد تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔ نومس کالز تھیں۔

کیا ہوا فرح بھی باہر آگئی۔ ہماری دعا رب نے سن لی۔ ہانیہ کے قاتلوں کو گرفتار کیا ہے۔ چلو جلدی تھانے چلتے ہیں۔

تم تم..... وہ لوگ منہ کھولے دیکھ رہے تھے۔ وہ ہانیہ کے کلاس فیلوز تھے۔ سب کی عمریں ہانیہ جتنی ہی تھیں۔

تم تو ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔ وہ دوست تھی۔ تمہاری فرح سمیر کی طرف لپکی۔ جبکہ سعد گنگ تھا۔

سر سر میں نے کچھ نہیں کیا ہانیہ کے ساتھ۔ زین گر گڑا یا۔

تو آکر بتایا کیوں نہیں۔ انسپکٹر نے ایک کرارا تھپڑ اس کو رسید کیا۔

وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ گئی تھی دن یاد گار بنانے۔ سمیر بولا۔

باقی ہم نے سب زبردستی کیا۔ ہم کو اس بات کا بہت افسوس ہے۔ وہ رو رہے تھے۔

وہ لوگ ہمارے ہوئے قدموں سے باہر نکل گئے۔ اس سسٹم میں سزا ملتی تو بہت مشکل تھی۔ ویسی ہی بڑے لوگوں کے بچے تھے اور تھے بھی 18 سال

## غزل

عجب انداز کی یہ رہگزر ہے  
نہ رستہ ہے نہ کوئی راہبر ہے  
کہاں میں اور کہاں یہ وصف صاحب  
لفظ یہ آپ کا حسن نظر ہے  
نظر ملتے ہی دیوانہ بنائے  
کہ اس کے پاس یہ کیسا ہنر ہے  
کھنچا جاتا ہے دل تیری ہی جانب  
تری باتوں میں یہ کیسا اثر ہے  
ابھی آیا نہیں وہ پوچھنے کو  
کیا میرے حال سے وہ بے خبر ہے؟  
یہاں سے جاؤں گا اب کس طرف میں؟  
تیری چوکھٹ ہی میرا مستقر ہے  
اُدھر بے چین ہے میرے لیے وہ  
یہی تو حال میرا بھی اُدھر ہے  
کوئی تو کام اچھا کر کے جاؤں  
یہی مقصد مرے پیش نظر ہے  
وفا کی راہ پہ دیکھو سنبھلنا  
غفقر راستہ یہ پُرخطر ہے

غضنفر جاوید غضنفر

سے کم۔  
اب تو گویا ان کے چینل کو پر لگ گئے تھے۔  
ٹاپ پر آگیا تھا۔ تمام نمائندے الٹ رہتے۔ جیسے  
ہی چٹ پٹی خبر آتی نیوز چینل کی زینت بنتی۔ ہانیہ  
کے قاتلوں کی نیوز بھی اس ہی چینل کا کارنامہ تھی۔  
امجد صاحب بہت بڑی تھے۔ وہ دوئی میں اپنا  
چینل لانچ کر رہے تھے۔ پورا ہفتہ ہو گیا تھا۔ سر  
اٹھانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ آج شام کو انہیں ہر  
حال کراچی پہنچنا تھا۔  
• موبائل کی پیپ ہوئی۔

ارے..... نمبر دیکھ کر وہ خوش گوار حیرت سے  
بولے۔  
بولیے جناب آج ہم کیسے یاد آئے۔ دوسری  
طرف شمس تھی۔

امجد میری دو تین دن سے سونیا سے ملاقات  
نہیں ہوئی۔  
تم کیا بے ہوش تھیں۔ امجد کا دماغ بھک سے  
اڑ گیا۔ سونیا کہ معاملے میں وہ ویسے ہی بے حد  
حساس تھا۔

ہو سکتا ہے اپنی فرینڈز کے ساتھ ہو کال کر لیتی  
ہوں۔ شمس جلدی سے بولی۔

میں کال کرتا ہوں اگر کمینشن کی کوئی بات ہو تو  
مجھے کال کر دینا۔ وہ تاکید سے بولے۔

ہاں ہاں میں کر دوں گی۔ کیونکہ شمس دوسرے  
موبائل کی نیل بچ رہی تھی۔

امجد نے کال ملائی اس کا نمبر بڑی تھا۔ ان کو  
اطمینان ہو گیا۔ پھر جو وہ مصروف ہوا تو شام کو سیدھا  
ایئر پورٹ پہنچا۔

”بریکنگ نیوز مزمرہ خیابان شمشیر سے 18  
سالہ لڑکی کی لاش برآمد اس کا چہرہ چھلسا ہوا ہے۔ جس  
کی وجہ سے اس کی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔

رات کو اس کی شناخت کے چیزیں دیکھائی جائیں گی۔“

اسپانسرز کے مبارک باد کے فون آرہے تھے۔ فرحان بے چینی سے باس کا منتظر تھا کیوں کہ امجد صاحب کو سیدھے چینل ہی پہنچنا تھا۔

باس! آج کی ریٹنگ کا تو پوچھے ہی نہیں ہر نیوز ہم نے بریک کی۔ فرحان جلدی جلدی بول رہا تھا۔ مارنگ شو 14 feb کے حوالے سے اور اب بریکنگ نیوز جس میں صبح ملنے والی لاش کی شناخت کی اشیاء اب تھانے سے ہمارا نمائندہ ہی پیش کرے گا۔

یہ..... تھانوں سے یاری تو بڑی مضبوط چل رہی ہے۔۔۔ باس مسکرا کر بولے۔۔۔

سب لفافوں کا کمال ہے۔ فرحان ہنسا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے۔ نیوز روم میں داخل ہوئے۔

فرحان اسکرین پر نظر جمائے۔ مسلسل بول رہا تھا۔

اس کے کپڑے گلے کا لاکٹ، وہ ڈائمنڈ رنگ، فرحان نے کوئی جواب نہ پا کر پیچھے دیکھا۔ تو امجد صاحب بھاگتے ہوئے قدموں سے باہر نکل رہے تھے۔

وہ شتم پشتم تھانے پہنچے۔ وہ ان کی جان سونیا ہی تھی۔ چہرے کا گوشت گل کر غائب ہو چکا تھا ادھر ا جسم ساری کہانی سنار ہاتھا۔

ہمیں فرصت نہیں تھی ناشمہ اپنی بچی کے لیے ہم اس کو وہ پیار اور توجہ نہ دے سکے۔ ابھی اس کو دفنا کر آئے تھے۔ گھر میں سناٹوں کا راج تھا۔ سوائے نوکروں کی کھڑ پٹر کے یاٹی وی پر بار بار چلتی ہوئی بریکنگ نیوز کے جو ان کے دل کے زخموں کو مزید کرید رہی تھی۔ موبائل کی واٹس ایپشن نے ان کو متوجہ

کیا۔ جبکہ شمسہ ہنوز آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

ہنہ! اس کا بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

سرتھانے سے کال آئی ہے کہ کچھ ملزم گرفتار ہوئے ہیں آکر شناخت کر لیں۔ فرحان کا لہجہ بھی خاموش سا تھا۔

تم مجھے پک کر لو۔ انہوں نے قدرے اپنے آپ کو سنبھال ہوئے کہا۔

میں بھی چلوں گی۔ شمسہ بھی کھڑی ہوگئی۔

تم اس کو دیکھ کر قحیر سے بولے اور شمسہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

وہ کوئی اور نہیں اس کا بھتیجا تھا، سگا بھتیجا۔

بہت غور تھا نا اپنے پیسے دولت اور شہرت کا منہ نہیں لگاتے تھے اور وہ تنہاری بیٹی اخ تھونٹے کی حالت میں مدہوش ملی لڑکے کے ساتھ سنسان سڑک کے کنارے اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔

سیدوں کی عزت کوٹھی میں رولتی پھرتی۔

بس بس بکواس بند کر بہت بکواس کر لی۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور شمسہ اور امجد کی آنکھوں سے آنسو۔

یہ میرا اقرار ہی بیان ہے لکھیں۔ زاہد نے انسپکٹر کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ختم کر دیا خاندان کے کلنگ کو۔

اس کا حلیہ اسٹائل ان سب حالات نے مجھے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اب اس کی زبان کے ساتھ ساتھ حشر کا قلم بھی تیزی سے چل رہا تھا۔

فرحان کے موبائل پر آفس سے کال تھی۔ سر آج کے ریٹنگ نے گزشتہ سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ چمکتی آواز منبر کی تھی۔ اس نے کال ڈسکنکٹ کر کے باس کو دیکھا۔ ہائی ریٹنگ کے باوجود وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بلک بلک کر رو رہے تھے۔

□□.....□□

ایک مصنف جب کہانی کی تلاش میں نکلا تو اسے جن مل گیا



## رباط



ایک جن زادے کی ناقابل یقین حیرت انگیز داستانِ حیات

آپ کے پسندیدہ، ہر دل عزیز قلم کار = کاوش صدیقی = کے سحر طراز قلم سے آپ کے لئے

ایک ایسی دنیا کی کہانی جس سے خوف، دہشت، اور تجسس وابستہ ہے

اسے انسانوں سے پیار ہو گیا تھا۔

وہ جن تھا لیکن انسانی دنیا اسے اپنی دنیا سے زیادہ اچھی لگنے لگی۔

جھوٹ، فریب، دھوکہ، جادو ٹونہ اور ہماری دنیا کے ہتھکنڈے۔

وہ جب ہماری دنیا میں داخل ہوا تو کسی بچے کی طرح معصوم تھا۔

۔۔۔ ہم انسانوں نے جن کو بدل دیا۔۔۔

ماہنامہ سچی کہانیاں کی پیش کش

# رجم حتی الموت

~~~~~

وہ سردار کی بیوی تھی اور حالات گواہی

دے رہے تھے کہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے.....

~~~~~

کافی دیر گزر جانے کے باوجود بھی وہ باہر نہیں نکلی تو اسے کچھ تشویش ہوئی وہ بیڈ سے نیچے اترا۔ اس نے بیڈ کے کنارے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے ماربلز پر رکھی اپنی سیلپرز میں پیراڑ سے اور اپنے نائٹ ڈریس کی ڈوری باندھتے ہوئے غسل خانے تک آیا اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ کافی دیر دروازہ پیٹنے کے بعد بھی جب دوسری طرف سے جواب نہ در در ہا تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ باہر کی طرف کھینچا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ غسل خانے اندر سے خالی تھا۔

وہ ایک دم پریشان سا ہو گیا وہ اپنے کمرے سے نکلا اور سفید حویلی کے سارے کمروں میں صالحہ کو تلاش کرنے لگا۔ یہ حویلی اتنی بڑی تھی کہ انسان اکیلا اس حویلی میں کھو جائے۔ ان کی اس پشیمانی حویلی میں وہ صرف دو میاں بیوی ہی رہتے تھے جبکہ ان کے ملازم کے لیے سروٹ کوارٹرز تھے۔ وہ ایک ایک کمرے کے سارے کمروں میں صالحہ کو تلاش کرتا رہا لیکن پوری حویلی تلاش کر لینے کے بعد بھی جب صالحہ اسے

نرم و ملائم بستر پر گہری نیند سوتے سوتے اس نے کروٹ بدلی اور ہاتھ بڑھا کر اپنے پہلو میں لیٹی صالحہ کو خود سے قریب کر کے اپنی ہانہوں میں بھرنا چاہا لیکن بستر پر بھی ریشمی چادر پر اس کا ہاتھ گدگداتا رہا مگر صالحہ کی گرم ہانہوں کا دگداز لیس وہ محسوس نہیں کر سکا۔ اس کی نیند ٹوٹنے لگی اس نے ایک بڑی سی انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے اپنے پتھوں کو اپنی پلکوں کے غلاف سے آزاد کر لیا اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے صالحہ کی جگہ پر دیکھا تو اس کی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اس نے الجھن بھرے انداز میں اپنی آنکھوں کو گڑا۔

وہ پریشانی کے عالم میں اٹھ بیٹھا۔ اس نے غسل خانے کی طرف دیکھا تو وہاں کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسے کچھ تسلی ہوئی اس نے نرم و ملائم ریشمی لحاف اپنے کندھوں تک اوڑھا اور تینکے سے کمر ٹکا کر لیٹ گیا اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی میں ٹائم دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ صالحہ کے غسل خانے سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا لیکن جب



کہیں نہیں ملی تو اس سرد موسم میں بھی پریشانی کے مارے اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکانے لگے۔ وہ باہر پائیں باغ میں آ گیا۔

چاروں طرف خنک ہواؤں میں رات کی رانی کی دلفریب خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سرد ہوائیں اس کے جسم کو کاٹتے ہوئے گزرنے لگیں، اسے اپنا رواں رواں کھڑا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ سردی کے مارے اس نے اپنے دونوں ہاتھ سختی سے باندھ لیے اور زور زور سے گرم سانسیں لیتے ہوئے سردی کچھ کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آسمان پر بے چودھویں کے چاند کی پر شہاب چاندنی چھن چھن کرنی سرسبز گھاس پر یوں ٹھک رہی تھی جیسے زمین پر کسی نے نور کی چادر بچھا دی ہو۔ پائیں باغ میں گلی کیاریوں میں گلاب اور موتیے کے پھولوں پر پڑتی دلفریب چاندنی یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے سمندر کی لہروں میں ہلکولے کھاتے سیپ میں سے موتی نکل رہے ہوں۔ وہ صالحہ کی تلاش میں پائیں باغ کے

عقبی جانب جھولے کی طرف آ گیا۔ یہ جھولا اس نے صالحہ کی فرمائش پر شہر کے ایک بہت بڑے کاریگر سے بنوایا تھا۔ یہ جھولا صالحہ کو بہت پسند تھا۔ وہ اکثر اس جھولے پر پائی جاتی تھی لیکن صالحہ کی تلاش میں یہاں بھی اسے شدید مایوسی ہوئی وہ جھولے پر بھی نہیں بھی اور رات کے تین بجے اسے امید بھی نہیں تھی کہ صالحہ اسے جھولے پر ملے گی۔ وہ پریشانی کے عالم میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ نجانے اتنی رات گئے صالحہ کہاں چلی گئی تھی صالحہ کی گمشدگی کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑنے لگی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے دو دن پہلے کا واقعہ گھومنے لگا جب یونی سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی تو صالحہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھا کہ کسی کام سے اٹھی ہوگی لیکن کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی جب صالحہ واپس نہیں آئی وہ سوچ میں پڑ گیا کہ صالحہ کہاں ہو سکتی ہے کہ اچانک صالحہ



دروازہ کھول کر کمرے میں واپس آ گئی۔ اس کے پوچھنے پر صالحہ نے اسے بتایا کہ اسے کچھ گھبراہٹ ہو رہی تھی لہذا وہ کچھ دیر کے لیے پائیں باغ میں ٹہلنے چلی گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ صالحہ کا لہجہ اس سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے اور وہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے لیکن اس نے کچھ خاص توجہ نہیں دی لیکن آج صالحہ کو پھر سے اپنے بستر پر ناپا کر اس کی رگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ صالحہ کی یہ مشکوک سی سرگرمیاں اسے بہت پر اسرار سی لگ رہی تھیں۔ وہ سگار کا دھواں چاروں طرف اڑاتے ہوئے پریشانی کے عالم میں پورے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ چاروں طرف اپنے گھنے پر پھیلائے رات کے اندھیرے میں اس وادی میں صالحہ کو کہاں ڈھونڈے وہ چاہتا تو اپنے سارے ملازموں کو جگا کر صالحہ کی تلاش میں دوڑا سکتا تھا لیکن اس کے اس عمل سے صالحہ کی بدنامی ہو سکتی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ٹینشن کے عالم میں اس کے ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ اوپر سے سردی اس قدر شدید ہو رہی تھی اسے اپنا پورا جسم جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے الماری سے ایک موٹی سی شال نکال کر خود پر ڈالی اور آتش دان میں پڑے ٹھنڈے انگاروں کو پھر سے سلگا لیا اور آگ کے بلند شعلوں سے اپنے ہاتھ سیکنے لگا اسے اپنی سکرٹی ہوئی بنضوں میں تراوٹ اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے گرم ہاتھ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے چہرے پر ملنے لگا۔ اس کی سردی کچھ کم ہوئی تو وہ پھر سے اٹھا اور سگار پیتے ہوئے ایک بار پھر ٹینشن کے عالم میں پورے کمرے میں ٹہلنے لگا اسے ایک بار پھر دور کہیں سے کسی چھوٹے بچے کی چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کمرے کے ساتھ منسلک بالکنی میں آ کر کھڑا

ہو گیا۔ شرشر رہا ہوا میں اس کے جسم کو کاٹتی ہوئی محسوس ہوئیں اس نے جسم سے لپٹی موٹی شال کو مزید سختی سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اس نے رینگ سے ہاتھ نکائے تو وہ اس قدر ٹھنڈی ہو رہی تھی کہ اسے اپنے جسم میں کرنٹ لگتا ہوا محسوس ہوا اس نے جلدی سے رینگ پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ بلند و بالا پہاڑوں سے گھری وادی نیلم اپنے ہوشربا حسن کے ساتھ چودھویں کے چاند کی پر نور چاندی اوڑھے جت کا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ برف کی چادر اوڑھے پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیاں دھونئیں کے مرغولے کی مانند کالے بادلوں سے نگرانی یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے دودھ کی نہروں سے گرم دھواں نکل رہا ہو پہاڑوں کے درمیان سے گرتے ٹھنڈے میٹھے پانی کے جھرنے نیچے بہتی آبشاروں میں گر رہے تھے جن کی بل کھائی لہروں پر پڑتا چودھویں کے چاند کا عکس یوں لگ رہا تھا جیسے بل کھائی آبشاروں سے نور کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔ نظروں کو فرحت بخشی دور تک پھیلی ہریالی اور شرشر چلتی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ اڑتی اوس کی آواز یوں لگ رہی تھی جیسے محبت کا دیوتا اس جنت نظیر منظر سے بہک کر بانسری بجا رہا ہو قدرت کے حسن سے تراشا یہ منظر اتنا حسین تھا کہ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً یہ دلفریب منظر اپنی نگاہوں کے عکس میں قید کرتے ہوئے وہ خود کو بھول جاتا لیکن اس وقت وہ اتنی ٹینشن میں تھا کہ یہ جنت نظیر منظر بھی اس کی توجہ اپنی جانب نہیں کر پا رہے تھے۔

دفعاً اسے پھر سے کسی نو مولود بچے کی انتہائی چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے بے قراری کے عالم میں اس آواز کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں تو اسے بچے کے رونے کی یہ آوازیں اللہ بخش کی بے رنگ دروغن کچی کوٹری سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ اس کی کوٹری کی بتی بھی جل

رہی تھی۔ اللہ بخش کی کوٹری سے کسی نومولود بچے کی رونے کی آوازیں سن کر وہ تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ سگار اس کے منہ سے نکل کر گر گیا۔ اللہ بخش تیس بیس سال کا ایک بھرپور جوان مرد تھا اور اس کی حویلی کے پائیں باغ کا مالی تھا۔ وہ سارا دن حویلی میں ہی ہوتا تھا اور پائیں باغ کا خیال رکھتا تھا جبکہ رات کا سرمنی اندھیرا پھیلنے ہی وہ اپنی کوٹری میں چلا جاتا تھا اس کی کوٹری پاس میں ہی تھی وہ سرونٹ کوٹری میں نہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی اللہ بخش کی بیوی کسی تنازع کے سبب اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور بچے بھی ساتھ لے گئی تھی جب سے ہی اللہ بخش کوٹری میں اکیلا رہتا تھا لہذا اللہ بخش کے گھر سے آنے والی کسی بچے کی چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں نے اسے کافی حیران کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر آنکھن بھری نظروں سے اللہ بخش کی کوٹری کی طرف دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر بعد فیصلہ کن انداز میں بڑے بڑے قدم اٹھاتا حویلی سے نکل گیا، پائیں باغ عبور کر کے جب وہ باہر آیا تو خون جمانی سرد ہواؤں کے پھیڑوں نے اس کا سوا گت کیا وہ بری طرح سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے گرم شال اپنے گرد اچھے سے لپیٹ لیا اللہ بخش کی کوٹری کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ کوٹری کے نزدیک آتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس بچے کے رونے کی آوازیں بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ کوٹری کے پاس آیا تو کواڑ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا۔ اندر بہت آشناسی آواز آرہی تھی جو اس بچے کو بہلا رہی تھی۔ اس نے جھری سے جھانک کر اندر دیکھا تو اندر نظر آتے منظر نے اسے ساکت کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہو اندر کمرے میں صالحہ اس بچے کو سینے سے لگائے بہلا رہی تھی۔

”چپ ہو جا میرے بچے میرے لال، میرے جگر کے ٹکڑے کیوں رو رہے ہو میری جان۔“ صالحہ

”یہ لیجیے سرداری جی، بڑی مشکل سے بکری کے تھنوں سے یہ تھوڑا سا دودھ نکال کر لایا ہوں۔“ اللہ بخش نے ایک پیالہ صالحہ کی طرف بڑھایا جس میں تھوڑا سا دودھ تھا اور وہ پیالہ اسے دے کر وہاں سے چلا گیا صالحہ نے پاس رکھی فیڈر جیسی کسی چیز میں وہ دودھ ڈالا اور اس بچے کے منہ سے لگا دیا۔ فیڈر منہ سے لگتے ہی وہ بچہ ایک دم چپ ہو گیا اور مزے سے دودھ پینے لگا۔ صالحہ محبت بھرے انداز میں اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے کے مارے اس کی رگوں میں لہو جوش مارنے لگا۔ اس نے ایک زوردار لات مار کر دروازہ کھولا۔ اس کی اس حرکت سے صالحہ ایک دم ڈر کے مارے اچھل پڑی۔ اس نے جیسے ہی خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا تو غیر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے دیکھ کر صالحہ کے چمکتے ہوئے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ صالحہ خوف کے مارے خود میں سیٹھنے لگی ہو۔ وہ غصے کے مارے کانپتے ہوئے بڑے بڑے قدم اٹھاتا صالحہ کے پاس آیا اور رکھ کر ایک زوردار پھپھر اس کے منہ پر پھینچ مارا۔

بے غیرت، بے حیا عورت ارے اپنے مجازی خدا کو اتنا بڑا دھوکہ دیتے ہوئے تجھے شرم نا آئی۔“ وہ

میری محبت میں میری وفاداریوں میں کون سی کمی رہ گئی تھی جو.....“ صالحہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلا کی سرد مہری تھی۔ صالحہ کی بات پر اس کے خون میں ایک بار پھر ہال آ گیا۔ وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کے پاس آیا اور سختی سے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔

”بکواس بند کر! ایک تو چوری کرتی ہے اوپر سے سینہ زوری کرتی ہے۔“ اس نے قہر بار نظروں سے صالحہ کو گھورتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ التعلقی سے خلاؤں میں دیکھتی رہی۔

”کتنی محبت دی میں نے تجھے، کتنا پیار دیا۔ کیا کمی تھی میری مردانگی میں جو تو نے اس غریب بد صورت مالی سے خفیہ آشنائی بڑھائی۔ جو تو نے اسے مجھ پر فوقیت دی۔ جو تو نے میرا بستر اس کے ساتھ بانٹا بول صالحہ بول۔“ اس نے طیش کے عالم میں ایک زور دار ٹھوک صالحہ کی پسلی پر ماری، وہ درد سے دھری ہوتے ہوئے پہلو کے بل زمین پر گری۔ اس کی کہنی ایک بار پھر سنگ مرمر سے ٹکرانی درد کی ایک شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنناٹا ہٹ دوڑا گئی۔ اس نے اپنے ہونٹ پھینچ لیے۔ اس نے اپنے منہ سے درد دھری آہ نہیں نکلنے دی۔

”بہی سوال میرا بھی ہے کتنی محبت دی میں نے آپ کو، کتنا پیار دیا، میرے حسن و زناکت میں آخر کون سی کمی رہ گئی تھی جو آپ نے۔“ صالحہ نے ہلکے سے سسکتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، صالحہ کی اس زومعنی بات پر نجانے کیوں اسے جھرجھری سی آگئی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے نقوش پھر سے تن گئے۔

”میں نے کہا نا کہ مجھ سے زیادہ زبان مت چلا ایک تو گناہ کرتی ہے اوپر سے شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا مجھے ہی تیور دکھاتی ہے۔“ اس نے ایک انتہائی نفرت بھری نگاہ صالحہ پر ڈالی اور انتہائی

غصے سے دھاڑا۔ اس کے یوں چیخنے پر وہ بچہ بھی بری طرح ڈر گیا اور فیڈر منہ سے نکال کر ایک بار پھر چیخ چیخ کر رونے لگا جبکہ اس کی اس بات پر صالحہ کے لبوں پر استہزاء سیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شرم تو آپ کو بھی نہیں آئی تھی۔“ صالحہ کے یوں ڈھٹائی سے کہنے پر وہ اندر تک سلگ اٹھا۔

”بکواس بند کر اپنی بے غیرت! اس اللہ بخش کو تو میں صبح سنگسار کروں گا، ابھی تجھے تیرے اس گناہ کی سزا تو دے دوں، چل میرے ساتھ حویلی..... چل۔“ اس نے انتہائی جارحانہ انداز میں صالحہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ وہ ننھا سا معصوم بچہ ابھی تک صالحہ کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ وہ بڑا سا پائیں باغ عبور کر کے صالحہ کو حویلی میں لایا اور ہال میں لا کر ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سنگ مرمر سے تراشی گئی زمین پر بری طرح گری۔ اس کی کہنی بھی چھل گئی لیکن اس نے سختی سے اس بچے کو اپنے سینے سے بچھین لیا۔ اس بچے کو اس نے ایک آنچ تک نہیں آنے دی۔ اس کی اس متا بھری محبت پر وہ اندر تک سلگ اٹھا اس نے انتہائی غصے سے صالحہ کے ہاتھ سے اس بچے کو جھپٹا اور انتہائی بے رحمی سے اس ننھے سے بچے کو صوفے پر پٹخ دیا۔ وہ بچہ اور زور زور سے گلا پھاڑ کر رونے لگا۔

”کیوں کیا تو نے ایسا بول کیوں دیا تو نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ ارے کیا کمی رہ گئی تھی میری محبت میں، میری وفاداریوں میں جو تو نے حرام کی طرف منہ مارا۔“ اس نے انتہائی نفرت بھری نظروں سے صالحہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے کے مارے سرخ ہو رہی تھیں، صالحہ ابھی تک سنگ مرمر سے تراشی گئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی اس بات پر صالحہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رہ گئی۔

”یہ شکوہ تو میرے دل میں بھی پنپ رہا ہے کہ

غارت سے اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”نجانے کب سے یہ چکر چل رہا ہے، نجانے لب سے تو اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے ہر امستر بانٹ رہی ہے۔ یقیناً اس حرام زادے کی بیوی کو اس کی بدکاریوں کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا جیسی وہ یوں اچانک اسے چھوڑ کر چلی گئی۔“ اس نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اپنی ناک پھلائی اور انتہائی نفرت سے اپنی گردن کو جھٹکا دیا۔

”سردار آفتاب ذوالفقار کی بیوی تو یہ بھی نا کر سکی۔“ صالحہ نے انتہائی سردمہری سے ایک ٹھنڈی سانس بھری جواباً وہ ایک بار پھر اندر تک سلگ گیا۔ وہ کسی پھرے ہوئے شیر کی طرح صالحہ کے پاس آیا اور اس کے منہ پر دو تین زناٹے دار پھیر کھینچ مارے وہ انتہائی لائقیت سے خلاؤں میں دیکھتی رہی۔ صالحہ کے گال پر اس کی سفاکیت کے لال نشان پڑ گئے تھے۔ وہ بچہ صونے پر بڑا اس کی تہر بار دھاڑوں سے رکا رہی تیک جیج جیج کر رو رہا تھا۔ اس بچے کے رونے کی چھٹی ہوئی آوازیں اسے اور طیش دلا رہی تھیں۔

”تجھ سے تو میں بعد میں بنوں گا پہلے اس حرام کے جنے کا بیٹا تو دبا دوں۔“ وہ کسی زخمی ناگ کی طرح اس بچے کی طرف بڑھا، صالحہ ایک دم تڑپ اٹھی اس نے کسی بے حس سفاک حیوان کی طرح اپنے ہاتھ اس بچے کے گلے پر رکھے اور اپنے ہاتھوں کا دباؤ اس کے گلے پر بڑھانے لگا کہ اچانک اس کی نظر اس بچے کے چہرے پر پڑی اس بچے کے معصومانہ نقوش اسے بہت آشناسے لگے وہ بچہ جیج جیج کر روتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹانے لگا اسے ہی دیکھ رہا تھا نجانے کیوں اسے اپنی بیوی کے اس گناہ پر بہت پیارا آیا اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ

لیے۔

”مجھے تو شادی کے پانچ سال گزر جانے کے باوجود بھی تو اولاد کی خوشی نا دے سکی اور اس حرام زادے کو یہ حرام خوشی لکٹی آسانی سے دے دی تو نے۔ اس نے گردن موڑ کر انتہائی متغیر نظروں سے صالحہ کو دیکھا۔ وہ جتنا ہی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ صالحہ کی نظروں میں اس کے لیے اتنی سردمہری تھی کہ وہ زیادہ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھ نہیں سکا۔

”میں تو سمجھتا تھا کہ تو بانجھ ہے لیکن نہیں تو بانجھ نہیں ہے۔“

”سہی کہا مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ آپ بانجھ ہیں لیکن نہیں آپ بھی بانجھ نہیں ہیں۔“ صالحہ نے انتہائی نفرت سے کہہ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا، صالحہ کی بات نے اس کی رگوں میں ایک بار پھر خون کا دورانیہ بڑھا دیا۔ وہ کسی پھرے ہوئے شیر کی طرح آیا اور صالحہ کے بال اپنی منگھی میں جکڑ کر دو تین کرارے پھیر اس کے منہ ہی منہ پر کھینچ مارے۔ اس کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ صالحہ نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں بلا کی ویرانی تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے ایک بار پھر اندر تک اسے سلگا دیا۔ اس نے انتہائی نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”تجھے کیا لگتا ہے کہ میری بیوی ہونے کی وجہ سے تو سزا سے بچ جائے گی کیا؟ سردار ذوالفقار کا اکلوتا وارث ہوں میں ان کی گدی کا تخت نشین اس وادی کا سردار جس سے گاؤں والے اپنے فیصلے کروانے آتے ہیں جو ان کے درمیان سیاہ سفید کا گناہ اور ثواب کا جزا اور سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ میری بیوی ہونے کے باعث تو اس سزا

سے بچ جائے گی جو زنا جیسے گناہ کبیرہ کے بدلے تیرے حصے میں آتی ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ میری محبت تجھے اس سزا سے بچالے گی۔“ اس نے صالحہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انتہائی لائق اور نفرت سے کہا، صالحہ کی آنکھوں میں چھائی سرد مہری مزید گہری ہو گئی۔ اس کے لبوں پر ایک بار پھر سستی ہوئی مسکراہٹ ریگ گئی۔

”مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے، جب میری محبت آپ کو۔“ صالحہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی اور ایک لائق سی نگاہ اس پر ڈال کر خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

”جب سردار آفتاب کی رفاقت مجھے نارسائی اور رسوائی سے نہیں بچا سکتی تو سزا سے کیسے بچا سکتی ہے سزا تو مجھے ضرور ملے گی آپ کی بیوی ہونے کی ہی سزا۔“ صالحہ نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے انتہائی اجنبی لہجے میں کہا۔ وہ گردن موڑ کر انتہائی نفرت بھری نظروں سے صالحہ کو دیکھنے لگا۔

”شادی شدہ ہو کر جو تو نے زنا جیسا گناہ کبیرہ کیا ہے اس کی سزا اسلام میں سنگ ساری ہے لیکن میں جانتا ہوں تو اسی بات پر اتنا اکر رہی ہے ناکہ تو سردار رئیس احمد بیگ کی بیٹی ہے اور اگر میں نے تجھے سنگسار کیا تو سردار رئیس احمد بیگ اس جنت نظیر وادی نیلم کو پاتال بنادے گا۔“ اس نے ایک انتہائی عصبیلی نگاہ صالحہ پر ڈالی جو ابھی تک زمین پر درود کی تصویر بنی بیٹھی ہنوز انتہائی لائق سے خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میں بھی سردار ذوالفقار کا بیٹا ہوں تیرے اس گناہ کو میں اتنی آسانی سے معاف نہیں کروں گا“ تجھے ایسی دردناک سزا دوں گا کہ تیرے فرشتے تک یاد رکھیں گے۔ قیامت تک تیرے قدم گناہ کی طرف بڑھ نہیں سکیں گے تو یاد رکھے گی کہ تو نے وادی نیلم کے سردار آفتاب

ذوالفقار کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے قہر بار سرخ نگاہوں سے صالحہ کو گھورا اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے قضا کی بیٹھک میں چلا گیا جہاں وہ گاؤں والوں کے مابین جھگڑوں اور مسئلے مسائل کے فیصلے کیا کرتا تھا وہاں سے وہ اپنا چڑے کا کوڑا اٹھا کر لایا اور صالحہ کے رو برو آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سانپ کی مانند بل کھاتے چڑے کے کوڑے کو زور سے جھٹکا دیا فضا میں چھائی پر اسراسری خاموشی میں سانپ کے پھنکار کی وحشت زدہ سی آواز پیدا ہوئی۔

”تیرے باپ کی سرداری نے پتھروں سے تو بچا لیا تجھے لیکن سردار آفتاب ذوالفقار کی بیوی ہو کر جو بدکاری تو نے کی ہے اس کے سو کوڑوں کی سزا سے تجھے کوئی نہیں بچا سکتا، اس شرعی سزا سے تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ اس نے اپنی خون رنگ آنکھیں صالحہ کے جسم پر گاڑتے ہوئے ایک بار پھر زور سے کوڑے کو جھٹکا دیا، فضا میں ایک بار پھر سانپ کے پھنکار کی وحشت زدہ آواز گونج اٹھی۔

”مجھے آپ کی بیوی ہونے کی سزا سو کوڑے ملے گی لیکن آپ کی سزا پتھر ہی ہوگی، نو کیلے پتھر۔“ صالحہ نے وحشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ہلا کی کاٹ تھی وہ نفرت بھری نگاہیں صالحہ کے جسم پر گڑائے اسے دیکھتا رہا، اس نے چار انگلیوں سے کوڑا پکڑا اور چڑے کا وہ کوڑا صالحہ کے جسم پر برسائے لگا، ایک ہی کوڑے سے وہ بری طرح پھلتے ہوئے دور جا گری، اس کے کپڑے پھٹ گئے جہاں سے خون رسنے لگا، اس نے درد کے مارے اپنے ہونٹ بھیجنے لیے اپنی عزیز بیوی کو یوں درد سے تڑپتا دیکھ کر اس کے ہاتھوں میں لغزش ہونے لگی۔ پہلی بار کسی مجرم کو شرعی سزا دیتے ہوئے اس کے جسم پر کوڑے برساتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ میں کپکپاہٹ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے زور سے جھٹکا دے کر صالحہ کے جسم پر دوسرا کوڑا

## اک سوال

کب ذہن کو میرے یہاں تسکین ملے گی  
کب ہستی کو پہچان اور ايقان ملے گی  
اس کائنات میں اب  
میں کھوجتا ہوں جس کو  
کیا توڑ کر حصار زمیں پر وہ ملے گی  
تم کو میں سمجھوں اپنا  
حق بھی جو جتاؤں تو  
دنیا کو کیسے، کیوں یہ جاگیر ملے گی  
جب ٹوٹے گا بندھن یہ.....

روح اور جسم کا  
بس اک سوال باقی ہے اب بھی ذہن میں یہ  
کیا تب مری ہستی کو تسکین ملے گی

آدرش

تراشے گئے در و دیوار سے نوے لپٹ گئے پائیں  
باغ میں لگا جھولا اس دردناک چیخوں سے تڑپ کر  
خود بخود ملنے لگا۔

”شکر کر تیری عزت رکھ لی میں نے اپنی بیوی  
ہونے کا خیال کر کے تجھے یہ سزا اکیلے میں دے رہا  
ہوں میں ورنہ پورا گاؤں سردار کی بیوی کے گناہ کی  
سزا کا تماشا دیکھتا۔“ اس نے ایک اور زوردار کوڑا  
کھینچ کر صالحہ کے جسم پر مارا وہ درد کے مارے بری  
طرح بلبلاتے ہوئے چیخنے لگی۔

”آپ بھی شش، شکر کریں کہ میں نے  
آ..... آپ کی عزت رکھ لی۔ ورنہ آ..... آپ کی  
سس، سزا کا تماشا بھی پورا گاؤں دیکھتا۔“ اس نے  
درد کے مارے بری طرح تڑپتے ہوئے رک رک کر  
کہا۔ صالحہ کی اس بات نے ایک بار پھر اسے سلا

برسایا۔ وہ ایک بار پھر درد سے مچلتے ہوئے دور جا  
گری، اس کے جسم سے خون بہنے لگا۔ اس بار وہ اپنی  
درد بھری سسکیاں نکلنے سے روک نہیں سکی۔

”بولو..... بولو کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتی  
ہوں، بولو کہ آج کے بعد تم یہ گناہ کبیرہ کبھی نہیں  
کرو گی۔“ اس نے پہلے کی نسبت کافی نرم لہجے میں  
کہا۔ صالحہ کو یوں درد سے تڑپتے دیکھ کر خود اس کا دل  
بھی دکھ رہا تھا۔ صالحہ درد کے مارے بری طرح  
تڑپتے ہوئے اپنا سر زور زور سے نفی میں ہلانے  
لگی۔ صالحہ کی اس ڈھٹائی پر اس نے کھینچ کر ایک اور  
زوردار کوڑا صالحہ کے جسم پر دے مارا۔ اب کی بار درد  
اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح  
تڑپتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ اس کا جسم  
نیلگوں ہو گیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ درد  
سے بری طرح تڑپتے ہوئے اس طرح مچل رہی تھی  
جیسے کسی مچھلی کو آب سے نکال کر زمین پر پھینک دیا ہو۔

”بولو صالحہ کہ آئندہ کے بعد تم زنا جیسا گناہ  
کبیرہ کبھی نہیں کرو گی، تم اپنی بدکاری سے توبہ کرتی  
ہو۔“ اس نے کوڑے کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے  
ایک بار پھر چیخ کر کہا۔

”نن..... نہیں..... مم میں نہیں، کک، کہوں گی،  
میں نن..... نہیں کہوں گی۔“ صالحہ زمین پر بے سدھ  
سی پڑی بری طرح اٹکتے اٹکتے بولی۔ درد کے مارے  
اس کی سانسیں بری طرح سے پھول رہی تھیں۔ اس  
سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”ڈھیٹ عورت ایک تو گناہ کرتی ہے اس پر توبہ  
کرنے سے بھی انکار کرتی ہے۔“ صالحہ کی اس  
ڈھٹائی پر اس کا خون کھول اٹھا اس نے پوری طاقت  
سے چمڑے کا کوڑا صالحہ کے نازک سے جسم پر دے  
مارا، اس کی دھراش چیخیں سفید حویلی میں گونجنے لگیں  
اس کی ان دردناک چیخوں سے سنگ مرمر سے

ہو گیا۔

”مم..... میرے بچے..... میری زندگی، میری جان مجھے معاف کر دے۔ تیری ماں نے تجھے خود سے دور کر کے بڑی تکلیف دی نا تجھے لیکن اب نہیں۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی میرے منے۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گی پھر لوگ مجھ کنواری کی گود میں بچہ دیکھ کر مجھے بدکردار کہیں تو کہیں۔ سردار جی مجھ زانی کو سو کوڑے ماریں تو ماریں۔ لیکن اس کنواری کو حاملہ کر دینے والے بدکردار سردار کو سنگسار کرنے کے لیے پہلا پتھر میں ہی ماروں گی۔“ اس گولن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی زہریلے لفظوں سے کہا۔

اس پر کچکی سی طاری ہو گئی کوڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ سر جھکائے سنگ مرمر سے تراشی زمین کو دیکھنے لگا جو صالحہ کے مظلوم خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کا ہمت سے دل چاہا کہ یہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے وہ صالحہ کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا اس میں ہمت ہی نہیں تھی صالحہ کی طرف دیکھنے کی لیکن وہ درد سے بلبلاتی صالحہ کی مسخر بھری نگاہیں خود پر جمی محسوس کر سکتا تھا۔

”لوگوں کے چھپتے ہوئے سوالوں سے بچنے کے لیے آپ کے گناہ کی یہ نشانی میں نے آپ کے پائیں باغ کے جھولے میں ڈال دی تھی کہ اپنی ناجائز اولاد کو آپ خود پالیں اور اندھیری رات میں کیے جانے والے گناہ کا حساب بھی آپ خود دیں لیکن اپنے بچے کے رونے کی یہ دردناک چیخیں ایک ماں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنے بچے سے مزید دوری برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنے بچے کو لے کر جا رہی ہوں اور ہاں میں سردار نی نہیں ہوں جو آپ کے گناہ کے سو کوڑے برداشت کر لوں۔ مجھ پر یہ کوڑا اٹھانے سے پہلے خود پتھروں کے لیے تیار رہیے گا

دیا، وہ چڑے کا مظلوم کوڑا صالحہ کے جسم پر برساتا رہا اور اس کی دلخراش چیخوں سے چاندنی میں ڈوبی نیلم کی ٹھیری ہوئی پرسکون جھیل کا پانی بھی تڑپتے ہوئے اچھلنے لگا۔ چودھویں کا پر شباب چاند بھی سمٹتے ہوئے گہرے کالے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا اور سیاہ بادلوں نے ڈرتے ہوئے برف سے ڈھکی پہاڑ کی بلند چوٹیوں میں خود کو سمیٹ لیا۔ وہ بے دردی سے صالحہ کے جسم پر چڑے کا مظلوم کوڑا برساتا رہا۔ وہ درد سے بری طرح چیختی رہی تڑپتی رہی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے اس کے جسم سے بہتے خون نے زمین پر تراشے گئے خوبصورت سنگ مرمر کو لہورنگ کر دیا۔ اس نے اپنی دونوں پنڈلیوں کو آپس میں ملا لیا۔ اپنے ہونٹوں کو آپس میں بٹھینچ لیا۔ صالحہ کی رکتی ہوئی سانسیں دھونکی کی مانند چل رہی تھیں۔ اس کی دردناک چیخوں سے تڑپ کر وہ بچہ بھی پھر سے چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ننانوے کوڑے صالحہ کے نرم و نازک جسم پر برسا کر وہ خود بھی بری طرح سے ہانپنے لگا تھا۔ اس نے آخری کوڑا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا کہ ایک جھٹکے سے حویلی کا کھلا دروازہ عبور کر کے شاداں گولن بے قراری کے عالم میں بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس کے ہاتھ میں خون سے رنگا کوڑا اور ہال کے پیچوں بیچ زخموں سے چورخونم خون صالحہ کو دیکھ کر اس کی دبی دبی چیخ نکل گئی اس نے صدمے کے عالم میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”یہ..... سس..... سردار نی صاحبہ کو یہ سردار جی یہ..... یہ سب کیا۔“ ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملوں میں بولتے بولتے جیسے ہی اس کی نظر صوفے پر روتے اس بچے پر پڑی جو صوفے کے کنارے بس گرنے ہی والا تھا تو اس کی ایک دم چیخ نکل گئی وہ سب کچھ بھول بھال کر اس بچے کی جانب لپکی اور اسے گود میں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بچہ اس گولن کی گود میں آتے ہی فوراً روتے سے چپ



سردار صاحب۔۔۔ اس گولان نے انتہائی زہریلے لہجے میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور اپنے بچے کو سینے سے لگا کر چلی گئی۔ صالحہ کی دہلی آہیں ابھی بھی اسے سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا سر اس حد تک جھکا ہوا تھا کہ اسے اپنی گردن دکھتی ہوئی محسوس ہونے لگی لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اپنا جھکا سر اب کبھی اٹھا نہیں سکے گا۔ وہ ابھی تک اس حسرت سے زمین کو دیکھ رہا تھا کہ زمین چھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اتنے میں اسے پھر سے کھلے دروازے سے ہال میں کسی کے داخل ہونے کی چاپ سنائی دی۔

”س۔۔۔۔۔ سردار جی یہ۔۔۔۔۔ یہ آپ نے۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔“ صدے سے بوکھلائی ہوئی یہ آواز اللہ بخش کی تھی۔ وہ یقیناً صالحہ کو زخمی حالت میں دیکھ کر صدے میں آ گیا تھا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں سردار جی، سردار جی جی بے تصور ہیں ان کے اور میرے درمیان ایسی کوئی خفیہ آشنائی نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں اور وہ بچہ بھی سردار جی کا نہیں ہے۔ وہ بچہ تو مجھے پائیں بارخ میں جھولے پر رکھا ہوا ملا تھا ساتھ ہی ایک خط بھی تھا۔ میں تو پڑھنا لکھنا جانتا نہیں ہوں۔ سردار جی جی نے خط پڑھا اور مجھے کہا کہ وہ بچہ میں اپنی کوٹری میں لے جاؤں میں اکبلا رہتا ہوں۔ اس بچے کا کھانے پینے کا خرچہ سردار جی جی مجھے دے رہی تھیں۔ وہ تو رات میں وہ بچہ بہت بری طرح رونے لگا تھا۔ اس کا دودھ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ کسی طرح میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا تو سردار جی اس بچے کو بہلانے میری کوٹری میں آ گئی تھیں۔

”اللہ بخش نے جلدی جلدی صالحہ کی صفائی دی۔ اپنی نیک دل سردار جی کو یوں ناحق اتنی سخت سزا سے تڑپتے دیکھ کر اللہ بخش کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے اللہ بخش کو جانے کا کہا۔ ذرا سی دیر میں

اسے اللہ بخش کے قدموں کی چاپ دور جاتے ہوئے سنائی دی۔ وہ چلا گیا تھا۔ کچھ دیر ان دونوں کے درمیان بہت سوگوار سی خاموشی چھائی رہی، تھوڑی دیر بعد صالحہ درد سے بری طرح کراہتے ہوئے اٹھی اور اپنے زخمی جسم کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے اس کے پاس آ گئی۔ وہ بڑی مشکل سے زمین پر جھکی اور بری طرح کراہتے ہوئے کوڑا اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ کا ایک کوڑا رہ گیا۔۔۔۔۔ آپ اپنی سزا پوری کریں گے یا پھر اس ایک کوڑے میں لپٹے ہزاروں نوکیلے پتھر خود پر برس کر غیرت کی زمین میں خود کو گاڑھ لینا پسند کریں گے۔“ صالحہ نے دھیمی آواز کے ساتھ لیکن بہت چپختے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ وہ اپنی تکبر سے اکڑی گردن میں جھول دے کر اپنی انا کا خل مسمار کر کے صالحہ کے قدموں میں گرا اور اس کے پیر پکڑ لیے۔

”مجھے سنگسار کر دو صالحہ۔۔۔۔۔ اللہ کے واسطے مجھے اپنے ہاتھوں سے سنگسار کر دو۔“ وہ صالحہ کے پیروں سے لپٹا بری طرح گڑ گڑانے لگا۔ صالحہ استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگی۔

”آپ کو سنگسار کرنے کے لیے ضمیر کے وہ نوکیلے پتھر ہی کافی ہیں جو اپنے بوجھ سے آپ کو زمین کی اتار گہرائیوں میں گڑا دیں گے۔“ صالحہ نے اس کے ہاتھوں سے اپنے پیر چھڑائے اور درد کے مارے گھسٹتے گھسٹتے وہاں سے جانے لگی۔ وہ اپنے بال نوچتے ہوئے چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس کے رونے کی درد بھری آوازوں سے حویلی کے نوحہ کنناں درد دیوار پر سکون ہو گئے۔ اس نے پاس پڑا کوڑا اٹھایا جس کے چمڑے پر صالحہ کا خون اور گلابی کھال چپکی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی بے دردی سے وہ کوڑا خود پر برسانے لگا اور اس کی دھراش چیخوں سے وادی نیلم کی جھیل کا اچھلتا پانی پُر سکون ہو گیا۔



## کڑوا سچ

مصنفہ کی یہ تحریر دوشیزہ 83ء میں شائع ہوئی

مصنفہ کی یہ تحریر دوشیزہ 83ء میں شائع ہوئی

نہیں ہو سکا تھا لیکن ان پھولوں کی مہک اماں بی نے نہ جانے کیسے محسوس کر لی تھی۔ گھر میں بڑی اولاد پر یا تو بہت پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں یا اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ساریہ بھی پہلوی کی اولاد تھی۔ اس لیے اماں بی نے اس پر پابندیوں کے سارے تجربے آزمانے شروع کر دیے تھے۔

بابو جی کٹر مذہبی بندے تو نہ تھے مگر صوم و صلوة کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی بے جا آزادی کے بھی مخالف تھے۔ اماں بی ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔ ساریہ کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی ایسی 'پکی سیلی' بنائے جو ساریہ کے گھر آئے یا اس کے گھر وہ جاسکے۔ بس اس کی دوستی صرف اسکول تک محدود تھی۔ بڑی ہوئی تو عام لڑکیوں کی طرح اسے بھی اپنی صورت پیاری لگنے لگی۔ وہ خوب صورت آنکھیں جن میں گھائل ہرنی کی سی تڑپ تھی اسے اپنے چہرے پر بہت پسند تھیں۔ انہیں مزید خوب صورت کرنے کے لیے اگر کبھی وہ صبح اسکول جاتے ہوئے کاجل کے ڈورے کھینچ لیتی تو اماں بی کہتیں۔

”کاجل کیوں لگایا؟“

تاشی کئی بار ساریہ کو بلائے آپچی تھی مگر اس نے دروازہ نہ کھولا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اماں بی کا سامنا کرتی۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ستار ہا تھا کہ اماں بی کیا سوچتی ہوں گی؟ اتنا چھوٹا ظرف تھا میرا جو اتنی جلدی چھلک گیا۔

ساریہ نے اپنا چختا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا لیکن اسے پیچھتاوے اور سوچوں سے نجات نہ مل سکی۔ اس کے اندر کی لڑکی بار بار اسے سمجھاتی تھی کہ پیچھتاؤ افضول ہے ساریہ تم نے جو کہا سچ ہی تو کہا تھا۔ آخر جسم و دل کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں امگلوں اور آرزوؤں کو تھپک تھپک کر وقتی طور پر تو سلایا جاسکتا ہے مگر وہ ہمیشہ کے لیے نہیں سوتیں۔ ماضی کا ایک چھوٹا سا کنکر خوابیدہ آرزوؤں کو جگانے کے لیے کافی ہوتا ہے پھر تم اپنے آپ کو قصور وار کیوں سمجھتی ہو؟ لیکن یہ دلیلیں بھی اسے مطمئن نہ کر سکیں اور وہ یادوں کی گھم گھمائیوں میں ڈوبنے لگی۔

اس کے بچپن نے جوانی کو کب آواز دی تھی اور دل کے دالان میں خواہشوں کے خوش رنگ پھول کب مہکنے شروع ہوئے تھے۔ اسے تو یہ احساس ہی

گلہری کی طرح رہتی۔ اس طرح اس نے اپنے خول میں سمٹے ہوئے میٹرک کر لیا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے اماں بی کی خواہشوں کی پابند رہی تھی۔ اس لیے اماں بی نے کہا کہ کالج میں پڑھو تو اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اماں بی نے ایک نصیحت پہلے باندھ دی۔

”بیٹا سر جھکا کر جاؤ اور سر جھکائے گھر واپس آؤ شریف لڑکیوں کا یہی چلن ہے۔“ چنانچہ کالج آتے جاتے سارے نے کبھی بلاوجہ سر نہ اٹھایا بس اسٹاپ پر بھی اس کی نظریں صرف اس طرف اٹھتیں جہاں سے بس کو آنا ہوتا تھا۔ کسی لڑکے کو نظر بھر کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لگتا کسی نہ کسی جگہ سے اماں بی اس کی یہ حرکت ضرور دیکھ رہی ہوں گی۔ کالج میں بھی اس کی صرف انجم ہی دوست تھی کیونکہ انجم کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔ واپسی پر ساریہ انجم ہی کے ساتھ آتی جبکہ جاتے وقت عاصم بس اسٹاپ تک

”یو نہی اماں..... سب لڑکیاں لگاتی ہیں۔“ وہ معصومیت سے کہتی۔  
 ”بس کو دکھانا ہے اسکول پڑھنے جاتی ہو یا فیشن دکھانے..... بس مت جاؤ۔“  
 اور ایسا کئی بار ہوا کہ اس نے کبھی کا جل لگا لیا یا داند سے سے ہونٹ رنگین کر لیے تو اماں بی نے فیشن کا فتویٰ صادر کر کے اسکول جانے سے روک دیا۔ وہ جو فراک اسکول پہن کر جاتی اس قدر ڈھیلا ہوتا کہ لڑکیاں ہنستے ہوئے کہتیں۔  
 ”لگتا ہے ساریہ تم کسی اور کا فراک پہن آئی ہو۔“

تنگ موری کے پانچوں کی شلوار کا فیشن ہوتا تو اماں بی اسے کھلے پانچوں کی شلوار پہنتیں اور کھلے پانچوں کا فیشن ہوتا تو اس کے پانچے اتنے تنگ ہوتے جیسے چوڑی دار پا جامہ اماں بی اسے فیشن سے الٹ ہی چلائی تھیں اور وہ احساس کمتری کے مارے کلاس میں کسی سے بات ہی نہ کرتی ہمیشہ سہمی ہوئی



چھوڑ آتا اور جب تک وہ بس میں سوار نہ ہو جاتی کھڑا رہتا کہ یہ اس کی اماں بی کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ ایک روز وہ کالج کے اسٹاپ پر اتری تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا تنفس تیز ہو گیا۔ وہ دوبارہ پیچھے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کالج کیمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔ واپسی پر انجم ساتھ تھی اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں اس لیے صبح پیچھے آنے والا شخص اب نہیں تھا۔ پھر تو یہ روزانہ کا معمول ہو گیا۔ ایک لڑکا ساریہ کا تعاقب کرنے لگا۔ مارے گھبراہٹ کے ساریہ کا دل چڑیا جتنا ہو گیا تھا۔

کالج فائل سینے سے چمٹائے بدن کی عمارت میں دھڑ دھڑاتے دل کو وہ قابو پس کرنے کی سعی کرتی رہتی اور اسی فائل پر لگے کارڈ کے طفیل اس لڑکے نے ساریہ کا نام اپنے دل کی سلیٹ پر نوٹ کر لیا نہ جانے کیوں گھبرائی گھبرائی سی ساریہ مقصود عمر حیات کے دل میں آن بسی تھی۔

پھر وہ جو عمر حیات کے تعاقب سے گھبرائی اور سہمی کبوتری بن جاتی تھی۔ بس اسٹاپ پر اتری تو عمر حیات اپنی آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں بسائے اسے دیکھ رہا ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی روشنی ہوتی کہ فاصلے فاصلے کے باوجود ساریہ کی آنکھیں چندھیا جاتیں اور قدم لڑکھڑا جاتے۔ وہ اپنے قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر تو قابو پالیتی لیکن دل کی اتھل پتھل دھڑکنیں خاصی دیر بعد اعتدال پر آتیں۔ وہ اسے آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا تھا۔ ساریہ کو اس کا پیچھے پیچھے چلنا بہتہ بھاتا جو اس کے قدموں پر چلتے ہوئے اپنی منزل تلاش کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ خواہشوں کے فاصلے جوق در جوق دل کی بنجر زمین پر اترنے لگے اور بہت جلد وہاں محبت کی کھیتی لہلہانے لگی۔

اب تو لڑکیوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ

خوبصورت سا لڑکا جس کے لب مونچھوں تلے مسکاتے رہتے ہیں۔ اسے کس کا انتظار رہتا ہے۔ وہ واقعی ایسا تھا کہ اس کے لیے کئی دل دھڑکتے تھے مگر اس کا دل صرف اس گھبرائی گھبرائی سی لڑکی پر آیا تھا جو بڑی سی چادر میں اپنے وجود کو چھپا کر سب سے بے پروا اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ راہ چلتے ہوئے ہنسانہ ادھر ادھر دیکھنا یہی باتیں تو اسے پسند تھیں۔ وہ ہر طرح ساریہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا اور اسے پانے کی خواہش میں خود کو کھو رہا تھا۔

اسی آنکھ بچوں میں پورا سال بیت گیا۔

عمر حیات کی آنکھوں میں جلنے والی قدیلیں آہستہ آہستہ بجھنے لگیں۔ اسے اپنے جذبوں کی سچائی پر شبہ سا ہونے لگا۔ اُس نے تو سنا تھا کہ سچے جذبے اپنا آپ منوالیتے ہیں مگر یہاں تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ پڑھائی سے وہ غافل ہو گیا تھا۔ تب اس کے باپا حیات احمد نے فیصلہ کیا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انٹینس بھیج دیا جائے۔ عمر حیات نہیں جانا چاہتا تھا مگر یہاں رہ کر بھی اس نے کون سا کچھ پالینا تھا لہذا اس نے باپ کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور ساریہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ اس کی محبت کے پھول قبول کرنے پر رضا مند ہو گئی تو وہ اسے انتظار کے وعدے کی سنہری زنجیر سے بھی جکڑے گا اور اگر ساریہ نے اسے ٹھکرا دیا تو ہمیشہ کے لیے اسے بھول جانے کی کوشش کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ اسٹاپ تک پہنچا کافی دیر بعد ساریہ اپنی مخصوص نمبر کی بس سے اتری اور سر جھکائے ہمیشہ کی طرح کالج کی طرف جانے والی سڑک پر ہوئی۔ عمر حیات بھی پیچھے پیچھے چل دیا اور اس کے نزدیک پہنچ کر اپنے وجود کی ساری ہمتیں جمع کر کے انہیں صرف ایک لفظ کی گویائی دے سکا۔

”سنیے۔“ ساریہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔

اسے یوں لگا جیسے اس کی پکار نے قدموں میں زنجیر ڈال دی ہو مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا منہ موڑے کھڑی رہی۔ عمر حیات کا دل ابھل رہا ہو گیا۔

”شاید تم پتھر ہو اور تم سے ٹکرا کر عمر حیات پاش پاش ہو گیا ہے۔“ اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

”عمر حیات..... عمر حیات۔“ ساریہ کے چاروں طرف ہی اس نام کا مینہ برسنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہہ دے۔

”پاش پاش تم ہی نہیں ہوئے عمر حیات میں نے بھی اپنی آنا اور خود داری کے بھالے سے خود کو بار بار زخمی کیا ہے۔“ مگر وہ ہمیشہ کی بزدل لڑکی کچھ نہ کہہ سکی اور سڑک کر اس کر کے کالج کے سیاہ آہنی گیٹ میں داخل ہو گئی۔

عمر حیات کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے مقدر پر بھی سیاہی پھیر دی گئی ہو۔ اس نے خیالوں میں ساریہ کو مخاطب کیا۔

”تم سے بات نہ کر سکنے اور تمہیں نہ پانے کی خلش تو ہمیشہ رہے گی ساریہ مقصود مگر میں تمہارے نام کو کسی بھی رشتے سے اپنی زندگی میں ضرور شامل کروں گا، تاکہ میں اس سے باتیں کر سکوں، پکار سکوں۔“ اور ہارے ہوئے جوار کی طرح لوٹ گیا۔

پھر وہ گھنی مونچھوں اور اونچے قد کا ٹھہ والا لڑکا عمر حیات وقت کے دھندلکوں میں کہیں کھو گیا۔ ساریہ کی نظریں اس کی مخصوص جگہ پر اسے کھوجتیں مگر ہمیشہ مایوس ہو جاتیں۔ جس طرح وہ مایوس ہو گیا تھا اور اب بھلا آنے کی ضرورت کیا تھی؟ کس آس اور برتے پر آتا؟ پھر بھی اس کے لہجے کی گھمبیر تا ساریہ کے گرد لوہان کی طرح سلگتی رہتی اور ہلکی ہلکی سرگوشیاں ابھرتی رہتیں۔

”عمر حیات..... عمر حیات.....“ یہ نام لکھ لکھ کر

ساریہ نے کتنے ہی صفحے کل لے کر ڈالے تھے۔ کبھی اپنے نام کے ساتھ یہ نام لکھتی تو سفید کاغذ پر نیلی روشنائی سے لکھا ہوا۔

”ساریہ عمر.....“ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا دیتا۔

ساریہ کے اندر عمر حیات اپنی پوری رعنائیوں سے براجمان تھا۔ ساریہ کے اندر کی لڑکی عمر حیات کے ہر پیغام کا جواب دینا چاہتی تھی مگر دوسری ساریہ نے اس پر کڑے پہرے بٹھادیے تھے۔ اسے ہر لمحہ اماں کی کا خوف ستاتا رہتا تھا۔ اماں بی کے حکم سے سرتابی کی مجال اسے کہاں تھی۔

اماں بی نے اپنی زندگی کے سارے تجربے اسی پر آ زائے تھے اور اس نے اماں بی کو وہ اعتماد دیا تھا کہ انہیں باقی چاروں لڑکیوں پر پابندیاں لگانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھیں کہ بڑی کو دیکھ کر یہ بھی ویسی ہی ہوں گی مگر پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور وہ پانچوں بھی مختلف تھیں۔ فائزہ اور فرخندہ ساریہ سے چھوٹی تھیں۔ انہیں جب وہ ہر نیافیشن اپناتیں۔ نت نئے ڈیزائن کے لباس ستیں ساریہ بہت حیرت سے دیکھا کرتی۔ انہوں نے ماتھے پر سے بال کاٹ کر بہت خوبصورت انداز میں سیٹ کیے تھے جبکہ اماں بی ساریہ کی کس کر دو چوٹیاں کرتی تھیں اور اب تو ساریہ کو خود بھی یہی عادت پڑ گئی تھی۔ فیروزہ اور فریدہ تو خیر ابھی پرائمری کلاسز میں تھیں مگر وہ بھی آنکھوں میں کاجل اور گریبان میں پاؤڈر چھڑکے بغیر نہ جاتیں۔ فائزہ اور فرخندہ تو اسکول جاتے ہوئے ہلکی ہلکی لب اسٹیک بھی لگاتیں اور ساریہ بس دیکھتی رہتی مگر خود میں کبھی حوصلہ پیدا نہ کر سکتی کہ وہ بھی یہ سب کرے۔ اسے اماں بی کی یہ نصیحت یاد آ جاتی۔

”بیٹا شریف لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں، اونچی آواز میں قہقہہ نہیں لگاتیں۔“ مگر جب چھوٹی چاروں کسی

معمولی بات پر زور زور سے ہنستیں تو اماں بی ان کو منع کرنے کے بجائے خود بھی ہنس دیتیں اور سار یہ کو لگتا جیسے وہ ہنسا ہی نہ جانتی ہو۔ اب تو اماں بی کہتیں۔  
”سار یہ بیٹے بہنوں کے ساتھ ہنسا بولا کرو یہی تو

”اے بہن پہلے بڑی کی کرتیں شادی۔“  
 ”بھئی ساریہ تو ابھی پڑھ رہی ہے۔ فائزہ کو  
 پڑھنے کا شوق نہیں تھا سوچا اپنے فرض سے ادا  
 ہو جاؤں۔“ اماں بی خوش خوش ہنار ہی تھیں۔  
 ”ہاں یہ ٹھیک کیا جس کا بوجھ اتر جائے بہتر  
 ہے۔“ دوسری خاتون نے ہاں میں ہاں ملائی مگر  
 تھوڑی دیر بعد پھر ساریہ کے کانوں میں کچھ ایسے کی  
 مانند یہ جملہ پڑ جاتا۔  
 ”اصولاً تو پہلے بڑی کی شادی ہونی چاہیے  
 تھی۔“

کچھ عورتیں اس کی خاموشی کو غرور کا نام دے رہی تھیں اور یہ تمام باتیں ساریہ کے دل میں میخوں کی طرح اترتی چلی جا رہی تھیں پھر ایسی ہی باتیں صرف چند ماہ بعد فاخرہ کی شادی پر بھی اسے سننے کو ملیں۔ کاظم کو یوشن پڑھانے جو ارشد صاحب آتے تھے انہیں فاخرہ اتنی پسند آئی کہ جھٹ پٹ فاخرہ ارشد بنا کر ساری زندگی محبت کا سبق پڑھانے کے لیے اسے لے گئے۔ ایک دم ہی گھر سونا سونا سا ہو گیا۔

معمولی بات پر زور و زور سے ہنستیں تو اماں بی ان کو منع کرنے کے بجائے خود بھی ہنس دیتیں اور ساریہ کو لگتا جیسے وہ ہنسا ہی نہ جانتی ہو۔ اب تو اماں بی کہتیں۔  
”ساریہ بیٹے، بہنوں کے ساتھ ہنسا بولا کر وہی تو دن ہیں تمہارے ہنسنے کھیلنے کے۔“

اماں بی کی بے جا پابندیوں اور نصیحتوں نے اُسے قوت گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ گھبراہٹ سے تنہائی جاتی تھی۔ تنہائی اسے ناگ بن کر ڈھکی چڑھائی سے تنہائی کے نینے کا یہ طریقہ نکالا کہ خود کو پڑھائی میں مصروف کر لیا۔ البتہ کبھی خواہشیں اس کے دل میں داویلا مچانے لگتی تھیں۔ وہ اپنے دل کے دالان میں عمر حیات کی آہٹیں محسوس کرتی اور ایک انجانا سا دکھ اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔

فاخرہ اماں بی کی نظروں کے نیچے ہی محبت کا کھیل کھیلا اور پا بھی لیا اپنی محبت کو اور میں خوف ہی میں ماری گئی۔

”عمر حیات تم اب کہیں سے آ جاؤ۔ وعدہ کہ اب میں تمہاری محبت کے پھول نہیں ٹھکراؤں گی۔“ آنسو اس کے گریبان میں چنگاریوں کی طرح گرتے رہتے مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ جانے والے لوٹنے کے لیے نہیں جاتے۔ وہ تو پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے کہ مبادا پتھر کے ہو جائیں۔

وقت کے خالی تھال میں مہینے سکے بن کر گرتے رہے اور تھال بھرتا رہا۔ ساریہ نے بی ایڈ کر لیا مگر اسے کہیں جاب ملی اور نہ ہی کوئی رشتہ آیا کہ اماں بی فرض ادا کر تیں تب انہوں نے خود ہی کہا۔  
”تو ایم اے کر لے سارو۔“

”اچھا اماں.....“

”اپنا خیال رکھا کر بیٹا۔“

”کیسا خیال؟“ ساریہ نے حیرت سے پوچھا۔  
”تو اپنے آپ سے اپنے لباس سے بہت بے پرواہ رہتی ہے۔“ اماں بی خاموش ہو گئیں مگر ساریہ کو علم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں اس کا جی چاہا اس کا یا پلٹ پر اس قدر قہقہے لگائے کہ اندر کی ساری ٹھٹھن ختم ہو جائے۔ دل کے آسمان پر چھائے بادل چھٹ جائیں مگر نہیں اماں بی کے سامنے زور سے ہنسنے بھی آداب کے خلاف تھا۔

”اچھی لڑکیاں زور سے نہیں ہنستیں۔“ یہ انہی کا پڑھایا ہوا سبق تھا جسے وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی۔

پھر ساریہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا مگر اماں بی کے بہت اصرار پر بھی اس نے خود کو نہ بدلا۔ کیا فائدہ ہوتا گزرے وقت کو تو آواز نہیں دی جاسکتی تھی۔ جو پل بیت جائے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ عمر کے اس دور میں اب وہ امنکیں رہی تھیں اور نہ ہی وہ

دولے..... لگتا تھا سانس لینا ایک فرض ہے اور وہ یہ فرض نبھار ہی ہے۔ حالانکہ اماں بی اس کا بہت خیال رکھتیں۔ اس کے لیے کپڑے خرید لائیں اور فائزہ نت نئے فیشن کے مطابق انہیں سی دیتی مگر ساریہ کو یہ سب اچھا نہ لگتا۔ آہستہ آہستہ اماں بی نے اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا۔ چھوڑا ہوا تو انہوں نے فریدہ اور فیروزہ کو بھی تھا جو اماں بی کی ایک بھی نہ سنتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے فیروزہ سے کہا تھا۔

”تمہاری بہن سہ پہر کو تھکی باری آتی ہے۔ اسے گرم گرم چائیاں ہی پکا دیا کرو۔“  
”تو نہ جایا کریں یونیورسٹی کس نے کہا ہے۔“ فریدہ تنک کر جواب دیتی۔

”ہم سے نہیں بار بار کچن میں گھسا جاتا۔“  
”اماں بی کیا ساری سختیاں ساری نصیحتیں صرف میرے لیے ہی تھیں۔ مجھے تو اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا جاتا تھا اور یہ.....“ ساریہ کی سوچ غمی بن کر لبوں کی مسکراہٹ کی صورت چل جاتی اور وہ کہتی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا میں ٹھنڈی چپاتی ہی کھا لوں گی اماں بی۔“ ساریہ ہنس کر ماحول کے جمود کو ختم کر دیتی پھر تو یہ ہونے لگا کہ وہ یونیورسٹی سے آ کر کچن میں گھس جاتی اور چوکی پر بیٹھ کر ٹھنڈا کھانا کھا لیتی۔

اس روز چھٹی تھی۔ اماں بی اور فائزہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ فائزہ اپنے نئے آنے والے مہمان کے لیے منے منے فرائڈ سی رہی تھی۔ ساریہ چنگیر میں مٹر لیے آ گئی۔ چھٹی کے روز دو پہر کا کھانا پکانے کی اسی کی باری ہوتی تھی۔

”اماں بی مٹر پلاؤ پکالوں۔“  
”جو تمہارا جی چاہے۔“ اماں بی نے اسی پر فیصلہ چھوڑ دیا۔

جھونکے کی طرح وہاں سے چلی گئی۔ اماں بی آہ بھر کر رہ گئیں۔

وہ ایم اے فاضل میں تھی کہ محلے ہی کی مسز صدیقی اپنے بیٹے عرفان صدیقی کے لیے اسے اماں بی سے مانگنے آئیں۔ عرفان ایک مقامی کالج میں ٹیچر تھا اور نائیجیریا کی یونیورسٹی میں اس کا اپائنٹمنٹ ہو گیا تھا۔ وہ شادی کر کے بیوی کو بھی ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اماں بی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

”ابھی تو ساریہ پڑھ رہی ہے اور وہ کسی صورت بھی نہیں مانے گی کہ اپنا ایم اے ادھورا چھوڑ دے۔“ اماں بی کے انکار پر مسز صدیقی کو دکھ تو ہوا مگر وہ بھی بیٹے کو بنا بیوی کے نہ جانے دینا چاہتی تھیں صرف پندرہ روز بعد ہی عرفان صدیقی کی شادی انہوں نے اپنی مڈل پاس بھانجی سے کر دی اور ایک ماہ بعد ہی عرفان اور رقیہ نائیجیریا چلے گئے۔

پھر اسی دوران کئی رشتے آئے مگر اماں بی نے ساریہ سے پوچھے بغیر ہی انکار کر دیا کہ وہ بڑھ رہی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ جب ساریہ ایم اے کر لے گی تو اس کے لیے رشتوں کی بھلا کیا کمی رہے گی؟ اتنی پڑھی لکھی لڑکی کو تو ہر کوئی بہو بنانے کو تیار ہوگا۔“ یہ اماں بی کی سوچ تھی۔

وقت کا پچھی پنکھ پھیلائے اڑتا رہا۔ ساریہ ایم اے فاضل کے آخری سمسٹر سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ مقامی ہائی اسکول سے اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر آ گیا۔ اس اسکول کی انگلش کی ٹیچر شادی کر کے لاہور چلی گئی تھی اور ساریہ ایم اے انگلش لٹرچر میں کر رہی تھی۔ اس لیے اسے بلا لیا گیا۔

عاصم نے میکینیکل اسٹی ٹیوٹ سے چار سالہ ایکسٹریکل کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ کاظم آرڈر میڈیکل کالج میں سال اول کا طالب علم تھا۔ عاصم کو اس کے ایک دوست نے مڈل ایسٹ بلوایا۔ وہ یہ چانس مس

”اچھا.....“ وہ مسکرا کر وہیں تخت پوش پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر مٹر کی پھلیاں چھیلنے لگی۔

”آپ کو کوئی بات کریں بھی۔“ فائزہ نے مشین کے بتے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے مخاطب کیا۔

”کیا بات کروں؟“ ساریہ نے آہستگی سے کہا۔

”اماں بی..... معین بھی کہتے ہیں لگتا ہے ساریہ آپ کو بولنا ہی نہیں آتا۔“

”پتہ نہیں یہ ایسی کیوں ہے لگتا ہے جیسے اس کا دل مر گیا ہے۔“ اماں بی آہ بھر کر بولیں۔

ساریہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میرے دل کی موت کی آپ ذمے دار ہیں اماں بی۔ آپ کی بے جان نصیحتوں کی چادر نے میرے دل میں ایسے اندھیرے پھیلا دیے کہ خوشی کی کوئی کرن بھی دل کی زمین تک نہ پہنچ سکی۔“ ساریہ کے دل میں لفظوں کے جگنو جھلملاتے رہے مگر ہمیشہ کی طرح زبان پر تالے لگائے۔ وہ ہر باغی جذبے کو دل کی گہرائیوں میں دفن کرنے کی سعی کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

”آپ آ خر آپ کو کیا دکھ ہے؟“ فائزہ پوچھ رہی تھی۔

”میں دکھی تو نہیں ہوں فوزی۔“ ساریہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”کچھ تو ہے۔“ فائزہ نہ جانے کیا جاننا چاہتی تھی۔

”آپ اتنی خاموش کیوں رہتی ہیں؟“

”اصل میں شروع ہی سے عادت نہیں رہی اور اب تو یہ سب اچھا ہی نہیں لگتا۔“ ساریہ نے بات بنائی اور ماں سے مخاطب ہوئی۔

”اماں بی آپ مٹر چھیلیں تب تک میں چاول صاف کر لوں اور بھگو دوں۔“ پھر وہ ہوا کے سبک



نہ کر سکا اور چلا گیا۔ اس گھر میں کسی نے بھی کبھی کوئی چانس مس نہیں کیا تھا سوائے ساریہ کے۔

اسکول میں بھی وہ زیادہ تر چپ ہی رہتی چنانچہ بہت جلد ہی اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو گئیں۔ ایسی کہانیاں جن کا کوئی عنوان نہ ہو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہیں۔ کوئی کہتا۔

”مس ساریہ مقصود مغرور ہیں۔“ نیچرز کہتیں۔

”انہیں اپنی زیادہ کوالیفیکیشن پر ناز ہے۔ کیونکہ اس اسکول میں سب بی اے بی ایڈ نیچرز تھیں علاوہ

ہیڈ مسٹر میس کے جو بہت سینئر تھیں اور انہوں نے ایم اے کیا ہوا تھا اور یہ ایک بات تو بہت ہی مشہور ہوئی تھی کہ ساریہ مقصود اپنے کسی کلاس فیلو کو پسند کرتی تھیں بہت زمانے کا عشق چلا اور پھر وہ عاشق انہیں وعدوں کے کھلونے تھا کر ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا بس تب سے یہ ایسی ہو گئیں۔

کسی نے اس سے اس خواہ مخواہ کی ٹریچڈی پر افسوس کیا اور کوئی بولی۔

”ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو یونیورسٹی پڑھنے نہیں بلکہ برتلاش کرنے جاتی ہیں۔ مرد تو چاہتا ہے کہ اس کی شریک حیات ایسی ہو جسے کسی نے دیکھا بھی نہ ہو؟

یہ مختلف کہانیاں عجیب عجیب انداز سے ساریہ مقصود تک بھی پہنچ گئیں۔ اب وہ کیا کہتی کہ ہاں یہ سچ ہے میں نے زندگی کے سنہری دور میں کسی کو چاہا ضرور تھا مگر اسے پانے کی تمنا بھی دل خانہ خراب میں کہکشاں بن کر نہ اتری تھی۔ کاش لوگوں کی کہانی کے مطابق زمانے کا عشق چلا ہوتا تو آج میں ان یادوں ہی کے سہارے خوش خوش زندگی گزار دیتی۔ وہ کہانی جس کا ایک باب بھی مکمل نہ ہوا تھا۔ لوگوں کی زبانوں نے اسے داستان بنا دیا۔

رات کی کوکھ سے نیا دن جنم لیتا رہا اور اسی طرح

پورے پانچ برس بیت گئے۔ جو بھی رشتہ ساریہ کے لیے آتا آنے والے فریدہ اور فیروز کو پسند کر جاتے۔ حالانکہ ساریہ ان دونوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ سادہ اطوار تھے مگر لوگوں کو تو ذرا چمک مکک والی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چیزیں ہی بھاتی ہیں مگر اماں بی کسی صورت بھی ساریہ سے پہلے فریدہ اور فیروزہ کو نہ بیاہنا چاہتی تھیں۔ ابامیاں الگ پریشان سے رہتے کہ عاصم ہر خط میں انہیں لکھتا تھا۔

”میں جلد از جلد بہنوں کی شادیوں سے فارغ ہونا چاہتا ہوں ابامیاں آخر کب تک پردیس میں رہوں گی۔ تینوں کی شادیاں کر دیں تاکہ پھر میں اپنے لیے بھی کچھ جوڑ سکوں اور وطن آ کر کاروبار کروں۔“ مگر ابامیاں اور اماں بی دونوں ہی مجبور تھے انہیں یقین تھا اب بھی اگر ساریہ سے پہلے فیروزہ اور فریدہ بیاہ دی گئیں تو پھر لوگ اس گھر کا راستہ ہی بھول جائیں گے کوئی نہیں آئے گا۔ ساریہ پورے تیس برس کی ہو گئی تھی۔ اماں بی اس کے بالوں میں چاندی کے تار دیکھ کر بولائے جاتیں مگر کیا کرتیں وہ ایسا بوجھ تھی کہ زیر دستی کسی کے سر منڈھا بھی نہ جاتا تھا۔ اب وہ پچھتاتی تھیں کہ جب وہ پڑھ رہی تھی تب جو رشتے ائے انہوں نے انکار کیوں کیا؟ مگر گئے وقت کو بلانے پر تو کوئی بھی قادر نہیں۔

اب بھی ساریہ کے لیے ایک رشتہ آیا تھا لڑکا کسٹم آفسر تھا مگر اس کی اماں کو فیروزہ پسند آ گئی اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ طاہر سے تو ساریہ بڑی ہی تھیں اماں بی بے صاف انکار کر دیا کہ بڑی سے پہلے ہم چھوٹی کی شادی نہیں کر سکتے۔

”پہلے بھی تو دو چھوٹی آپ نے بیاہ دیں۔“ عصمت آرانے کہا۔

”تب تو ساریہ پڑھ رہی تھی۔“ اماں بی نے وجہ

بیان کی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ ابامیاں کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی رہ گئیں۔  
”پلیز ابامیاں انکار مت کیجیے گا..... آپ میری فکر نہ کریں۔“

”کیسے نہ کریں تمہاری فکر کیا ساری زندگی بھائی بھاد جوں کی غلامی کرتی رہو گی۔“ اماں بی کے لہجے میں پیار بھی تھا اور غصہ بھی.....  
”میں خود کماتی ہوں اور اتنا ہو جاتا ہے کہ میرے لیے خاصا ہے۔ میں کسی پر بوجھ نہیں ہوں اماں بی پلیز آئندہ میرے لیے کوئی رشتہ آئے تو منع کر دیجیے گا۔“ پھر وہ وہاں رُکی نہیں اپنے کمرے میں ہی آ کر دم لیا۔

آخر اماں بی اور ابامیاں کو عصمت آرا کی بات ماننی ہی پڑی اور انہیں فیروزہ کے لیے ہاں کہہ دی گئی۔ ابامیاں چاہتے تھے کہ فریدہ کا رشتہ بھی طے ہو جائے۔ تاکہ دونوں کی ایک ساتھ شادی کر دی جائے عصمت آرا کو بہولے جانے کی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے ابامیاں کی شرط اس طرح پوری کی کہ کھٹ اپنی نند کے بیٹے جلال کا رشتہ لے آئیں اور یوں فیروزہ اور فریدہ کی بھی شادی ہو گئیں۔

وقت کے سمندر میں جتنے بھی پتھر بڑے وہ سب ساریہ کو ہی سنگسار کرتے رہے۔ ہر گزرنے والے دن کا پتھر اس کے دل کے زخموں میں اضافہ کر جاتا۔ عاصم کہتا تو یہ تھا کہ ابامیاں لڑکیوں کو بیاہ دو تاکہ میں وطن آ کر کوئی کاروبار کر لوں مگر اس نے دیارِ غیر ہی میں ابامیاں سے پوچھے بغیر ایک مصری لڑکی آمنہ سے ازدواجی رشتہ جوڑ لیا اور کاظم نے بھی آرٹ میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران ہی کرنل جعفری کی صاحبزادی شائستہ جعفری کو اس طرح دل میں بسایا کہ ڈاکٹر بننے ہی شائستہ سے گھر کا آنگن بسالیا۔ ان دنوں اس کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ عاصم

”خیر بہن سوچ لیں ہم انتظار کر لیں گے۔“ وہ چلی گئیں اور اماں بی سوچوں کی عمیق دلدل میں دھنستی چلی گئیں۔

ساریہ کو بھی علم ہو چکا تھا اور وہ خود بھی دیکھ رہی تھی کہ چند روز سے فیروز اور فریدہ کا رویہ اس سے نہایت سرد ہو گیا۔ دونوں اپنے کمرے میں کھسی نہ جانے کیا کرتی رہتی ہیں تب اس نے اماں بی سے بات کرنے کا خود ہی حوصلہ پیدا کر لیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ ابامیاں کے کمرے تک آئی اور لڑتے ہاتھوں سے دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ ابامیاں کی بھاری آواز گونجی۔  
”ارے ساریہ بیٹا۔“ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھے اور بیڈ پر اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا۔  
”کوئی کام تھا؟“ ابامیاں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”جی ابامیاں۔“ ساریہ نے انہیں اور پھر ایک نظران کے قریب بیٹھی اماں بی کو دیکھا۔  
”کہو.....“ ابامیاں نے اتنے پیار سے کہا کہ ساریہ کے حوصلے کو تقویت ملی۔

”آپ انکار تو نہیں کریں گے جو میں کہوں گی۔“ ساریہ نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔  
”سارو..... میری جان تمہارے ابا اور میں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ تم کچھ کہو ضد کرو دوسری بہنوں اور بھائیوں کی طرح اپنی بات منواؤ۔“ اماں بی شہد شہد لہجے میں بول رہی تھیں۔

”تو..... تو اماں بی آپ فیروزہ کا رشتہ طاہر سے طے کر دیجیے۔ فریدہ کو بھی بیاہ دیجیے میں..... میں شادی نہیں کروں گی۔ میں آپ دونوں سے دور نہیں ہونا چاہتی۔“ ساریہ نے اپنے وجود کی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے کہا۔

پاس ہو گئی تھی۔“ بوائے تفصیل بتائی۔

چند لمحے بعد ہی ایک خوبصورت سی بچی پنک جھالروں والا فراک پہنے اندر آئی۔ اس کے پیچھے یقیناً اس کا باپ تھا مگر ساریہ نے اسے نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ شروع ہی سے جو عادت تھی وہ اب بھی نہ چھوٹی تھی اسے وہ بچی بہت ہی پیاری لگی وہ بچی پر نظریں جمائے جمائے بولی۔

”تشریف رکھیے۔“

”شکریہ۔“ گھمبیر لہجے میں کہا گیا اور پھر اس نے فارم ساریہ کے سامنے کر دیا۔

”سوری لیٹ ہو گئے ہم، میری وائف کی طبیعت خراب تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ساریہ نے مسکراتے ہوئے فارم پر نظر دوڑائی تو اس کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔

”ساریہ عمر۔“ اسے چاروں طرف یہی نام نظر آیا۔ سماعتوں میں ہر سمت سے یہ نام کھنکے لگا۔ کتنی ہی بار یہ نام انجانے میں اس نے اپنی کانپوں پر، ہتھیلی پر لکھا تھا۔ اسے اپنے نام کے آگے عمر کا اضافہ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ پھر یہ کون ہے؟ دل کی تہوں میں چھپا ہوا درد برسوں بعد اٹھرائی لے کر بیدار ہو گیا۔ تب اس نے اس درد کو قابو میں کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جو ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ انھیں تو پھر اٹھی ہی رہ گئیں۔

”عمر حیات.....“ چھن چھن کرتے کتنے ہی کانچ دل کے فرش پر ٹوٹ گئے۔ ماہ و سال کی گردنے کتنے ہی نقش دھندلا دیے تھے۔ بہت تبدیلیاں گزرے برسوں میں آگئی تھیں مگر نہ بدلیں تو دل کی ادائیں نہ بدلیں۔ وہ بھی یک بوائے سے ادھیڑ عمر کے مرد میں ڈھل گیا تھا۔ جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا۔ بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کنپٹیوں کی سفیدی

کو ہمت ہی میں تھا۔ اس کے دو بچے تنور اور تاشیہ تھے کبھی کبھی دل چاہتا تو ڈرافٹ ضرور بھیج دیتا۔

اماں بی ابا میاں اور ساریہ ہی اس بھرے گھر میں تنہا رہ گئے تھے کبھی کبھی بہنیں بمعہ اپنے بچوں کے آجاتیں تو اس چار کمرے کے چھوٹے سے گھر میں جانو بھاروں کے قافلے اتر آتے۔ سارو خالہ تو سب کی ہی آئیڈیل شخصیت تھیں۔

☆.....☆.....☆

ساریہ ایک انگلش ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹر لیس تھی۔ اسے سروس کرتے ہوئے پورے تیرہ برس بیت گئے تھے۔ ان دنوں عاصم چھٹیوں میں بیوی بچوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ گھر میں خاصی رونق تھی تاشی تو ساریہ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اسے اپنی سادہ سی ساریہ پھوپھو بہت پسند تھی۔ اپنے آپ سے بے پرواہ رہنے والی ساریہ کی لمبی سی چوٹی جس میں کہیں کہیں سفید بال جھلملاتے تھے۔ ساری میں اس کا نازک سراپا آج بھی آفتیں ڈھاتا سنا ہے کہ جو عورتیں نہایت پاکیزگی سے اپنی عمر کے ماہ و سال گزارتی ہیں قدرت ان پر اپنا نور نچھاور کر دیتی ہے۔ ان کے وجود سے نہایت خوبصورت مہک اٹھتی ہے اور یہی حال ساریہ کا بھی تھا۔ اس کو دیکھتے ہی نظریں بے اختیار احترام سے جھک جاتیں۔

ایک روز وہ اسکول میں رجسٹروں پر دستخط کر رہی تھی کہ بوائے آکر بتایا۔

”میڈم ایک صاحب آئے ہیں۔“

”کس لیے؟“ ساریہ نے آہستگی سے پوچھا۔

”جی وہ بچی کا ایڈمیشن کروانا چاہتے ہیں۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ کسی بھی کلاس کے لیے

ایڈمیشن بند ہو چکے ہیں۔“

”میں نے بتایا ہے جی، انہیں فارم جمع کروانے

میں دیر ہو گئی۔ ان کی بچی نے ٹیسٹ بھی دیا تھا اور

نے اسے کچھ اور بھی گریس فل بنا دیا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں ساریہ مقصود کے لیے مہکے مہکے جذبے ہوتے تھے آج بھی ان کا یہی حال تھا مگر ان جذبوں کی روشن قندیلوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں نمی بھی تھی۔ آگ اور پانی یک جاتھے۔ ساریہ کو یہ منظر بہت ہی بھایا۔

”یہ..... یہ آپ کی بیٹی ہے؟“

”یہ پوچھ کر شاید تم خود کو یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ تمہارے علاوہ بھی ایک اور ساریہ یہاں موجود ہے۔“

عمر حیات نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ ایسے جیسے وہ دونوں ہمیشہ بے تکلفی سے ملتے رہے ہوں۔ ساریہ خاموشی سے میز کے شیشے کو ناخن سے کھرچتی رہی۔ اس کے اس انداز سے دل کی بے چینی عیاں تھی اور عمر حیات نے ایک دم ہی اسے تمام اُجھنوں سے نکلنے کے لیے سب کچھ بتا دیا۔

”ہاں ساریہ جس روز میں تم سے پہلی اور آخری بار ہم کلام ہوا تھا۔ اس روز ہی میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا کہ میں کسی بھی رشتے سے تمہارے نام کو اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔ تم نہ سہی تمہارا نام ہی.....“

”تو آپ نے اپنی بیٹی کو میرا نام دے دیا؟“ ساریہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”ہاں..... بہت انتظار کیا ہے میں نے اس نام کے لیے..... میری بیوی تین بیٹیوں کے بعد اور بچہ پیدا کرنے کے سخت خلاف تھی مگر میں نے کہہ دیا کہ مجھے بیٹی چاہیے۔ تاکہ میں اسے وہ نام دے سکوں جو میرے دل کی دیواروں پر کندہ تھا وہ نام جو میں کسی مقدس صحیفے کی طرح دل کے جزدان میں چھپائے پھر رہا تھا۔ لوگ بیٹے پا کر خوش ہوتے ہیں مگر جب تخلیق کے دور سے گزر کر فرزانہ اپنی کوکھ کا موٹی

میری جھولی میں بیٹے کی صورت ڈال دیتی تو میرا دل رنج میں ڈوب جاتا۔ میں خدا سے شکوہ کرتا کیا میری کوئی بھی خواہش پوری نہ ہوگی اور..... اور ساریہ آخر خدا کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ دیکھو میری ساریہ کتنی خوبصورت ہے۔“ عمر حیات نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔

ساریہ مقصود کا دل چاہا کہ۔

”عمر حیات اب تک تم نہیں آئے تھے تو اب عمر کے اس دور میں بھی میری راہ میں نہ آتے تو کیا مضائقہ تھا۔“ اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی وہ کہہ رہا تھا۔

”تمہارے آفس کے باہر نیم پلیٹ پر تمہارے نام سے پہلے لفظ ’مس‘ ہی ہے۔ کیا ابھی تک.....“ پتہ نہیں کیوں اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں نے خود ہی شادی نہیں کی۔“ وہ اطمینان سے مسکرائی۔

”کیوں؟“ عمر حیات نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”بس عمر حیات..... دل نہیں چاہا۔“ ساریہ نے ایسے کہا جیسے یہ اس کے لیے کوئی اہم بات نہ ہو۔

”غلط بیانی سے کام مت لو ساریہ! دل تو میرا بھی شادی کرنے کو نہیں چاہتا تھا مگر زندگی تنہا بھی تو نہیں کاٹی جاسکتی۔ کوئی تو ہو جو.....“

”میں تنہا کب ہوں عمر حیات۔“ ساریہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ساریہ نے قریب کھڑی ہنسی ساریہ عمر کو اپنے قریب کر لیا۔

”یہ اتنے پیارے پیارے بچے ہیں میرے چاروں طرف! ان کی معصوم قلقاریاں ہیں ان کی معصوم محبتیں میری ساھی ہیں یہ میرے ہدم میرے رفیق ہیں۔ میں نے ان پیاری رفاقتوں کی خاطر تو کالج میں لیکچرار شپ نہیں کی۔“

پر کچھ لکھنے لگی۔ پھر وہ فارم عمر حیات کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”آپ میڈم فیروز سے مل لیں مگر پلینز آئیندہ مت آئیے گا۔“ ساریہ کے لہجے میں دنیا جہاں کی محرومیاں سمٹ آئیں۔ عمر حیات اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

ضبط کی جس منزل سے وہ گزر رہی تھی وہی طوفان اس کے دل میں بھی موجزن تھا پھر عمر حیات نے اس کے ہاتھ سے فارم تقریباً جھپٹ لیا اور بیٹی کا ہاتھ تھام کر وہاں سے نکل گیا وہ زیادہ دیر تک خود کو اور ساریہ کو امتحان میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

ساریہ کی آنکھوں کے فرش تو گیلے ہو گئے تھے مگر اس نے آنسوؤں کے مینہ سے چہرے کی عمارت کو نہ بھیکنے دیا۔ عمر حیات نے آج اتنے برسوں بعد آکر اس کے وجود میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

رسائی کا دکھ دہشتی آگ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ آگ نہ وجود کو بھسم کرتی ہے اور نہ ہی زندہ رہنے کے قابل چھوڑتی ہے۔

ساریہ گھر آئی تو خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا وہ وقت کے دھندلوں میں گم ہونے والا عمر حیات برسوں بعد آج اپنی محبتوں کا سارا بوجھ اس پر ڈال گیا ہو اس بوجھ سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ تاہم اس نے خود کو جلد ہی نارمل کر لیا اور لباس بدل کر ڈائننگ روم میں آئی تو اماں بی کھانا لگا رہی تھیں۔

”عاصم اور بچہ پارٹی نظر نہیں آ رہے۔“ ساریہ نے پوچھا۔

”شاپنگ کے لیے گئے ہیں۔“ اماں بی نے

بتایا۔

”سب؟“ ساریہ کی سی گھٹٹ کر بیٹھ گئی۔

”مگر یہ رفاقتیں عارضی ہیں۔ آج ایک بچہ اسکول میں آتا ہے کل دوسرا بچہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ تم سب بچوں پر بحثیں لٹاتی ہو۔ کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ ایسے بچے تمہاری محبت کا مرکز ہوں جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں۔“ عمر حیات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”اب زندگی میں ایسی کوئی خواہش کوئی ارمان نہیں رہا وہ عمر ہی گزر گئی جب ایسی خواہشوں کی برات سچ سچ کر دل کے پلیٹ فارم پر اترتی تھی۔ اپنے گھر کا ارمان ضدی بالکب کی طرح دل میں ہمکتا تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں سوچتی اب گئے وقت کو آواز دینے سے وہ واپس آنے سے تو رہا۔“

”کاش ہم وقت کے پیچھے کو قید کر سکتے۔“ عمر حیات ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ جیسے بہت قیمتی شے وقت کے سمندر میں گوا بیٹھا ہو۔

”میری آپ سے ایک گزارش ہے۔“

”کیا؟“ عمر حیات نے بے اختیار پوچھا۔

”آپ..... آپ بچی کے ایڈمیشن کے بعد یہاں کبھی مت آئیے گا۔“ ساریہ نے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ اُسے لگا جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو جبکہ وہ تو سوچ رہا تھا۔ اب شاید ملنے ملانے کا سلسلہ رہے گا۔ وہ برسوں سے دل میں چھپے جذبوں کو عیاں کرے گا۔ مگر ساریہ نے یہ کیسا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”تم..... تم مجھے کیوں منع کر رہی ہو یہاں آنے سے؟“

”نارسائی کا دکھ خود بھی جھیلا ہے پھر بھی یہ سوال کر رہے ہو؟“ ساریہ کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ پھیل گئی۔

عمر حیات کی آنکھیں پھر اُن کے فسانے سنانے لگیں۔ مگر ساریہ نے نظریں جھکا لیں اور فارم

”عاصم اور آمنہ جا رہے تھے تو بچے بھی ضد کرنے لگے۔“

”وہ آ جاتے ہیں تو مل کر ہی کھانا کھاتے۔“  
 ”اب پتہ نہیں کب آئیں، تھوڑی دیر تو ہوئی ہے گئے۔“ اماں بی سالن کا ڈونگا رکھ کر روٹی لانے چلی گئیں۔ ساریہ گھونٹ گھونٹ پانی پیتی رہی جو آگ کے دل میں لگی تھی اس پر وہ پانی کے چھینٹے ڈالنا چاہتی تھی۔

اماں بی بھی ساریہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں ساریہ نے ڈونگ پر سے ڈھکن اٹھا تو بری طرح جھنجھلا کر بولی۔

”اوہو آج پھر بھنڈی گوشت۔“ اس نے پہلی بار زندگی میں کھانے پر جھنجھلاہٹ ظاہر کی تھی۔  
 ”پہلے تو تمہیں یہ ڈش بہت پسند تھی سارو۔“ اماں بی پیار سے بولیں۔

”پہلے کون سا میری پسند کا خیال رکھا جاتا تھا اماں۔“ ساریہ کا لہجہ تنقید کی مانند تھا۔ اماں بی حیران حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ ساریہ نے برا سامنہ بنا کر پیلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈالا پھر دستر خوان میں لپٹی روٹی نکالی۔

”یہ بھی ٹھنڈی، بھلا یہ کھانے کے قابل ہے۔“ ساریہ نے روٹی دوبارہ ٹنچ دی۔ اُسے خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ اور اماں بی کا چشمہ مارے حیرت کے ڈھلکا جا رہا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے برسوں سے تو صبح ہی کی پکی ہوئی روٹی دوپہر کو بھی کھاتی چلی آ رہی ہے۔“  
 ”اماں بی میں ایک ہی روٹین سے تنگ آ گئی ہوں چیخ چاہتی ہوں میں۔“ وہ چیخی۔

”تو میں کیا کروں.....“ اماں بی کا لہجہ اب بھی ریشم کی طرح تھا۔

”آپ دوپہر کو تازہ روٹی تو پکا سکتی ہیں۔“

”میں بڑھی عورت.....“

”تو میں کون سی جوان ہوں اماں بی۔“ ساریہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔  
 ”ایک ہی طرح کی زندگی سے مجھے گھٹن ہونے لگی ہے۔“

اور اماں بی جواب تک برداشت کر رہی تھیں۔ ایک دم ہی گیلی گڑی کی طرح سلگ کر بولیں۔

”لڑکیوں کو والدین کے گھر میں گھٹن اُس وقت ہوتی ہے جب ان کے دل میں دوسرے گھر کی خواہش ہسکنے لگتی ہے۔ میں نے پابند تو نہیں کیا۔ جاؤ کرلو پسند کسی کو رچالو بیاہ، میری طرف سے اجازت ہے۔“

”اب دے رہی ہیں پسند کرنے کی اجازت۔“ برسوں کا پکتا ہوا لاوا آج آتش فشاں سے بہہ نکلا۔

”بتائیے اب کون مجھے پسند کرے گا؟ یہ عمر ہے میری پسند کرنے اور کروانے کی؟ وہ عمر تو آپ کے تجربوں اور پابندیوں کی نذر ہو گئی۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے اماں بی۔“

اس کی ذمہ دار آپ ہیں آپ.....“ الفاظ پھندا بن کر ساریہ کے حلق میں اٹک گئے اماں بی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہ گئیں پھر ساریہ اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

اور اب وہ پچھتاؤں کی آگ میں جھلس رہی تھی۔ اماں بی کا سامنا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔

تاشی کئی بار اسے رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی مگر ساریہ نے انکار کر دیا تھا۔ وہ بہت شرمندہ تھی اماں بی سے اور اماں بی میں بھی ساریہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ خود بھی ندامت کے دلدل میں دھنس چکی تھیں۔



میں کس جگہ  
دوشیزہ

تسلیج کمائیوں کے

کے چپے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدارین کو ملک کو

نرم مبادلہ پیش ہے

انڈرون ملک = 1500 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

|           |                 |          |                 |
|-----------|-----------------|----------|-----------------|
| کویت      | 175 امریکی ڈالر | ایران    | 175 امریکی ڈالر |
| سعودی عرب | 175 امریکی ڈالر | سری لنکا | 175 امریکی ڈالر |
| یو اے ای  | 175 امریکی ڈالر | جاپان    | 175 امریکی ڈالر |
| مصر       | 175 امریکی ڈالر | لیبیا    | 175 امریکی ڈالر |
| یونان     | 175 امریکی ڈالر | ڈنمارک   | 175 امریکی ڈالر |
| فرانس     | 175 امریکی ڈالر | جرمنی    | 175 امریکی ڈالر |
| برطانیہ   | 175 امریکی ڈالر | ہالینڈ   | 175 امریکی ڈالر |
| ناروے     | 175 امریکی ڈالر | پولینڈ   | 175 امریکی ڈالر |
| امریکہ    | 185 امریکی ڈالر | کینیڈا   | 185 امریکی ڈالر |
| افریقہ    | 185 امریکی ڈالر | آسٹریلیا | 185 امریکی ڈالر |

اگر آپ پاکستانی کرنسی میں پاکستان کے کسی بینک کے ذریعے ادائیگی کرنا چاہیں تو  
175 امریکی ڈالر کے حساب سے مندرجہ بالا شرح کے مطابق بینک ڈرافٹ ارسال  
فرمائیں۔ مطلوبہ رقم کا ڈرافٹ Monthly Dosheeza کے نام بھیجیں۔  
آپ کو ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ ہوائی ڈاک سے بذریعہ رجسٹری ملتا رہے گا۔

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88 فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

P.O Box # 3129 P.E.C.H.S Karachi-75400 فون نمبر: 35893123 - 35893122



دو شیزہ قارئین کی فرمائش پر اب انتہائی سہل کرنے کی ترکیب پیش کی جارہی ہیں وہ ترکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

### فیش مکھنی والا

اجزاء:

- فیش (بغیر کانٹے کے) : ایک کلو  
پیاز بڑے سائز کی : ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)  
ادرک لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچہ  
پیادھنیا : ایک چائے کا چمچہ  
سفید زیرہ : ایک کھانے کا چمچہ  
گرم مسالا (پیادھنیا) : ایک چائے کا چمچہ  
ٹماٹر درمیانے سائز : آدھا کلو  
لیمن جوس : دو کھانے کے چمچے  
چھوٹی الائچی : چار عدد (کوٹ لیں)  
لال مرچ (پسی ہوئی) : ایک کھانے کا چمچہ  
پسی دار چینی : آدھا چائے کا چمچہ  
نمک : حسب ذائقہ  
کریم : آدھا کپ  
ہر ادھنیا : آدھی گھی (باریک کٹا ہوا)  
کوکنگ آئل : آدھی پیالی

ترکیب: ایک بڑے پن میں آئل گرم کر کے پیاز کو ہلکا براؤن کر لیں۔ ادرک، لہسن، نمک اور تمام خشک مسالے ڈال کر تھوڑی دیر چمچہ چلائیں پھر ٹماٹر کاٹ کر کریم اور لیمن جوس شامل کر کے درمیانے آئین پر

بغیر ڈھلن کے پکائیں۔ جب مسالا ہلکا سا گاڑھا ہونے لگے تو بھون لیں اور مچھلی کے ٹکڑے ڈال کر درمیانے آئین پر 15-10 منٹ یا مچھلی کے گلنے تک پکائیں۔ خیال رہے کہ مچھلی ٹوٹے نہیں۔ ہر ادھنیا ڈال کر چپاتی یا نان کے ساتھ گرم گرم نوش کریں۔

### اسٹفڈ تندوری مچھلی

اجزاء:-

- مچھلی : 5 عدد (ہر ایک کا وزن 400 گرام)  
سرکہ : 3 کھانے کے چمچے  
کالی مرچ پاؤڈر : 2 چائے کے چمچے  
سونف : 2 چائے کے چمچے  
ادرک، لہسن پیسٹ : 1/4 کپ  
گھی : 3 1/3 کھانے کے چمچے  
بیسن : 2 2/3 کھانے کے چمچے  
لیموں کارس : 5 چائے کے چمچے  
ہلدی پاؤڈر : 2 چائے کے چمچے  
دہی : 1 کپ

مکھن : 3 1/3 کھانے کا چمچہ  
لال مرچ پاؤڈر : 4 چائے کے چمچے  
نمک : حسب ذائقہ  
ترکیب: 1- مچھلی کو سرکہ اور آدھا نمک لگا کر



رکھ دیں۔

بھونیں۔ باریک کئے ہوئے ٹماٹر اور تمام مسالے ڈال کر ڈھکن رکھ دیں۔ درمیانی آئینے پر دس منٹ تک پکائیں۔ مرغی گل جانے کے بعد بھول لیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو ادرک اور ہری مرچ سے سجا کر پیش کریں۔

2- ایک پیالے میں کالی مرچ پاؤڈر، سونف، ادرک، لہسن، گھی، مینس، لیموں کا جوس، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، نمک اور دہی کو مکس کر کے پیسٹ تیار کر لیں۔

3- پیسٹ کو مچھلی پر اچھی طرح سے لگا دیں اور 2-3 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

4- آدن کو پہلے سے  $175^{\circ}\text{C}$  یا  $350^{\circ}\text{F}$  پر گرم کریں۔

5- مچھلی کو سینوں پر لگا دیں۔

6- مچھلی کو 12-15 منٹ کے لیے گرل کر لیں۔

7- مکھن کا پچھا رالگائیں اور سینوں سے نکال کر کھیرے، ٹماٹر اور پیاز سے گرم گرم سرو کریں۔

## مغلانی نہاری

اجزاء

بونگ کا گوشت : ایک کلو

نلیاں : دو عدد

پسا ہوا لہسن : ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی ادرک : ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی مرچ : ایک چائے کا چمچ

نمک : حسب ذائقہ

پیاز بڑی : ایک عدد

تیل : ڈیڑھ کپ

خلک مسالے کے اجزاء

پسا ہوا گرم مسالا : ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی سونف : ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی جائفل : پون چائے کا چمچ

پسی ہوئی جاوتری : پون چائے کا چمچ

بڑی الائچی : دو یا تین عدد

لوگ : دو یا تین عدد

آنا : تین کھانے کے چمچ

سجاوٹ کے لیے : ہری مرچ، ہرا دھنیا، ادرک، لیموں

ترکیب: ایک درمیانے سائز کی دیگی لیں۔

تیل گرم کر کے پیاز ڈالیں، سنہری ہونے کے بعد

تھوڑی سی پیاز نکال لیں۔ لہسن، ادرک، گوشت پہلے

تیل میں ڈال کر بھونیں اور پھر بعد میں سونف، پسا

ہوا گرم مسالا اور آٹے کے علاوہ سارے مسالے

شامل کر کے اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے۔

بونگ کا گوشت گھنے میں وقت لیتا ہے۔ اس لیے

## چکن اسٹو

اجزاء

مرغی : ایک کلو

پیاز : چار عدد

تیل / گھی : آدھا کپ

ٹماٹر : چھ عدد

ثابت گرم مسالا : ایک کھانے کا چمچ

ثابت کالی مرچ : آٹھ عدد

سفید زیرہ : ایک کھانے کا چمچ

نمک : حسب ذائقہ

ہلدی : پون چائے کا چمچ

پسا ہوا لہسن : ایک چائے کا چمچ

پسی ہوئی ادرک : ایک چائے کا چمچ

سجاوٹ کے لیے : کٹی ہوئی ہری مرچ

کٹی ہوئی ادرک : دو کھانے کے چمچ

ترکیب: ایک دیگی میں تیل گرم کریں۔ پیاز

کے ٹکڑے نسبتاً بڑے کاٹ کر تیل میں شامل کریں۔

پیاز ہلکا سا تلنے کے بعد مرغی، لہسن اور ادرک ڈال کر

## کوکو اچا کلیٹ دودھ

اجزاء:

دودھ (گرم)

: چار کپ

: ایک کپ

: دو کھانے کے چمچے

: ایک چائے کا چمچ

: ایک کھانے کا چمچ

: ڈھائی کھانے کے چمچے

: پون چائے کا چمچ

: چاکلیٹ بار کی 4 کیوبز

(کدو کس کر لیں)

ترکیب: دودھ، چاکلیٹ پوڈر، کوکوا، چینی اور کافی کو ایک بلینڈر میں بلو لیں۔ پھر پوڈر کا دودھ ملا کر مزید بلو لیں۔ اسے گلاسوں میں انڈیل لیں۔ ان پر اوپر سے کریم انڈیل دیں اور کدو کس کیے ہوئے چاکلیٹ سے گارلش کر کے سرو کریں۔

## بادام دودھ

اجزاء:

: ڈھائی سو گرام

: ایک چائے کا چمچ

: ایک عدد

: دو چائے کے چمچے

: سات یا آٹھ (پانی میں بھگو دیں)

: بھگو دیں

ترکیب: بادام اور چھوٹی الائچی کو گرائنڈ کر کے باریک پیسٹ بنا لیں۔ ایک پٹیلی میں گرم کر لیں، اس میں بادام کا پیسٹ ڈال دیں اور چند سیکنڈز فرائی کر لیں۔ پھر دودھ اور چینی ملا دیں۔ ہلکی آنچ پر اس وقت تک ابالیں کہ یہ پک جائے۔ گرم گرم سرو کریں۔

زیادہ دیر جیسی آنچ پر پکائیں۔ جب گوشت گل جائے تو ہڈیاں الگ نکال لیں۔ پھر اس میں پسا ہوا گرم مسالا، سونف اور آٹا گھول کر ملائیں اور تھوڑی دیر چمچہ چلاتی رہیں۔ اس کے بعد ڈھکنا برابر کر کے دوبارہ دم پر رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت ادراک، لیموں، ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر ساتھ رکھیں اور گرم نان یا شیر مال کے ساتھ تناول فرمائیں۔

## دودھ چھوڑے

اجزاء:-

: آدھا کلو

: دو تین

: دو چائے کے چمچے

ترکیب: چھوڑوں اور چینی کو دودھ میں ڈال کر ہلکی آنچ پر ابال لیں حتیٰ کہ دودھ گھٹ کر آدھا رہ جائے۔ چھوڑے نکال کر گرم گرم سرو کریں۔ (نوٹ: یہ یقین کیا جاتا ہے کہ دودھ چھوڑے سے خون بننے میں اضافہ ہوتا ہے اور اس لیے اسے صرف سردیوں میں پینا چاہیے۔)

## شہد دودھ

اجزاء:-

: دو کپ

: ایک کھانے کا چمچ

: ایک عدد

: پانچ چھ (باریک پوڈر بنائیں)

ترکیب: الائچی اور باداموں کو دودھ میں ڈال کر ابال لیں۔ اس کے بعد اس میں شہد ملا دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں۔ گرم گرم سرو کریں۔ (نوٹ: جسمانی کمزوری اور نظام ہضم کے لیے مفید ہے۔)

## ترتیب: ارم محمد

☆ بے کار لوگوں کا بہترین مشغلہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔

☆ ماں باپ کی دل سے عزت کرو، تمہاری اولاد خود بخود تمہاری عزت کرے گی۔

کہاوتیں

﴿ تعریف گالیوں کی بنیاد ہے۔ (جاپانی کہاوت) ﴾

﴿ کوئی شخص اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا جب تک انہیں بروئے کار نہ لائے۔ (لاطینی) ﴾

﴿ قیمتی چلانے سے قبل کپڑے کو سات مرتبہ ناپ لو کیونکہ ایک دفعہ قیمتی چلنے کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا۔ (چینی کہاوت) ﴾

﴿ نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقلمندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف قبول نہیں کرتے۔ (عربی کہاوت) ﴾

مرسلہ: خضر فرحان۔ کراچی

منزل

زندگی کی سب سے بڑی سچائی ایک قبرستان کے باہر لکھی ہوئی تھی۔ ”منزل تو میری یہی تھی بس زندگی گزر گئی یہاں تک آتے آتے۔“

مرسلہ: تنویر حبیب۔ کھاریاں

علم

علم عظمت اور سر بلندی کا ذریعہ ہے۔

فرمان الہی

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا یہ جنوں میں سے تھا اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی کیا پھر بھی تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کا دشمن ہے ایسے ظالموں کا کیا ہی برابر ہے۔

(سورۃ کہف۔ 50)

دین میں سختی نہیں ہے

ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔

”یا رسول اللہ ﷺ ممکن ہے کہ میں نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھ سکوں کیونکہ فلاں شخص ہمیں بہت طویل نماز پڑھاتا ہے۔ ابو سعد کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔

”لوگوں کو سختیاں کر کے دین سے دور کرنا درست نہیں۔“ (صحیح بخاری جلد اول حدیث 91) طاہرہ علی۔ کوٹری

سنہرے موتی

☆ ایمان کے دو حصے ہیں پہلا صبر اور دوسرا شکر۔

☆ پاؤں پھسلے تو پھسلے مگر زبان کو نہ پھسلنے دو۔

زیور علم سے آراستہ اللہ کے ہاں زیادہ قریب ہوتے ہیں۔  
علم حاصل کرو اللہ کی راہ میں علم حاصل کرنا نیکی ہے۔

علم کی طلب عبادت ہے۔

علم پر بحث و مباحثہ کرنا جہاد ہے۔

علم سکھانا صدقہ ہے۔

علم جنت کا راستہ ہے۔

علم دلوں کی زندگی ہے۔

علم اندھوں کے لیے بینائی ہے۔

علم میں غور و خوض کرنا روزہ کے برابر ہے۔

مرسلہ: عاشرہ منور۔ والی پھر اس

### زندگی

زندگی جس میں دھوپ کی تپش بھی ہے اور بارشوں کی ٹھنڈک بھی، کبھی جلتی دھوپ میں چلتے چلتے سایہ مل جاتا ہے اور کبھی تمام عمر آبلہ پانی تپتی زمین پر چلنا پڑتا ہے۔

زندگی میں جہاں تمنائوں کی صبح ہوتی ہے وہاں آرزوؤں کی شام بھی ڈھل جاتی ہے۔ محبتوں کی ریتیں چھاتی ہیں تو جدائیوں کی آندھیاں بھی ضرور چلتی ہیں۔ اس شاہراہ پر خلوص لٹانے والے بھی ملتے ہیں اور پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے والوں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔

مرسلہ: قمر حیات شاہ۔ جہلم

### حقوق نسواں

”آپ مغرب کی بے مہار اور غلام بنادینے والی آزادی کو اپنے حقوق کا تحفظ سمجھتی ہیں۔ مغرب جسے خود اپنی عورت کی حدود نہیں معلوم، وہ آپ کو حقوق کا کیا تصور دے گا۔ جہاں شراب کے نشے میں دھت باپ گھر آکر بیٹی کو صرف عورت سمجھتا ہے۔ حقوق تو

آپ کو چودہ سو سال پہلے مل چکے ہیں۔ وراثت کا، مرضی سے شادی کا، کاروبار کا، ملازمت کا، تعلیم کا، شادی کے وقت مرضی نہ ہونے پر انکار کا حق، کون سا حق نہیں ہے آپ کے پاس؟ ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ مرضی ہم سے اس وقت پوچھی جائے جب گھر میں شامیانے لگے ہوں اور مہمان محلے اور برادری والے جمع ہوں۔ کھانا میزوں پر لگنے والا ہو، اس وقت ہم سے پوچھا جاتا ہے فلاں ابن فلاں قبول ہے۔ کوئی انتہائی بے غیرت اور بے حس بیٹی ہوگی جو اس وقت نفی میں سر ہلا سکے۔ اب یہ چودہ سو سال پہلے آنے والے دستور کی برائی تو نہیں ہے ناں؟ یہ تو میرے اور آپ کے گھر والوں کی برائی ہے۔“

طلعت اخلاق احمد کی کتاب ”بوتے یاسمین“ سے

انتخاب

حسن انتخاب: نعمان عمر۔ حیدر آباد

### غزل

|        |      |          |            |
|--------|------|----------|------------|
| رستے   | اگر  | سمندر    | ہوں        |
| راہیں  | ختم  | نہیں     | ہوتی       |
| درد کی | گر   | کوئی شکل | ہوتی       |
| ماں کے | آنسو | جیسی     | ہوتی       |
| محبت   | صرف  | محبت     | ہوتی ہے    |
| نفرت   | کبھی | نہیں     | ہوتی       |
| آئینہ  | صرف  | آئینہ    | ہوتا ہے    |
| وہ     | پتھر | کبھی     | نہیں       |
| اُس سے | پہلے | وہ       | کچھ کہتا   |
| خدا    | حافظ | کہہ      | دیا ہم نے  |
| منزل   | پر   | پہنچا    | ہے تو      |
| نیت    | کا   | سچا      | ہونا چاہیے |
| ہاتھ   | کھلا | رکھو     | ہمیشہ تم   |
| باندھ  | کر   | کبھی     | نہ رکھنا   |
| رزق    | کے   | سارے     | در         |

کھلے ہاتھ ہی میں کھلتے ہیں  
محبت صرف محبت ہوتی ہے  
نفرت کبھی نہیں ہوتی  
اُس سے پہلے وہ کچھ کہتا  
خدا حافظ کہہ دیا ہم نے  
فرحت صدیقی

کون سا تیر مار لیا  
جس نے جلد بازی میں شادی کی اس نے اپنا  
سارا جیون بگاڑ لیا.....  
اور جس نے سوچ سمجھ کر شادی کی اس نے.....  
کون سا تیر مار لیا.....  
نظام الدین۔ فیصل آباد

### کیسے کیسے لوگ

کچھ لوگ دعاؤں کی طرح ہوتے ہیں  
ابھی ہم سجدے میں سر جھکاتے ہی ہیں کہ وہ  
آنسوؤں کی طرح ہماری آنکھوں سے ٹپکتے  
ہیں  
کچھ لوگ آنکھوں کی طرح ہوتے ہیں  
وہ ساتھ ہوں تو اندھیروں میں بھی راستہ مل جاتا  
ہے

کچھ لوگ گھروں کی طرح ہوتے ہیں  
ہم جہاں بھی رہیں دل ان ہی کی سمت پلٹ  
آنے کو کرتا ہے

کچھ لوگ خطوں کی طرح ہوتے ہیں  
کہ انہیں بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا  
کچھ لوگ آسمان کی طرح ہوتے ہیں  
ہزار جاہنے پر بھی ہم انہیں چھو نہیں سکتے  
کچھ لوگ دھڑکنوں کی طرح ہوتے ہیں  
کہ اُن سے مل کر زندگی کا احساس ہوتا ہے  
شمینہ رضا۔ پنڈی

### اچھا بہن

لڑکی: اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو تمہیں ہر ماہ  
ہمارے گھر کا بجلی کا بل ادا کرنا ہوگا اور پاپا کو بیس لیٹر  
پٹرول ڈلوانا ہوگا۔“

لڑکا: ”اچھا بہن امی ابو کو میرا سلام کہنا۔“  
خوشحال خان۔ زیارت

### لاجواب

ایک بار ایک چینی تاجر سے ملاقات ہوئی اُس  
نے کہا۔ ”پاکستانی بھی بڑے عجیب لوگ ہیں  
پاکستانی تاجر میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ  
خریدی جانے والی سستی اشیاء پر بڑی کمپنیوں اور  
برانڈ کے لیبل چسپاں کر دو۔ مگر جب میں انہیں  
کھانے پر بلاتا ہوں تو معذرت کرتے ہیں اور کہتے  
ہیں کہ آپ کا کھانا حلال نہیں تو کیا دھوکے سے مال  
پینچنا اُن کے لیے حلال ہے؟“ اور میں اب تک  
خاموش ہوں۔

شایان ظفر۔ رحیم یار خان

### علاج

ایک ڈاکٹر فرخ سے دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہے تھے۔  
”آخر کار میں نے مسز کمال کے لڑکے کا علاج کر  
ہی دیا۔ تمام ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔“  
”کیا بیماری تھی اسے؟“ دوسرے ڈاکٹر نے  
پوچھا۔

”وہ دانتوں سے ناخن کترتا تھا۔ میں نے اسے  
ڈینٹسٹ کے پاس بھیج کر اس کے تمام دانت نکلوا  
دیئے۔“

اشعر، ایشا۔ کراچی

### ڈگری

ڈگری تو محض تعلیمی اخراجات کی رسید ہوتی  
ہے۔ علم تو انسان کی گفتگو اور عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کی جبلت بھی عجب شے ہے۔ نہ تین میں خوش نہ تیرہ میں۔ قدرت نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر جہاں دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے وہیں کچھ ایسے جذبات بھی ہماری طبیعت میں شامل کر دیئے ہیں کہ ہم اکثر اوقات اپنے ہی خالق کی ناشکری کر جاتے ہیں۔ کبھی حالات و واقعات کی پریشانی پہ شکوے تو کبھی تقدیر کے ہاتھوں شکست کے گلے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری زندگیوں میں مادہ پرستی کا عنصر اس حد تک شامل ہو چکا ہے کہ اب ہمیں سوائے چمک دمک کے کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ بڑے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اس معاشرے میں بسنے والے ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ ایک ہی خاندان کا گماں گزرتا تھا۔ ہماری اقدار رسم و رواج اور روایات ہی ہماری پہچان تھیں، لیکن ترقی کے تیز رفتار پہرے نے ہمیں آسائشیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کو سہل کر دیا ہے وہیں اس نے ہماری اصلیت کو کچل کر اس کو بری طرح سے مسخ کر دیا ہے کہ خود اپنی پہچان بھی ممکن نہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم واقعی ایک قوم کی بجائے بے ہنگم ہجوم ہیں اور دوسروں کی تقلید کرتے کرتے ہماری حالت اس کوے جیسی ہو گئی ہے جو ہنس کی چال چلتے چلتے خود اپنی ہی چال بھول گیا تھا۔

ریاض جاوید کی تصنیف ”ہم زندہ قوم ہیں“ سے اقتباس

انتخاب: افضل ارشاد کراچی۔

سوال

ایک امیدوار ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ بورڈ کے ممبر نے اُس سے

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بخار کو برا مت کہو کیونکہ وہ نبی آدم کے گناہوں کو ایسے دور کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔

شور

سکے ہمیشہ بہت شور کرتے ہیں مگر کاغذ کے روپے بالکل آواز نہیں نکالتے تو جب زندگی میں آپ کو مرتبہ ملے تو اپنے اندر انکساری اور خاموشی پیدا کریں۔ آئمہ علی۔ حیدر آباد

جمعتہ المبارک

زم زم جیسا کوئی پانی نہیں.....

نماز جیسی کوئی عبادت نہیں.....

قرآن جیسی کوئی کتاب نہیں.....

کلمہ جیسی کوئی دولت نہیں.....

اور.....

جمعہ جیسا کوئی دن نہیں.....

روشن آراء۔ سکھر

پیارا شوہر

شوہر: ”مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

بیوی: ”حیرت سے وہ کیوں؟“

شوہر: ”روز صبح مرنے کی طرح اٹھ جاتا ہوں

پھر گھوڑے کی طرح بھاگ بھاگ کر آفس جاتا ہوں

وہاں سارا دن گدھے کی طرح کام کرتا ہوں۔ گھر

آ کر تمہارے سامنے طوطے کی طرح ہاں جی ہاں

جی کرتا ہوں۔ بکرے کی طرح کھانے میں سبزی ملتی

ہے۔ بلی کی طرح بچے سنبھالتا ہوں اور پھر رات کو

بھینس کے ساتھ سو جاتا ہوں۔ میرے اندر کون سی

انسانوں والی بات ہے۔

عمران ولی۔ کھاریاں

پوچھا۔ ”تم کسی جنگل میں ہو، اچانک تمہارے سامنے شیر آجاتا ہے۔ بتاؤ اس وقت تم کیا کرو گے؟“  
امیدوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ مہربان نے اپنا سوال دہرایا، وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس پر وہ چیخ سے بولا۔ ”جواب کیوں نہیں دیتے؟“  
امیدوار نے جواب دیا۔ ”میں بھلا کیا کروں گا، جو کچھ کرنا ہے وہ تو شیر کر لے گا۔“

## آمدنی

لندن میں ایک پلمبر نے اپنے بریف کیس میں سے چند اوزار نکال کر ڈرائی ویر میں ٹیکس صاحب کے گھر کا نل درست کیا اور اپنا نل انہیں بھجوا دیا۔ نل دیکھ کر ٹیکس صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے بولے۔  
”دوسو ڈالرنی گھنٹہ؟ میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کماتا؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پلمبر نے پورے خلوص سے تائید کی۔ ”وکالت کے پیشے میں میری آمدنی کا بھی یہی حال تھا۔“

مرسلہ۔ شازیہ۔ دادو۔

## غزل

میری ساری زندگی کو بے شر اس نے کیا  
عمر میری تھی، مگر اس کو بسر اس نے کیا  
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد  
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا  
راہبر میرا بنا گراہ کرنے کے لیے  
مجھ کو سیدھے راستے سے در بدر اس نے کیا  
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا  
پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا  
شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیر  
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا  
(منیر نیازی)

حسن انتخاب: روزینہ شاہ۔ لاہور۔

## غزل

ستارے بانٹتا ہے وہ ضیاء تقسیم کرتا ہے  
سنا ہے جس موسم میں ہوا تقسیم کرتا ہے

تمہاری یاد کچھ ایسے میرے دل پر اترتی ہے  
کہ جیسے روشنی شب میں دیا تقسیم کرتا ہے  
اسے روکو کہ باز آئے سر اسز یہ باگل پن  
جو بہروں کے محلوں میں صدا تقسیم کرتا ہے  
اسی سے مانگ تو عرفان چھوڑ دے سب کو  
جو پتھر میں بھی کیڑوں کو غذا تقسیم کرتا ہے

(عرفان صادق)

حسن انتخاب: محمد علی۔ اسلام آباد۔

## غزل

شاید نکل ہی آئیں خزاں کے حصار سے  
اب کے ہمیں امید بہت ہے بہار سے  
جگنو ہی کر دے آ کے مداوائے تیرگی  
گھبرا گیا ہوں طولِ شبِ انتظار سے  
معصومیت کی حد ہے کہ ہم اہل کارواں  
منزل کی راہ پوچھ رہے ہیں غبار سے  
خود ساختہ محافظِ گلشن سے ہوشیار  
محروم کر نہ دیں فجر سایہ دار سے

(ضیٰ عظیم آبادی)

حسن انتخاب: اقبال حسین، کراچی۔

## غزل

غبار بن کے میرے راستوں میں رہتا ہے  
وہ ایک خواب ہے رت جگوں میں رہتا ہے  
کبھی جو ذکر تیرا محفلوں میں چھڑ جائے  
تو دل بھی دیر تلک وحشتوں میں رہتا ہے  
میرے حواس کے ہر کیوس پر ایستادہ  
خیال بن کے سبھی منظروں میں رہتا ہے  
ہوا بھی اس کا سراپا پڑا کے لائی ہے  
وہ آہٹوں کی طرح دشتوں میں رہتا ہے  
وہ بن گیا ہے کنارہ کسی سمندر کا  
ہے میرا عکس مگر فاصلوں میں رہتا ہے

(سید نعیم الدین)

حسن انتخاب: فرحان درکی، کراچی۔



# سخن ڈالو

گیت

سہولت کار

تمہاری جانشینی کی، زمیں ہموار کرنا ہے تیری یاد ستائے سا جن تیری یاد ستائے  
بساطِ عشق پر ہم کو، سہولت کار بننا ہے میں برہا کی ماری مجھ کو شب بھر نیند نہ آئے

سا جن تیری یاد ستائے

وسائل کی روانی میں، رکاوٹ آئے تو ہم کہیں جب سے دل کو توڑ گیا تو گھر کو چھوڑ گیا تو

تیرا رستہ سہل کرنا، اسے ہموار کرنا ہے سونا آنگن میرا اور بھی سونا ہوتا جائے

خیال اس کا بھی رکھنا کہ ذہانت سراٹھائے تو سا جن تیری یاد ستائے

قفس کو کچھ وسیع کرنا، ذہن مسمار کرنا ہے شب بھر نیند نہ آئے

جہاں خود کچھ نہیں ہوتا، وہاں یہ کام ہے اپنا تیری یادوں کا موسم ہے پت جھڑ جیسا موسم  
دل کے اندر جتنے پھول کھلے تھے سب کھلائے

نظامِ تابعداری کو، فقط خود کار کرنا ہے سا جن تیری یاد ستائے

سہولت کار بھی آخر، تمہارا ہم نشین ٹھہرا اب تو لوٹ آؤ بھی پھر سے ساون رُت لوٹ آئی

اسے مہرے اٹھنے ہیں، وسیع دربار کرنا ہے میں نے اپنی ان آنکھوں کو کیا کیا خواب دکھائے

سا جن تیری یاد ستائے

ذرا سی ایک سہولت خود، سہولت کار نے لے لی اپنی آنکھ میں آنسو لے کر ہر پل تجھ کو مانگا

اسے بھی حکمرانی اب، مرے سرکار کرنا ہے میں نے مزاروں پر جا کر سو سو دیپ جلائے

ریحان علوی

سعدیہ سیٹھی



# سخن واد

گیت

سہولت کار

تمہاری جانشینی کی، زمیں ہموار کرنا ہے  
تیری یاد ستائے سا جن تیری یاد ستائے  
بساط عشق پر ہم کو، سہولت کار بننا ہے  
میں برہا کی ماری مجھ کو شب بھر نیند نہ آئے

ساجن تیری یاد ستائے

وسائل کی روانی میں، رکاوٹ آئے تو ہم کبھی  
جب سے دل کو توڑ گیا تو گھر کو چھوڑ گیا تو

تیرا رستہ سہل کرنا، اسے ہموار کرنا ہے  
سونہ آنگن میرا اور بھی سونا ہوتا جائے

ساجن تیری یاد ستائے

خیال اس کا بھی رکھنا کہ ذہانت سر اٹھائے تو

شب بھر نیند نہ آئے

قفس کو کچھ وسیع کرنا، ذہن مسمار کرنا ہے

تیری یادوں کا موسم ہے پت جھڑ جیسا موسم

جہاں خود کچھ نہیں ہوتا وہاں یہ کام ہے اپنا

دل کے اندر جتنے پھول کھلے تھے سب کھلائے

ساجن تیری یاد ستائے

نظام تابعداری کو، فقط خود کار کرنا ہے

اب تو لوٹ آؤ بھی پھر سے ساون رُت لوٹ آئی

سہولت کار بھی آخر، تمہارا ہم نشین کھبرا

میں نے اپنی ان آنکھوں کو کیا کیا خواب دکھائے

اسے مہرے لٹنے ہیں، وسیع دربار کرنا ہے

ساجن تیری یاد ستائے

ذرا سی ایک سہولت خود سہولت کار نے لی

اپنی آنکھ میں آنسو لے کر ہر پل تجھ کو مانگا

میں نے مزاروں پر جا کر سو سو دیپ جلانے

اسے بھی حکمرانی اب، مرے سرکار کرنا ہے

ریحان علوی

سعدیہ سیٹھی

# شوہر خبر نامہ

.....

شوہر سے جڑی مزے دار خبریں.....

.....

## شمیہ روزی

کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ سابق وزیراعظم لیاقت علی خان کے پوتے معظم علی خان کی اداکاری کمال تھی۔ اس سے پہلے ان کے والدین نے ڈرامہ سنہرے دن میں کام کیا تھا۔ معظم علی خان کی شخصیت اور اداکاری کو دیکھتے ہوئے یہ بات باعث حیرت ہے کہ وہ ڈرامہ انڈسٹری میں نظر نہیں آتے۔

مبارک

کشمالہ طارق جن کا شمار خوش شکل اور بڑھی لکھی سیاست دانوں میں ہوتا ہے نے پچھلے دنوں وقاص خان سے شادی کر لی۔ وقاص خان مشہور بزنس مین

بے ثباتی

ڈرامہ شبات میں ماورہ حسین نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تو ان کی اداکاری پر تنقید کرنے والے بھی خاموش ہو گئے۔ پروڈیوسر مومنہ درید کی اس پروڈکشن نے شروع کی اقساط میں تو کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا تھا مگر جیسے جیسے ڈرامہ آگے بڑھتا گیا دیکھنے والے اس کو پسند کرنے لگے۔ اختتام سے قبل کی اقساط بہت جاندار تھیں ڈرامے میں سارہ خان، عثمان مختار، سیسی راجیل اور لیلا واسطی کی اداکاری بہترین تھیں مگر معظم علی خان (سارہ خان کے والد)



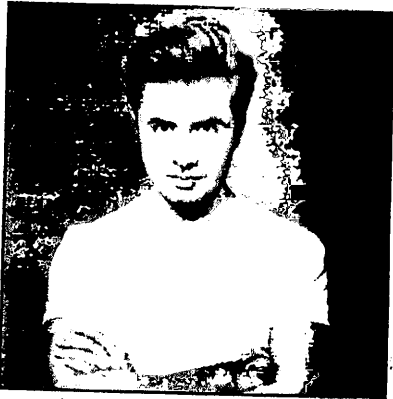
ہیں اور پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ کشمالہ طارق کی



بھی یہ دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی سے ان کا ایک بیٹا اذلان ہے شادی کی یہ تقریب اسلام آباد میں انجام پائی جس میں عزیزوں اور دوستوں نے شرکت کی۔ شادی میں کشمالہ طارق کے ڈانس نے چار چاند لگا دیے۔

کیوں

وزیراعظم بناب عمران خان نے سنگر اور ایکٹر



علی ظفر کو مکمل پونیورسٹی کا سفیر کیا بنایا وہ لوگ جو کل تک علی ظفر کے گن گاتے تھے آج ان کے خلاف ہو گئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ علی ظفر کا تعلیم سے کیا واسطہ لگاتے ہیں اداکاری کرتے ہیں تو وہی

کریں۔ تعلیمی سرگرمیوں کے لیے ان کی خدمات درست فیصلہ نہیں۔ ہم علی ظفر کی طرف سے چلنے والوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ بھائی یہاں کون ہے جو وہ کام کر رہا ہے جو اسے آتا ہے تو پھر یہ پابندی صرف علی ظفر پر ہی کیوں؟

چھوٹے میاں

ہمایوں سعید کے چھوٹے بھائی سلمان سعید نے علیہ فاطمہ سے شادی کر لی۔ سلمان سعید کا شمار بھی



اب اچھے اداکاروں میں ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ہونے والی اس شادی میں شو بزنس انڈسٹری کے تمام بڑے ناموں نے شرکت کی۔ سلمان اور علیہ دونوں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔

تڑپ ختم

ڈرامہ تڑپ بھی اختتام پذیر ہوا۔ ڈرامے میں جہاں کئی جھول تھے وہاں حبابخاری کی رونی صورت دیکھ دیکھ کر لوگ اب عاجز آ چکے ہیں۔ انہوں نے اس ڈرامے میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ادا کیا جس کا بھائی انتہائی سخت طبیعت کا حامل تھا مگر پھر بھی بہنیں مستقل جھوٹ بولتی رہیں اور گھر والوں کو دھوکا دیتی رہیں۔ مصنف کو یہ نہیں پتہ تھا کہ اپنی جان بچاتے ہوئے اگر کسی کا قتل ہو جائے تو سزائے

موت نہیں ہوتی اور ویسے بھی سزائے موت چند

عثمان مختار کی ڈائریکشن میں بننے والی شار



فلم 'بینچ' کو نیویارک ساؤتھ شو فیٹیول میں بہترین فلم کا ایوارڈ ملا ہے۔ مصنف علی مراد نے اس فلم میں ایک جوڑے کو دکھایا ہے جو پارک میں بینچ پر بیٹھا۔ اور اپنی زندگی میں ہونے والی غلطیوں کے بار۔ میں بات کر رہا ہے۔ عثمان مختار کے ساتھ اس فلم میں رویہ چوہدری نے لیڈ رول پلے کیا ہے یہ فلم کینز فلم فیٹیول کے لیے بھی منتخب ہو چکی ہے۔

مہینوں میں تو بالکل بھی نہیں ہوتی۔ پولیس میں SP بڑا افسر ہوتا ہے اور DSP چھوٹا مگر ڈرامے کا کردار SP سے کہتا ہے کہ سر DSP صاحب دورے پر آ رہے ہیں یہ غلطیاں معمولی نہیں ہیں کہ انہیں صرف نظر کر دیا جائے لہذا اچھی ریپوٹیشن کے چینل کو ان خامیوں کو دور کرنا چاہیے۔

کامیابیاں قدم چو میں

